

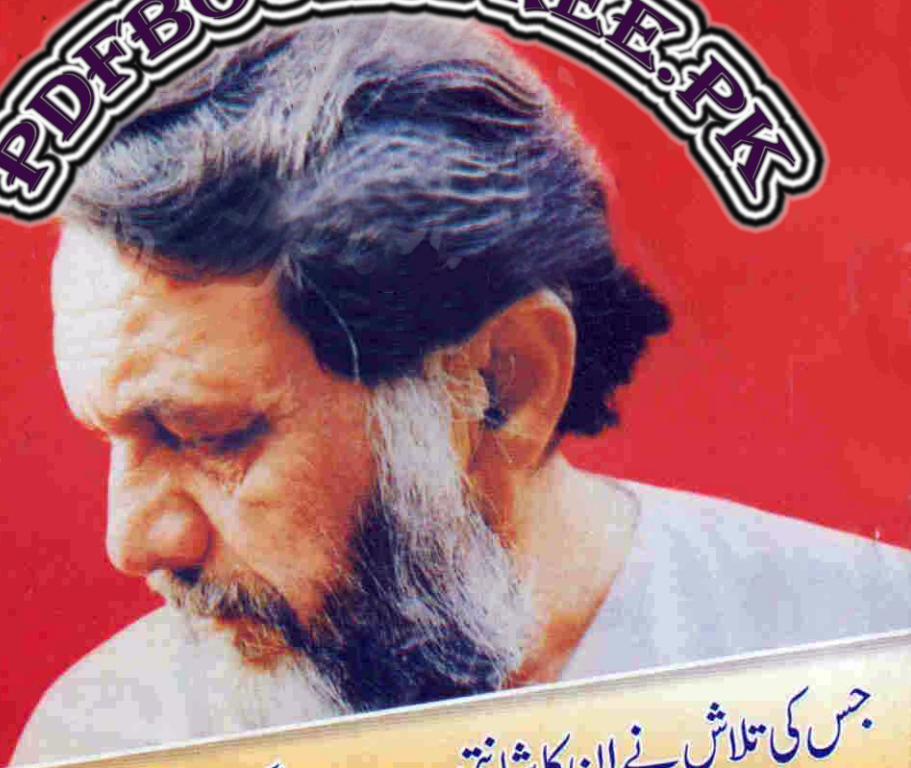
مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

دسمبر 2011

”بابا صاحب“ یادوں کا کراماتی سلسلہ
وزڈم آف دی ایسٹ

PDFBOOKSFREE.PK



جس کی تلاش نے ان کا شانتی سے سونا، جاگنا حرام کر دیا تھا

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة المائدہ

کیا تو نہیں جانتا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی۔ سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ اے رسول! نہ ٹکین کریں آپ کو وہ جو تیز رفتار ہیں کفر میں ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم ایمان لائے (صرف) اپنے منہ سے حالانکہ نہیں ایمان لائے تھے ان کے دل اور ان لوگوں سے جو یہودی ہیں۔ جاسوسی کرنے والے ہیں آپ کے پاس بدل دیتے ہیں اللہ کی باتوں کو۔ اس کے صحیح موقعوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں دیا جائے یہ حکم تو مان لو اسے اور اگر نہ دیا جائے تمہیں یہ حکم تو بچو اور جس کو ارادہ فرمائے اللہ تعالیٰ فتہ میں ڈالنے کا تو نہیں طاقت رکھتا تو اس کے لیے اللہ سے کسی چیز کی۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ پاک کرے ان کے دلوں کو۔ ان کیلئے دنیا میں ذلت ہے اور ان کیلئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو۔ بڑے حرام خور ہیں۔ تو اگر وہ آئیں آپ کے پاس تو چاہیے فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان یا منہ پھیر لیجئے ان سے (آپ کو اختیار ہے) اور اگر آپ منہ پھیر لیں ان سے تو نہ نقصان پہنچائیں آپ کو کچھ بھی۔ اور اگر آپ فیصلہ فرمائیے ان میں انصاف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں سے۔

(آیت 40 تا 42) (ترجمہ بحوالہ ضیاء القرآن)

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

مسجد قباء کی فضیلت کا بیان

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نماز چاشت نہ پڑھتے تھے مگر جس دن کہ مکہ جاتے کیونکہ وہ مکہ میں چاشت ہی کے وقت جاتے تھے پس وہ کعبہ کا طواف کر کے مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور جس دن کہ مسجد قباء میں جاتے (اس دن بھی نماز چاشت پڑھتے) اور وہ ہر ہفتہ میں مسجد قباء جاتے پس جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تو اس بات کو برا جانتے تھے کہ بغیر نماز پڑھے اس سے باہر نکل آئیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد قبا کی زیارت کو سوار اور پیدل جایا کرتے تھے۔ (نافع کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے کہ میں ویسا ہی کرتا ہوں جیسا کہ میں نے اپنے دوستوں کو کرتے ہوئے دیکھا ہے اور میں کسی شخص کو منع نہیں کرتا رات میں یا دن میں جس وقت چاہے نماز پڑھے سو اس کے کہ طلوع آفتاب (کے وقت نماز پڑھنے) کا قصد نہ کرے اور نہ غروب آفتاب (کے وقت نماز پڑھنے) کا۔

(بحوالہ: مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحديث	ادارہ	مسجد قباء (فضیلت کا بیان)
14	دستک	کامران امجد خان	قصہ ایک خط کا.....!
46	افغانستان کا قومی کھیل	عارف محمود اہل	چنگیز خان کے دور میں شروع ہونے والا کھیل! بلوچستان اور وسط ایشیائی ریاستوں میں بہادروں کا کھیل تصور کیا جاتا ہے!
49	خود جلیں دیدہ اغیار کو پینا کر دیں	قلندر حسین	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں پچھلے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی دور کا رہتی ہے!
61	پڈنگ	نسیم احمد کھرل	ایک بیوی کا دلچسپ سا جہاز..... جون بھری گھریلو مشقت سے پریشان تھی!
65	قائد اعظم	کامران امجد	برصغیر کے عظیم ترین رہنما محمد علی جناح کے مختصر حالات زندگی!
71	مڈل کلاس	نسیم کوثر چیمہ	دو لڑکیوں کی کہانی، جسکے خوب ایک سے تھے تکریریں میں مختلف!
81	حقیقت کہانی	جاوید راہی	ہندہ صفت گرہ کے کتھے چڑھ جانے والی ایک بد نصیب لڑکی کی کچی کہانی!
89	آؤ لڑیں	انجم انصار	میاں بیوی کا قصہ جو اپنا ماضی، حال سے تبدیل کرنا چاہتے تھے.....
91	اپنا گھر	عرفان جاوید	ایک شوہر کی کہانی..... ضرورت نے اسے کڑوی سچائی قبول کرنے پر مجبور کر دیا!

☆ عید الاضحیٰ کے بعد گوشت پر مبنی ڈشز کی یکسانیت ختم کرنے کیلئے
Egg with vegetable اور پٹے کی وال کی خاص تر ایک
☆ کوکونٹ فش اور شیون پر آئز سے
موسم سرما کا لطف دو بالا کیجئے
(جویریہ کامران)

151
سیارہ
بچن کارز

یادوں کا کرمانی سلسلہ
وزم آف دی ایسٹ
جس کی تلاش نے ان کا شہنشاہ سے سونا،
جاگنا حرام کر دیا تھا
(اشفاق احمد)

17
بابا صاحب

97	بھگوڑا	نواز خان	جرم مرزا اپنی خصوصی کہانی..... جس کے لیے آپ ہر ماہ شدت سے منتظر رہتے ہیں!
117	پولیس مقابلہ	ظہور احمد ظہر	پاکستان کا پہلا پولیس مقابلہ..... جس میں ایک بیوی نے شوہر کو بھگانے کی کوشش کی تھی!
122	رابعہ دہر کی ماں	پروفیسر جلیل نقوی	712ء کو رابعہ دہر نے محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اسی رابعہ دہر کے عالم وجود میں آنے کا تاریخی پس منظر
137	بوجھ	نہیدہ کوثر	ایک شخص کا فسانہ جس نے خود پر مصنوعی خول چڑھا رکھا تھا!
140	دل ہے کہ مانتا نہیں	عارف صبح خان	انسانی جسم کے اہم ترین عضو "دل" کے بارے میں "دلچسپ کشمکشات"
155	بزم شاعری	ادارہ	بازوق قارئین کے کلام و انتخاب پڑھنی مقبول ترین سلسلہ!
161	16 دسمبر..... زخم جو بھلایا نہیں جاسکتا	رانا محمد شاہد	نگلی تاریخ کا سیاہ ترین دن..... اس زخم کی ٹیمیں تاعمرانی رہیں گی!
165	دام اور صیاد	محمد سلیم اختر	ایک شاطر کی داستان..... اس نے اپنے تئیں کمال سازش تیار کی تھی!
175	نا قابل شکست	ایس۔ امتیاز احمد	"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے جسے ملا نہیں جاسکتا....."
193	صبح کے خوش نصیب	انتظار حسین	فطرت کی مصلحت سے بے خبر تقدیر کے شاکی کی خوش بختی کا مہاجرا!
197	سوچ کے جزیرے	شمس شروانی	غور کرنے والوں کیلئے فکر و عمل کی باتیں..... جن پر عمل سے معاشرہ بدل سکتا ہے!

ایک زندہ دل خوش گفتار لڑکی کی کہانی
زندگی کے نشیب و فراز سے عجیب
دور ہے پر لا کھڑا کرتے ہیں
شوکت افضل کے قلم سے

200
کھلتی ہے
آرزو کی گلی
(آزہ حبیب)

ایک عورت کی کتھا، جس کی زندگی ایک
"جادوئی" ڈبے میں سمٹ کر رہ گئی تھی
صاحب طرز افسانہ نگار نسیم احمد شیر کے قلم سے تازہ افسانہ

145
ایک
تہی
ناں



عمران.....امید کی کرن!

مکرمی امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم

نومبر 2011ء کا شمارہ ہمارے پسندیدہ لیڈر عمران خان کے سرورق سے مزین تھا۔ ان کے روحانی تجربات پڑھ کر اور یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ عمران کی ذاتی زندگی بھی ان کے خیالات اور گفتگو کی طرح انتہائی ارفع و اعلیٰ اور پاکیزہ ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ بلاشبہ لائق تحسین ہے کہ اس کے ذریعے ہم قارئین عمران خان کی ذاتی زندگی کے لاتعداد خفیہ گوشوں سے آشنا ہو سکے ہیں۔ ملک کے دگرگوں حالات اور روز بروز بگڑتی صورتحال میں عمران خان ہی واحد ایسی شخصیت ہیں جو امید کی کرن نظر آتے ہیں وگرنہ تو تمام سیاستدانوں نے قوم کو مایوسی کے گہرے اندھیروں میں ڈھکیل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عمران خان کو مزید رفعتیں عطا کرے اور انہیں بہت اور طاقت عطا فرمائے تاکہ وہ پاکستانی قوم کو ترقی کی شاہراہوں پر گامزن کر سکیں۔ آمین!

(اسد عمران، فیصل آباد)

ایک گلہ ہے آپ سے.....!

محترم کامران امجد خان صاحب!

سیارہ ڈائجسٹ کے ذریعے آپ ملک و قوم کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ بلاشبہ لائق تحسین ہے اور آپ کے شمارہ کے ذریعے ہمیں ہر ماہ بے شمار قابل قدر تحریروں بھی میسر آتی ہیں جنہیں پڑھ کر ہمارا پورا مہینہ بے حد اچھا گزرتا ہے تاہم ہمیں آپ سے ایک گلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ ہماری تجاویز کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ ہم کئی مہینوں سے آپ کو یہ کہتے آرہے ہیں کہ انٹرویوز کا سلسلہ بحال کریں اور ہماری پسندیدہ ٹیلی وژن کی شخصیات کے انٹرویوز کو زیادہ سے زیادہ جگہ دیں۔ آپ نے چند ماہ قبل یہ سلسلہ مختصر طور پر شروع بھی کیا مگر صرف دو ماہ بعد ہی

دیدہ اغیار کو پینا کر دیں“ قلندر حسین سید کی زبردست کاوش ہے۔ پروفیسر ظریف خان کی تحریروں سے بے حد خاص ہوئی ہیں نیز انسپکٹر نواز خان کا جرم و سزا پر مبنی سلسلہ اور ابتدائی صفحات پر کامران امجد خان صاحب کی ”دستک“ بھی بہت خوب ہے۔

(زاہد باجوہ، بہاولپور)

خوابیدہ حکمران

محترم جناب امجد خان صاحب! السلام علیکم
اکتوبر کا شمارہ تمام تر تابانیوں کے ساتھ وقت مقررہ پر موصول ہوا۔ دستک کا موضوع ”سندھ میں سیلاب کی تباہ کاریاں اور حکمرانوں کی بے حسی“ چشم کشا تحریر تھی۔ سندھ میں سیلاب سے جو صورت احوال پیدا ہوئی اور حکومت کا جو طرز عمل زیادہ انتہائی دل دکھا دینے والا ہے۔ وہاں پر لوگ سیلاب کے باعث لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ بے گھر ہو رہے ہیں۔ بیمار ہو کر مر رہے ہیں لیکن حکمرانوں کے اعصاب لوہے سے تراشیدہ ہیں۔ جو تحریروں پر دھنیں خوب تھیں۔ برسات کے موضوع پر انجم انصاری کی تحریر اچھوتی تھی۔ شمس اللہ نیر صاحب نے ”کالا منہ“ میں ایک تلخ حقیقت کو بہت احسن انداز میں اجاگر کیا۔ ہم نے اسے من پسند اعمال کو دین بنا لیا ہے۔ بلکہ کج راستے کو صراطِ مستقیم کا درجہ دے دیا ہے۔ اللہ کریم ہمیں سمجھ دے (آمین)۔

امجد صاحب! میں گاہے بگاہے اپنی شاعری آپ کی خدمت میں بھیجتا رہتا ہوں جسے آپ کمال مہربانی سے اپنے موقر جریدے میں شائع کر کے معیار اور پسندیدگی کی سند مرحمت فرماتے رہتے ہیں تاہم ایک نظم ماہ ستمبر 2005ء کے بھائیک زلزلے کے حوالے سے ارسال کی تھی تاہم ابھی شائع نہیں ہوئی۔ اس بار کالج ہاسٹل لائف کے حوالے سے طنز و مزاح سے بھرپور تحریر اور ایک حمد باری تعالیٰ ارسال کی ہیں۔ انشاء اللہ معیار پر پورا اترتے ہوئے شمارے کی زینت بنیں گی۔ تاہم اس سلسلے میں بغرض راہنمائی کچھ وضاحت بھی فرمادیجئے تاکہ کوئی تحریروں یا شاعری بھیجے ہوئے پیش نظر رکھی جائے اور وہ یہ کہ کسی بھی چیز کا اشاعت کے لیے انتخاب کرنے سے پہلے آپ کن

باتوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مزید برآں اگر ہو سکے تو میری جو تحریر یا شاعری کسی بھی وجہ سے قابل اشاعت نہ بھیجے جائے تو جریدے کی کاپی بھیجے وقت واپس بھیج دی جائے۔ اگر مختصر وجہ ساتھ لکھ دی جائے تو سوسے پے سہاگہ (شہریہ)۔ آپ کا خیر اندیش۔

(محمد عبداللہ عاظم، منگل کینٹ)

عمران خان کی تصویر

مکرمی جناب منجر صاحب ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بھر ہو گئے۔ عرض یہ ہے کہ زرداری صاحب کے صدارت کی مدت کو پورا کرنے میں بہتری ہے۔ آگے مرضی ہے شریف برادران کی۔ ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوگا۔ عوام سر دیوں میں کام کاج میں بہت زیادہ مصروف ہوتی ہے کہ محنت مزدوری کر کے چار پیسے بچ ہو جائیں۔ گرمیاں آئیں تو ٹھیک ہے۔ بے دن کام کاج سے فرصت..... کیا ہے؟ ایک سال تو ہے جلد گزر جائے گا۔ ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان ہر چیز سے مالا مال ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ نیت درست ہو تو کام بن جاتے ہیں۔ اللہ کریم کرے گا اور پھر ہمارے عوام محنت کش ہیں۔ آپ کو یہ کام کتنا ہے کہ درود شریف ہر شمارے میں ہونا لازم ہے۔ اس بار سرورق پر عمران خان کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ان کا اسرار ہے کہ سب اپنے اٹائے شو کریں مگر یہ سیاستدان ایسا کبھی نہیں کریں گے۔

(عبدالرحمن، مہراب پور)

خصوصی نمبر کی برکتیں

محترم جناب چیف ایڈیٹر صاحب سیارہ ڈائجسٹ، السلام علیکم!

میں نے گزشتہ دنوں رمضان شریف کی دعاؤں والا خصوصی نمبر ”عبادات رمضان“ خریدا اور پورے رمضان ان دعاؤں اور عبادتوں کی برکتوں میں گزارا۔ دل خوش ہو گیا۔ اس سے پہلے آپ کے شائع کردہ اولیاء کرام نمبر، صحابہ کرام نمبر اور صحابیات کرام نمبر پڑھے۔ امہات المؤمنین اور تمام صحابیات کرام کے متعلق اتنی معلومات

فرماؤں کے الفاظ میرے لیے زادراہ ہیں۔
بڑے خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔
ای میل ایڈریس میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ وہ اب
husain.8 کی بجائے
husainjan@hotmail.com ہے۔ ذرا
اس پر بھی غور فرمائیے گا۔ شکریہ!
(قلندر حسین سید، احمد پور شرقیہ)

علامہ اقبال کے جواہر پارے

مدیر محترم، سیارہ ڈائجسٹ لاہور! السلام علیکم
ماہ اکتوبر 2011ء کے سیارہ ڈائجسٹ میں میرا
تحقیقی مضمون ”بہادر شاہ ظفر“ شائع کرنے کا بہت
شکریہ گزارش ہے کہ میں علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی
زندگی سے متعلق لکھی گئی تقریباً ہر دستیاب کتاب پڑھ چکا
ہوں۔ میں 1960ء کے دور کی بات کر رہا ہوں۔
علامہ مرحوم کے مذاق / بڈلہ سنجی و خوش طبعی سے متعلق
باقاعدہ کتاب کی شکل میں مجھے کوئی کتاب نہ مل سکی۔ مجھے
علامہ صاحب کے مزاح سے اس پہلو پر لکھنے کا خیال آیا۔
اسی خیال کی تحریک سے علامہ مرحوم کے بکھرے ہوئے
شگفتہ مزاحی کے جواہر پاروں کو بڑی محنت سے ایک جگہ
جمع کر چکا ہوں۔

اس کی ایک قسط سیارہ ڈائجسٹ اپریل 1974ء میں
صفحہ 24 پر چھپ چکی ہے۔ عرض اب یہ ہے کہ میری اس
کاوش کو اگر سیارہ ڈائجسٹ کتابی صورت میں شائع کر سکتا
ہے تو مجھے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بالفرض اگر ایسا
ممکن نہیں تو براہ مہربانی اسے سیارہ ڈائجسٹ میں قسط وار
شائع کیجئے تاکہ میری محنت رائیگاں ہونے سے بچ پائے۔
(ایس۔ مفتی حیدر، کراچی)

☆ مفتی حیدر صاحب! آپ کے مجموعے کو کتابی
صورت میں شائع کرنا تو فی الوقت ممکن نہیں تاہم آپ
اس کی ایک کاپی ہمیں ارسال کر دیجئے۔ معیاری ہوئے تو
انہیں ضرور شائع کر دیا جائے گا۔

جاتا ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر شوکت خانم میموریل
ہسپتال سے بھی انہوں نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔
اب بے کس و مجبور عوام کی نگاہیں بھی اقتدار میں ان کی
راہ دیکھتی ہیں۔ ویسے بھی بی بی پی اور مسلم لیگ (ن)
دور عوام کی نگاہوں سے اوچل نہ ہیں۔ اس دفعہ بھی بی
ایم ایل (ن) کے قائد نواز شریف اگر فریڈلی اپوزیشن
نہ بننے تو یقیناً آج ہمارا ملک کرپشن، ناخواندگی،
مہنگائی، لوڈ شیڈنگ اور سرعام ڈکیتوں میں یوں جھلنا نہ
ہوتا۔ بلند بانگ دعویٰ کر دینا اور بات ہے اور اصل
بات ان پر عمل پیرا ہونا ہے۔ حکیم الامت ڈاکٹر علامہ
اقبال نے فرمایا۔

اقبال بڑا ایڈیٹنگ ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا
حیف ہے ایسے حکمرانوں پر جنہوں نے دو سال
اپنی عزیز بزرگ خاتون کی خبر تک نہ لی اور مرنے
کے بعد پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ”نشان
پاکستان“ دے دیا۔ اللہ کی قدرت کے کھیل دیکھیں
کہ ان کا جنازہ بھی بیٹوں کے..... در سے اٹھا اور
مقتول بیٹے کا خاندان جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔
تاریخ سے کون سبق سیکھے گا۔ میرا قلم اور بھی بہت کچھ
لکھنے کے لیے بے تاب ہے مگر کچھ فائدہ نہیں۔ تاریخ
سے کس نے سبق سیکھا ہے۔ وہ تو میں جنہوں نے
تاریخ سے سبق سیکھا ہے وہ آج بام عروج پر
ہیں۔ آپ کا صفحہ ”دستک“ پہ کچھ رائے دینا گویا
ایک چراغ کو سورج کے سامنے رکھنا ہے۔ اگر میں
کہوں کہ آپ حقائق کا برملا اظہار فرماتے ہیں تو یہ
میری مبالغہ آرائی نہ ہوگی بلکہ حقیقت کا اعتراف ہو
گا۔ شوکت افضل صاحب کی تحریروں پر اپنی رائے
دینا میری بساط میں کہاں۔ وہ ادب میں اپنا ایک
مقام رکھتی ہیں۔ ہاں! محترم نعمان خان صاحب نے
کراچی سے ”خود جلیں دیدہ اغیار کو بیٹا کر دیں“ پر
اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اس پر میں ان
کا شکریہ ادا نہ کروں تو پینل کھلاؤں۔ ایسے کرم

ہیں اور یوں یہ ریت و روایت زور پکڑ جاتی ہے کہ ہم
زندہ انسانوں کو دھکے دیتے ہیں اور مرنے والوں کو
ایوارڈ..... شاید اس لیے ہمارے ایوارڈز بھی لوگوں کے
مرنے کے منتظر رہتے ہیں۔
ایک تجویز ہے کہ ہر مہینے کسی ایک صحابی کی زندگی پر
مکمل مضمون دیا کریں تاکہ ہم اپنے ان روشنی کے
میناروں کی زندگیوں سے متعلق پڑھ کر اپنی زندگیوں میں
بھی روشنی لاسکیں۔

(رانا محمد شاہد، پور پوالہ)

بہتر سے بہترین

جناب محترم کامران احمد صاحب! السلام علیکم
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہونگے۔ سیارہ ڈائجسٹ
ہمارے سامنے ہے۔ خوبصورت ناسل کے ساتھ تمام تر
سلسلے خوب رہے۔ شعور یز اور مختلف موضوعات کا انتخاب
لاجواب رہا۔ سیارہ ڈائجسٹ کا معیار بہتر سے بہتر ہو رہا
ہے۔ ہمارے آرکیٹیکٹ لگانے کا شکریہ۔ آئندہ شمارے کے
لیے ترجمہ کردہ کہانی ”نا قائل شکست“ اور غزل اور مرسلہ
ارسال خدمت ہیں۔ برائے مہربانی قریبی اشاعت میں
جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر شاف اور سیارہ ڈائجسٹ کے
تمام قارئین کو دعا و سلام۔ اپنا خیال رکھیے گا۔
(ایس۔ امتیاز احمد، کراچی)

کردار کا غازی

گرامی القدر جناب کامران احمد خاں صاحب!
السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ شمارہ نومبر کا اعزازی پرچہ
ملا جو میرے لیے باعث طمانیت ہے۔ اب یہ ترقی کی
منزل کی طرف کامیابیوں سے گامزن ہے۔ اس میں
شامل تمام سلسلے قابل تعریف ہیں۔ ٹائٹل کو عمران خان
صاحب کی خوبصورت فوٹو فائل سے مزین کیا گیا ہے۔
اس سلسلے سے عیاں ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں غطال
و پچھان ہیں۔ وہ یقیناً پاکستان کا مستقبل ہیں..... ان کی
تشویش یوں نہیں ہے۔ وہ پاکستان کے ایک مخلص لیڈر
ہیں۔ کرکٹ میں بھی ان کا نام آج بھی احترام سے لیا

نہیں تھیں۔ خاص کر حضرت بی بی زینبؓ (ان کی عظمتوں
کو سلام) کا نام پڑھ کر۔ ہر نماز کے بعد کے لیے آپ
نے دعائیں لکھیں لیکن تہجد کے بعد کی دعائیں نہیں
بتائیں حالانکہ رمضان شریف میں نہ پڑھنے والے بھی
پڑھ لیتے ہیں۔ بہر حال میں نے صبح کی نماز کے بعد
پڑھنے کی بجائے اس سے پہلے پڑھیں۔ آپ نے صفحہ کا
نمبر رسالہ کے حساب سے بتایا لیکن اس میں نمبر کے
مطابق سورۃ البیّن 16 نمبر صفحہ پر نہیں تھی۔ یہ چھوٹی سی
غلطی جو مجھے محسوس ہوئی میں نے آپ کو بتا دی۔ اللہ
تعالیٰ آپ سب کو اجر دے اور مبارک ہو ان محترمہ کو
جنہوں نے اتنی محنت سے سب دعائیں ترتیب دیں۔ کیا
ان کا فون نمبر آپ رسالہ میں دے سکتے ہیں۔ بہت
مہربانی ہوگی۔ والسلام

(بنگم نسرین محمود، بہاولپور)

☆ نسرین صاحب! آپ سیارہ ڈائجسٹ کے ذریعے خط
لکھ کر محترمہ تنیم کو قریب صلیب سے رابطہ کر سکتی ہیں۔

مرنے والوں کے لیے ایوارڈ

جناب کامران احمد صاحب! السلام علیکم
آج کے ملکی حالات اس قدر دگرگوں ہیں کہ دل
خون کے آنسو روتا ہے۔ حکومتی بے حسی اپنی آخری حدود
پر ہے۔ پارلیمنٹ کے سامنے ایک بیروزگار شخص خودسوزی
کر کے موت کے منہ میں جا رہا ہے تو بعد از موت اسے
ایک لاکھ روپے اور اس کی بیوی یا بیٹے کو پولیس میں
ٹوکر ل جاتی ہے۔ ریلوے کے پنشنرز اپنے جائز حق
کے لیے دھکے کھاتے ہیں اور جب ان میں سے ایک
بوڑھا پنشنر جس نے اپنی زندگی کے 35 سے زائد قیمتی
سال فرین ڈرائیور کے طور پر ریلوے کی خدمت میں
گزارے تھے، اسے چند ہزار روپے نہیں ملتے اور رات
کے لائن میں لگے بوڑھے کے جسم اور روح کا رشتہ برقرار
نہیں رہتا اور جو بی بی اس کے مرنے کی خبر میڈیا پر چلتی ہے
تو ریلوے کے باقی پنشنرز کو پیش ملنا شروع ہو جاتی ہے
اور اس بیچارے کے لیے 5 لاکھ روپے اناؤنس ہو جاتے

کیا تھا۔ اس مراسلے میں بنیادی طور پر تین وعدے کئے گئے تھے۔

(۱) فوج کے ان پانچ ٹاپ جرنیلوں کو فارغ کرنا جنہیں امریکہ ناپسند کرتا ہے۔

(۲) پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مکمل طور پر بندش۔

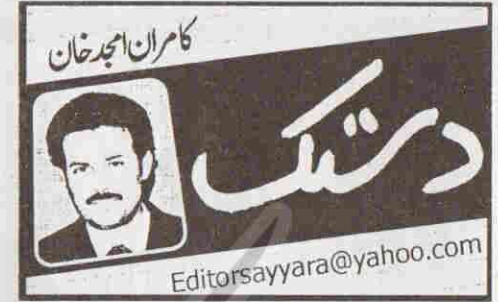
(۳) امریکی فوج کو افغانستان کے راستے پاکستان کے اندر داخل ہونے کی کھلی اجازت۔

یہ تفصیلات منصور اعجاز نے اخبارات کو فراہم کی ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آصف علی زرداری پاکستانی فوج کے پانچ اہم ترین جرنیلوں کو کس طرح ہٹانا چاہتے تھے یا ہٹانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تو اس کا جواب بھی سامنے آچکا ہے۔ انکشاف ہوا ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت عوامی گروپوں میں ایک بغاوت کا ساما حول پیدا کیا جانا تھا (حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہ ہوتا) اور پھر اس کا ذمہ دار ان پانچ جرنیلوں کو ٹھہرا کر انہیں عہدوں سے ہٹا دیا جاتا۔

اس مراسلے کے حوالے سے سیاسی حلقوں کی طرف سے متعدد سوالات اٹھائے گئے مگر پیپلز پارٹی کے اعلیٰ حلقوں نے اس کے بارے میں سنجیدہ موقف دینے میں بہت تاخیر کی۔ بتایا جاتا ہے کہ صدر زرداری کے قریبی حلقوں نے انہیں اس حوالے سے پر زور تردید جاری کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ ”ان کو کچھ روز گند پھیلانے دو، ہمیں اپنے دوست دشمن کا معلوم ہونا چاہیے۔“ جب امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن پاکستان کے دورہ پر آئیں تو پاکستانی صحافیوں نے ایک ملاقات کے دوران ان سے اس مراسلے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ تاہم انہوں نے اس کی تصدیق یا تردید کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیلری کلنٹن کے اس رویے نے پاکستانی سیاسی حلقوں کو یہ باور کرا دیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ یہیں سے افواہ سازوں کو حکومت کے خلاف افواہیں پھیلانے کا موقع مل گیا اور سیاسی و صحافتی حلقوں نے حکومتی عہدیداروں کو اس مراسلے کے حوالے سے سوالات پوچھ پوچھ کر زچ کر دیا۔ بالآخر حکومت کو باقاعدہ تردید جاری کرنا پڑی اور صدارتی ترجمان فرحت اللہ بابر نے منصور اعجاز کے آرٹیکل کو محض الزامات اور جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔

یہاں منصور اعجاز کے حوالے سے یہ تفصیل قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ وہ پاکستانی سیاست خاص طور پر خفیہ معاہدوں، بیک ڈور ڈپلومیسی اور مذاکرات کے حوالے سے مافیہ میں بھی سرگرم رہے ہیں۔ 1995ء میں انہوں نے محترمہ بینظیر بھٹو کو ملٹری انٹیلی جنس کی طرف سے حکومت گرانے کی سازش سے آگاہ کیا تھا۔ منصور اعجاز امریکی عہدیداروں کے بھی خاصے قریب رہے ہیں۔ سابق صدر مشرف سے بھی ان کی ملاقاتیں رہیں۔ وہ 1997ء میں قائم ہونے والے نواز شریف حکومت کے وزراء کے بھی بہت قریب رہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ 2000ء میں انہوں



قصہ ایک خط کا.....!

پاکستان اور امریکہ کے سیاسی حلقوں میں ان دنوں ایک خط (مراسلے) کا بے حد چرچا ہے اور یہ خط اب ایک معرکہ بنتا جا رہا ہے۔ اس خط کا ذکر پاکستان میں عوامی سطح پر سب سے پہلے تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے کیا تھا۔ انہوں نے لاہور کے جلسے میں خطاب کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ صدر زرداری نے امریکی فوج کے سربراہ مائیک مولن کو خط لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے جرنیلوں سے انہیں بچایا جائے۔ عمران خان نے دعویٰ کیا کہ یہ خط امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی نے منصور اعجاز کو دیا تھا تا کہ وہ اسے مائیک مولن تک پہنچا دیں۔ حسین حقانی نے فوری طور پر اس امر کی تردید کی اور کہا کہ انہوں نے ایسا کوئی خط نہیں دیا۔ اس معاملے پر پیپلز پارٹی کے چند حلقوں نے مبہم الفاظ میں تردید کی کہ ایسا کوئی خط لکھا گیا ہے۔ تاہم عمران خان اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور انہوں نے واضح کیا کہ اس خط کی تفصیلات برطانیہ کے ایک معتبر اخبار فنانشل ٹائمز میں شائع ہوئی ہیں جہاں خود منصور اعجاز نے ایک آرٹیکل لکھ کر یہ اعتراف کیا کہ 2 مئی کو ایبٹ آباد آپریشن میں اسامہ کی ہلاکت کے بعد صدر زرداری نے ایڈمرل مائیک مولن کے ذریعے وائٹ ہاؤس کو ایک خفیہ مراسلہ بھیجا تھا۔ فنانشل ٹائمز کے مطابق اس مراسلے میں صدر زرداری نے مبہم طور پر امریکی حکام کو بتایا کہ ان کی حکومت کو فوج کی طرف سے خطرہ ہے اور امریکہ جنرل کیانی کو اقتدار پر قبضہ کرنے سے روکے۔

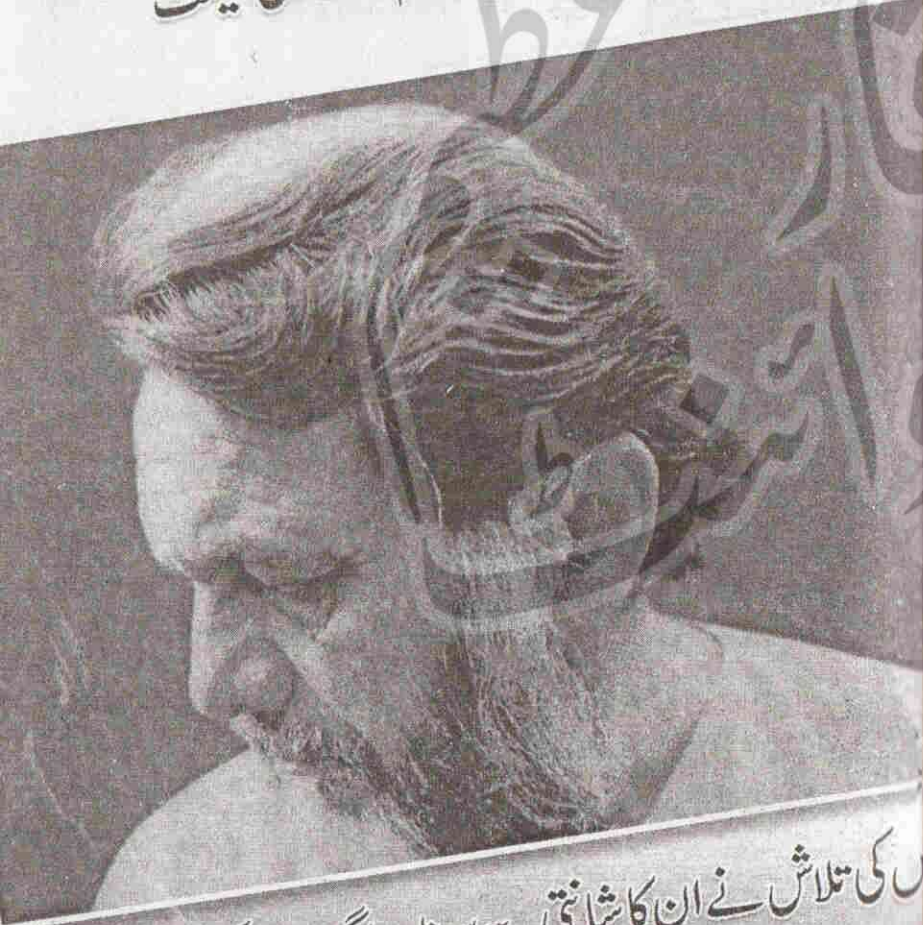
چند روز قبل اس مراسلے کی کچھ تفصیلات مزید سامنے آئی ہیں جن میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ صدر زرداری نے اس مراسلے میں فوج اور آئی ایس آئی کی قیادت میں بڑی تبدیلی کا بھی وعدہ

نے امریکی صدر بل کلنٹن کے کہنے پر امریکہ اور سوڈان اور بعد ازاں پاک بھارت معاہدوں میں مدلل مین کا کردار ادا کیا۔

بہر حال منصور اعجاز نے اپنے آرٹیکل میں دعویٰ کیا ہے کہ ایک اعلیٰ سفارتکار نے اس مراسلے کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا اور وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے اس مراسلے میں لکھا اس کی اعلیٰ سفارتکار نے منظوری دی تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اب تک جو کیا یا لکھا ہے اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں اور اس معاملے میں انہیں چیلنج کرنا سنگین غلطی ہوگی۔

اس خط اور اس کے اثرات کا چرچا اب ملک میں چاروں طرف پھیل رہا ہے۔ چند روز قبل ہی آرمی چیف اور امریکی سفیر نے صدر زرداری سے ملاقات کی اور اس خط کے حوالے سے مذاکرات ہوئے۔ بعد ازاں ایوان صدر میں اسی حوالے سے خصوصی اجلاس بھی منعقد ہوا اور وزیراعظم گیلانی کو بھی اسی روز پارلیمنٹ میں خطاب کے دوران خط کے حوالے سے وضاحت کرنا پڑی۔ اس ضمن میں اہم خبر یہ بھی سامنے آئی کہ امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کو فوری طور پر پاکستان طلب کر لیا گیا ہے اور ان کے مستعفی ہونے کے حوالے سے بھی خبریں آرہی ہیں۔ سیاسی حلقوں میں ہلچل ہے۔ افواہیں زوروں پر ہیں کہ پیپلز پارٹی کی حکومت 2012ء تک نہیں بچے گی۔ عمران خان پہلے ہی مارچ میں انتخابات کا عندیہ دے چکے ہیں۔ ناقدین سیاست بھی سینیٹ کے آئندہ انتخابات کو انتہائی اہم قرار دے رہے ہیں اور مسلم لیگ (ن) بھی سینیٹ میں متوقع شکست کو کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہیں اور اس سے قبل ہی حکومت کا بوریا بستر گول کرنا چاہتی ہے۔ صدر زرداری بظاہر پرسکون نظر آتے ہیں اور انہوں نے حال ہی میں ایک آرٹیکل لکھ کر بتایا ہے کہ سیاسی حکومت اور فوجی قیادت میں خارجہ و سکیورٹی معاملات پر مکمل ہم آہنگی ہے۔ اسی طرح وزیراعظم گیلانی بھی یہ بیان دے چکے ہیں کہ ”کیوں کہوں عمران خان کا جلسہ ایجنسیوں نے کامیاب کر لیا جبکہ فوج اور اعلیٰ جنس ادارے ہمارے ساتھ ہیں“ لیکن اس سب کے باوجود ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں اور وہ ایک ”خط“ جس کا بہت چرچا ہے اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ اور یہ حقیقت اور اس کے نتائج جلد سامنے آنے والے ہیں۔

”بابا صاحب“ یادوں کا کراماتی سلسلہ
وزڈم آف دی ایسٹ



س کی تلاش نے ان کا شانتی سے سونا، جاگنا حرام کر دیا تھا

اشفاق احمد

بابا صاحب

یادوں کا کراماتی سلسلہ

وزڈم آف دی ایٹ

جس کی تلاش نے ان کا شائق سے سونا، جاگنا حرام کر دیا تھا

آپا بانو قدسیہ کے مطابق ”بابا صاحب“ یادوں کا ایک کراماتی سلسلہ ہے۔ عام طور پر ایسے واقعات اور حالات آدمی کی یاد میں رہ جاتے ہیں جن کا تعلق ناکامی، ٹریجڈی، احساس کمتری اور احساس جرم سے ہوتا ہے۔ خوشی کے واقعات قوس قزح کی طرح انسان کے زمینی افق پر ابھرتے اور پھر جلد بخو ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی سو فیصد اصول نہیں بلکہ انہیں یادوں کی رنگارنگی سے ان کے جداگانہ تجربے سے زندگی کا نادر بودا بنتا ہے۔

ہم نے اشفاق احمد صاحب کی کتاب ”بابا صاحب“ سے چند اقتباس یہاں نقل کئے ہیں تاکہ سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین ان سے مستفید ہو سکیں۔ جو مزہ پوری کتاب پڑھنے میں ہے وہ پورا تو نہیں ہو سکتا مگر ان کو پڑھ کر آپ پوری کتاب پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ کتاب سنک میل چلی کیشر نے شائع کی ہے۔ قیمت 1200/- روپے ہے۔ (ایڈیٹر)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شاہی بھنگی تھا۔ وہ جو پاخانہ صاف کرنے کے لیے محل میں گیا تو اتفاقاً اس کی نظر شہزادی پر پڑ گئی اور وہ بھنگی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا مگر اپنے کمینہ پن اور شہزادی کے علوم تہذیب کو دیکھ کر کہ یہ وصل تو ناممکن ہے، ناامید ہو گیا!

مرض عشق نے جب غلبہ کیا تو وہ بہت بیمار ہو گیا اور بجائے بھنگی کے اس بھنگی کی عورت پاخانہ کمانے لگی۔ کشش دل کا اثر مشہور ہے۔ شہزادی کے دل میں بھی اس کا اثر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اس بھنگی کی عورت سے شہزادی کہنے لگی کہ ”اب تیرا خاوند کیوں نہیں آتا؟“ اس نے کہا ”وہ بیمار ہے۔“

شہزادی نے کہا ”ہم شاہی طبیب اس کے معالجے کے واسطے بھیج دیں؟ اس کو کیا بیماری ہے؟“ بھنگن شہزادی کا یہ سوال سن کر خاموش رہی لیکن جب شہزادی نے بہت اصرار کیا اور بھنگن کو سخت دھمکی دی کہ بتلا اس کو کیا بیماری ہے؟ تو بھنگن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور اگر جان کی امان لے تو عرض کروں؟ شہزادی نے امان دی تو اس نے کہا ”حضور! اصل بات تو یہ ہے کہ بیماری اسے کچھ نہیں۔ وہ حضور کو دیکھ کر آپ کا عاشق ہو گیا ہے لیکن اب چونکہ دوبارہ دیدار ممکن نہیں، اس لیے غم سے لاچار ہو کر قریب المرگ ہو گیا ہے اور چند ہی روز میں اس دنیا سے کوچ کیا چاہتا ہے۔“

شہزادی نے کہا ”یہ اختیاری بات نہیں لیکن اگر میرے دیکھنے سے اس کی جان بچ جائے تو میرا کوئی نقصان نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ میرا مرتبہ مجھے اس کے سامنے آنے سے مانع ہے کیونکہ اس سے میری، بادشاہ سلامت کی اور ساری سلطنت کی بدنامی ہوگی البتہ ایک ترکیب بتاتی ہوں اگر وہ اس پر عمل کرے تو شاید مجھے دیکھ سکے اور اس کی جان بچ جائے۔“

بھنگن نے ہاتھ باندھ کر کہا ”آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ جو آپ فرمائیں گی وہی ہماری زندگی کا کارن بن جائے گا۔“

شہزادی بولی ”ترکیب یہ ہے کہ وہ فقیرانہ شکل بنا کر دریا کے کنارے بیٹھ جائے اور رات کوٹھو اسے روٹی وغیرہ کھلا دیا کر۔ وہ تمام دن اللہ تعالیٰ کا نام لیتا رہے اور آنکھیں بند کر کے اللہ اللہ کرتا رہے اور کسی طرح کا خیال اپنے دل میں نہ رکھے۔ بس ایک ہی طرف لو لگا کر بیٹھا رہے۔ اگر کوئی اس کو نقدی یا کھانے کی چیز نذر کرے تو ہرگز نہ لے۔ لوگ یہ چیزیں وہاں چھوڑ جائیں تو مطلق توجہ نہ کرے اور اگر کوئی یہ چیزیں اٹھا کر لے جائے تو اس کو منع نہ کرے۔ چند روز میں جب اس کی شہرت دور دور تک ہو جائے تو امیر غریب، متعدی سپاہی، وزیر سالار سب اس کی زیارت کو جائیں گے۔ پھر بادشاہ بھی جائے گا اور جب بادشاہ ان کی زیارت کر کے لوٹ آئیں گے تو میں بھی ان سے اجازت لے کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ اسے اپنے درس دکھاؤں گی۔ یوں اسے ملنے اور بات چیت کرنے کا خوب موقع مل جائے گا۔“

بھنگن نے ہاتھ جوڑ کر اور سیس نوکر شہزادی کا شکریہ ادا کیا اور گھر آ کر یہ بات بھنگی کو سنائی۔ بھنگی کی ویران دنیا میں بہار آ گئی۔ اسی وقت ایک یورپا اٹھا کر دریا کنارے جا بیٹھا اور بام خدا میں مشغول ہو گیا۔ پھر ایسی حالت بنائی کہ اگر کوئی نذر دیتا تو اس کی طرف توجہ نہ کرتا اور جو کوئی رکھ جاتا اور دوسرا اٹھا لے جاتا تو اسے منع نہ کرتا۔ رفتہ رفتہ عام شہر میں اس کی شہرت ہو گئی۔ لوگ اس کے پاس آنے لگے اور نذریں وغیرہ بھی لانے لگے مگر اس نے کسی کی طرف دھیان نہیں کیا اور اللہ اللہ کرتا رہا۔

ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو اس کا حال دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا واقعی وہ فقیر سچا ہے اور دنیا سے بے تعلق ہے۔

وزیر حکم پاتے ہی سیدھا دریا کنارے پہنچا اور جا کر فقیر کو نذر پیش کی۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ نہ اس کی طرف دیکھا، نہ اس سے کوئی بات کی۔ بس اسی طرح آنکھیں موندے اللہ سے لو لگائے بیٹھا رہا۔

وزیر نے یہ حال بادشاہ کو سنایا کہ واقعی اس کا رنگ ایسا ہی ہے کہ دنیا کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لوگوں کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ذات میں گم بیٹھا ہوا ہے۔

اگلے روز بادشاہ ہو گیا۔ نذر نیا زدی، سلام کیا لیکن فقیر ملتفت نہ ہوا، اسی طرح بیٹھا جا پ کرتا رہا۔ رات کو شہزادی نے پوچھا ”سنا ہے آج آپ کسی فقیر کے پاس تشریف لے گئے تھے، اس کو کیسا پایا؟“

بادشاہ نے کہا ”وہ فقیر بہت ہی سچا اور دنیا سے بالکل لاتعلق ہے۔ کوئی مادی یا دنیاوی غرض اس کو چھو تک نہیں مگنی۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری مملکت میں اللہ کے کسی نیک بندے نے قیام فرمایا اور ہماری قلمرو کی عزت افزائی کی۔“

شہزادی نے عرض کیا ”اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں بھی اس کی زیارت نہ کر لوں؟“

بادشاہ نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔ جب دل چاہے، ان کو سلام کر آنا اور ان کی خدمت میں کوئی نذر بھی لے جانا۔ شاید تمہاری نذر قبول کر لیں۔“

شہزادی نے اس کی عورت بھگتن کو بلا کر کہا کہ ”اس سے کہہ دینا کہ میں کل صبح آؤں گی اور اپنے دیدار کے شربت سے تم کو سیر کر دوں گی۔ کل تمہاری برسوں کی دلی مراد بر آئے گی اور حسرت و دیدار پوری ہو جائے گی۔“ اس بھگتن نے جا کر اپنے گھر والے کو یہ مژدہ سنایا کہ جس کے لیے تو کئی سال سے بہر و پ بھر کر بیٹھا ہے، وہ خود چل کر تیرے پاس آ رہی ہے اور تیرے سامنے بیٹھ کر اپنا موہنا مکھڑا خود تجھ کو دکھا رہی ہے۔ بھگتی خوشی کی یہ خبر سن کر ترپ کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔

جب ہوش میں آیا تو دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا، میں نے یہ کام آج تک جھوٹ موٹ محض ایک نفسانی غرض کے لیے کیا تھا اور اس کا ایسا مثبت نتیجہ سامنے آ گیا۔ جب اس کے نام میں اس قدر تاثیر ہے کہ میرے جیسے ناچیز اور حقیر کے پاس بڑے سے بڑے مرتبے اور اعلیٰ رتبے والے بادشاہ کو بھیج دیا تو اگر میں سچے دل سے اس کا نام لوں، پھر معلوم نہیں اس سے بھی زیادہ اور کیسی کیسی نعمتیں ملیں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ زار زار رونے لگا اور اپنے پہلے ارادے سے نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کر کے اس نے دعا کی کہ خداوند مجھے اپنا دیدار دکھا دے۔ جب تیرے نام میں اتنا اثر ہے کہ بادشاہ اور وزیر اور شہر کے امراء و رؤسا میرے پورے پر آنے لگے تو خبر نہیں تو خود کس قدر سوہنا ہو گا اور جب میں نے جھوٹ موٹ مکرو فریب سے تیرا نام لیا تو ملک کے بادشاہ کو میرے پاس بھیج کر میری عزت افزائی کرا دی تو اب جبکہ میں سچے دل سے تجھے پکارتا ہوں تو ایسا رحیم و کریم ہے کہ خود بھی ضرور ہی میرے پاس آ جائے گا اور مجھے اپنا دیدار کرا دے گا۔ اسی طرح تمام رات روتا رہا اور گریہ و زاری کرتا رہا۔

جب پچھلی رات ہوئی تو اس کی عجز و زاری بارگاہ الہی میں مقبول ہو گئی اور فرش سے عرش تک اس کو انکشاف ہو گیا اور بہشت کی حوریں اس کو دکھائی دینے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ایسا معاملہ پلٹا کہ پہلے یوں تھا، پھر یوں ہو گیا۔

صبح کو جب شہزادی اس کے پاس پہنچی تو وہ مطلق اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ حوران بہشت اس کی طرف نظر اٹھا کر زیارت کر رہی تھیں اور تجلیات ذات الہی اس پر وارد ہو رہی تھیں اور وہ مشاہدہ حق میں مستغرق ہوا جا رہا تھا۔

باندیوں نے اس کا کندھا ہلا کر کہا ”مملکت کی شہزادی تشریف لائی ہیں اور یہاں تمہارے سامنے بیٹھی ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بات چیت کرو اور مدعا اپنے منصوبے کا بیان کرو۔“

اس نے بڑی دیر کے بعد جواب دیا کہ ”اب مجھے شہزادی کی کچھ پروا نہیں، شہزادی سے ہزار ہا درجہ حسین و جمیل حوریں اس وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہیں اور میں محو نظارہ آرام سے اس حسن لافانی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔“

شہزادی نے یہ سن کر کھینچ کر ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا اور کہا ”بے وفا! بے ایمان! تیری مرشد تو میں ہوں اور تو حوروں اور بہشت کے تماشے میں مشغول ہوا بیٹھا ہے۔ خود تو وہاں تک چلا گیا اور میں یہیں رہ گئی۔ مجھ کو بھی تو اپنے ساتھ یہ تماشے دکھلا اور مجھے بھی اس دنیا کی سیر کرا۔“

اس نے شہزادی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے واصل بہ حق ہو گیا۔ وہ بد نصیب روتی جتنی نالہ و شیون کرتی اپنی باندیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں واپس گل کوروانہ ہو گئی۔
سو اللہ کا نام لیتا ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ رکھتا ہے۔ چاہے جھوٹ ہو چاہے سچ۔ اس کام میں کبھی جھوٹا بھی سچا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

روم کے کافی ہاؤس میں ایک معزز شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا آپ مشرق کے لوگوں کے ساتھ تو ہمیشہ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی مغربی دنیا میں بھی ایسے ہو جاتا ہے لیکن ہم اس کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔
کہنے لگا، میں ریس کورس میں اپنے آخری سولیرے پار کر جب باہر نکلا تو مجھے قریبی غسل خانے میں جانے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں گیا تو وہ سرکاری غسل خانہ تھا اور وہاں سولیرے (انٹنی) کا سکہ ڈال کر دروازہ کھولا جاسکتا تھا۔ میری ساری جیبیں خالی تھیں اور میں غسل خانے کا دروازہ کھولنے سے معذور تھا۔ سڑک کنارے میں نے پارک میں بیچ پر بیٹھے ایک شخص سے آکر انٹنی مانگی تو اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بڑی احتیاط کے ساتھ انٹنی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں بھاگا بھاگا پھر غسل خانے میں آیا اور ابھی انٹنی Slot میں ڈال کر دروازہ کھولوانے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کھلے دروازے کا پتہ تمام کر کھڑا ہو گیا کہ ایسے ہی اندر آ جائیے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

غسل خانے میں داخل ہونے کے بعد میں نے جلدی سے فراغت حاصل کی اور بھاگ کر پارک کی طرف گیا کہ اس شخص کو انٹنی واپس کر دوں جو میں نے استعمال ہی نہ کی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا اور جا چکا تھا۔ میں نے عادتاً وہ انٹنی سامنے لگی لاٹری مشین میں ڈال کر ہینڈل گھمایا تو اس کے جواب میں دس روپے کا ایک سکہ خانے میں آگرا۔ میں نے دس روپے پھر مشین میں ڈال کر ہینڈل گھمایا تو سو روپے میرے تصرف میں آ گئے۔ سو روپے کی خلیفہ رقم لے کر میں پھر اس کورس کی طرف بھاگا۔ وہاں سے سب سے کمزور اور نامقبول گھوڑے پر میں نے پورے سو روپے لگا دیئے۔ کئی بھی مجھے منع کرتا رہا کہ دس روپے لگا لو سو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں جانے دو۔

حیرانی کی بات سے وہ نامقبول گھوڑا جھنڈی جیت گیا اور مجھے دس ہزار روپے مل گئے۔ وہ رقم لے کر میں گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ ایک ڈوبی ہوئی کھیتی کو زندہ کرنے کے لیے پھر شیر قلوٹ کئے گئے ہیں۔ میں نے وہ دس ہزار سارے کے سارے اس بیمار کھیتی میں لگا دیئے۔ چھ مہینے تک ان حصوں کی شکل و صورت ویسی ہی رہی لیکن چھ مہینے کے بعد ان میں بوہوتری کے آثار پیدا ہوئے اور میرے شیرنز دس لاکھ کے ہو گئے۔ وہاں سے میں نے باقاعدہ بزنس شروع کر دیا اور چلتے چلتے میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں آپ سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن اتنی ساری دولت اور ایسی شہرت کمانے کے بعد مجھے آج تک ایک ہی چیز کی حسرت رہی اور وہ اب تک پوری نہیں ہو سکی۔ میری آخری خواہش ہے.....

میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے آپ چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس آدمی کو ڈھونڈ نکالوں جس نے مجھے غسل خانہ

کھولنے کے لیے انٹنی دی تھی۔“

اس نے کہا ”نہیں مجھے اس شخص سے ملنے کی آرزو ہے جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا اور کہا تھا ایسے ہی اندر آ جائیے۔“

اصل میں جو آدمی آپ کے لیے کوئی دروازہ کھولا ہے وہ آپ کا محسن ہوتا ہے اور جو دروازہ کھول کر کھڑا رہتا ہے کہ آپ داخل ہو جائیں وہ محسن عظیم ہوتا ہے اور اس نے آپ کو ایک نئی جگہ تلاش کر کے دی ہوئی ہے۔

☆☆☆

اماں جعدارنی نے اندر آ کر میری بیوی سے کہا ”بی بی! محل پانچ آدمی آئے ہیں۔ چار تو جوان ہیں پر ایک بڑی عمر کا ہے۔“

میں اس شخص کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا اور مجھے دفتر کے تین چار ایسے کام یاد آ رہے تھے جن کا کیا جانا آج ہی ضروری تھا۔ میں نے پوچھا ”ان کو کچھ یاد ہے؟“

اماں نے کہا ”لال دین ان سے پوچھ کر آیا ہے۔ نہ تو انہوں نے چائے پنی ہے نہ ہی شربت۔ وہ ڈیرے سے ورد کر کے اور لسی پی کر چلے تھے۔ اب وہ دوپہر کے وقت صرف روٹی کھائیں گے اور شام کے کھانے سے پہلے پہلے چلے جائیں گے۔“

اماں جعدارنی کی اس تفصیلی انفارمیشن سے میں بہت خوش ہوا اور بانو کے پاس جا کر بولا ”بہتر یہی ہے کہ تم شام تک اماں کو اپنے پاس رکھ لو۔ یہ لکڑہاروں پر نگاہ بھی رکھے گی اور تمہیں ان کی تفصیلات بھی بہم کرتی رہے گی۔ کارنگر لوگ چور ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی واردات ضرور کر رہے ہیں۔“

میری بیوی نے چڑ کر کہا ”میں اسے گھر نہیں رکھوں گی۔ یہ لاپٹی بی بی ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور میں اسے شروع سے جانتی ہوں۔ آپ آرام سے دفتر جائیں اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سب پر نگاہ رکھوں گی اور ہر ایک سے نمٹ لوں گی۔“

میں کوٹ الٹ کر پارک کر باہر نکلا تو پانچوں لکڑہارے پلاٹ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے بات کیے بنا اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر بڑا لکڑہارا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے بولا ”لو جی ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں۔ میرا نام وریام ہے۔ یہ دو میرے بھتیجے ہیں۔ ایک میرا بھانجا ہے اور ایک میرے استاد کا بیٹا ہے۔ ہم انشاء اللہ شام تک فارغ ہو جائیں گے اور آپ کے آنے تک سارا کام نپٹالیں گے۔“

میں نے کہا ”میں تو اس کام کو ٹھیک سے سمجھتا نہیں۔ جو آپ مناسب سمجھیں وہی کریں میں البتہ شام پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے کہا ”میں نے سلطان سے طے کر لیا تھا۔ ٹہنے ہمارے، شائیں پتر غریب غربا کے گلی آپ کی۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے جو کچھ سلطان نے آپ سے طے کر لیا، وہی میں نے اس کو سمجھایا تھا۔ آپ کام شروع کر دیں۔ میں شاید دوپہر کے وقت کھانا کھانے آؤں تو آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔“

یہ کہہ کر میں نے کوٹ موٹر میں رکھا۔ گاڑی شارٹ کی اور دفتر روانہ ہو گیا۔ راستے بھروسہ چٹا گیا کہ یا اللہ یہ گلی کیا ہوتی ہے، کس کام آتی ہے اور میں اسے رکھ کر کیا کروں گا۔ ان سے پوچھا اس لیے نہیں کہ اس میں میری

دانشوری پر حرف آتا تھا۔

دفتر پہنچنے سے ذرا سا پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر وہ فائل نہیں تھی جس سے آج کے ضروری کام بندھے تھے۔

میں نے وہیں سے گاڑی موڑی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں نے گھر کے کھلے پھاٹک کے باہر گاڑی روکی تو بابا وریام دونوں ہاتھ باندھے سبیل کے تنے کے پاس کھڑا تھا اور اس کے چاروں نوجوان نائب لکڑہارے سینے پر ہاتھ باندھے سر جھکائے اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ بابے کے چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار نمایاں تھے اور وہ بچی نظروں سے تنے کے ہالے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بندھے ہوئے ہاتھوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے چہرہ ذرا اوپر اٹھا کر درخت کے تنے پر نگاہیں گاڑ دیں اور اونچی آواز میں کہا:

سبیل بادشاہ، جنگلاں بنائیں کیا راجا! تیرے پرکھتھ سے راضی رہیں، تیری نسل کا رستوں راہوں ندیوں دریاؤں پر راج رہے۔ تیرے پھلار میں پچھی پکھیروں کے آہنوں کی بستیوں آباد اور تیری چھاؤں میں دھور ڈنگر دلشاد رہیں۔ ہم لکڑہارے امر کے تحت تیرے حضور میں آئے ہیں اور امر کی مجبوری میں تیرے سامنے کھڑے ہیں۔ آج تیرے کاٹنے کا امر ہو گیا ہے اور امر کے سامنے جھٹنا مجبور ٹو ہے اتنے ہی مجبور لکڑہارے ہیں۔ ہم کو اذن دے کہ اگلے جہان تیرے اور ہمارے درمیان حق حقوق کا جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے اور ہم غریب مارے نہ جائیں۔ ہماری نسلوں پر بھار نہ پڑ جائے.....

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر تنے پر رکھے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ پھر پلٹ کر بولا "مبارک ہووے اذن ہو گیا۔ میرا کلبھاڑا دے راجا!"

اس کے بھانجے نے پیچھے ہٹ کر بابے وریام کا کلبھاڑا اٹھایا اور اس کا پھل چوم کر بابے کو پکڑا دیا۔ بابے نے کلبھاڑا کندھے سے اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا "بسم اللہ، اللہ اکبر، اللہ اکبر..... اللہ اکبر" اور پھر تھالے کے پاس سبیل کے تنے کو ٹک لگایا اور پھر اسی طرح ٹک پیچھے کھڑے چھوٹے لکڑہارے اللہ اللہ کا درد اونچی آواز میں کرتے جاتے تھے۔

میں نے دیکھا بابا وریام نے اپنے کلبھاڑے کے ٹھیک ٹھیک منطبق نشانوں سے سبیل کے نچلے تنے میں کتھی رنگ کا ایک ہالا ڈال دیا۔ پھر اس نے پیچھے ہٹ کر اپنا کلبھاڑا چھوٹے لکڑہارے کو دے دیا۔ مجھے گیٹ کے پاس کھڑے دیکھ کر اس نے میرے قریب آ کر فخر سے کہا "بڑا شہ جوان اور پاکباز دکھ ہے۔ اس کی تو گلی ہی اٹھارہ فٹ کے قریب ہوگی۔"

اس وقت مجھ پر کھلا گلی کیا ہوتی ہے اور اس پر کس کا حق ہوتا ہے۔

میں ان کی اس گور بانی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے جذبات میں آ کر اعلان کر دیا کہ شبنے بھی آپ کے شائیں اور پتھر بھی آپ کے اور ساتھ ہی یہ اٹھارہ فٹ والی گلی بھی آپ کی۔ وہ سارے کے سارے میرا یہ اعلان سن کر حیرت میں آ گئے اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

بابا وریام نے کا سو سے کہا "لے ٹو جلدی سے جا اور گلی اٹھانے کا بندوبست کر۔"

کا سو اٹنے پاؤں پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

پھر بابا وریام نے راجن سے کہا "تو اوپر چڑھ کر دیکھ کوئی پچھی پکھیر، چنگر بوٹ، آٹھ پھوس تو کسی اٹلے میں نہیں۔"

راجن اپنا کلبھاڑا ساتھ لے کر اس قدر درخت پر ایسے چڑھ گیا جیسے ہم لفٹ پکڑ کر چوتھی منزل پر جاتے ہیں۔ اس نے درخت کی پھٹنگ پر کھڑے ہو کر سارے سبیل پر نظر دوڑائی اور بولا "کچھ نہیں ما۔ کوئی بھی نہیں۔"

وریام نے کہا "بسم اللہ کر کے شبنے کو ٹک لگا اور ساتھ کے ٹھنوں کو بچا۔ ان کو اٹنا کلبھاڑا نہ لگ جائے، راجن نے کہا، ٹو فکر ای نہ کر ما آج کوئی پہلی بار تو درگاہ پر نہیں چڑھا جو سائیں بادشاہ کو سٹ پیٹ مار دوں گا۔" میں نے کہا "آپ لوگوں کو اتنی اونچائی پر چڑھتے ہوئے کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس طرح سے تو ڈس بیلنس ہونے کا خطرہ ہے۔"

وریام نے کہا "نہیں سرکار۔ صدق یقین ہو تو درخت لکڑہارے کی آپ حفاظت کرتا ہے۔ آج تک کسی روکھ نے لکڑہارے کو نہیں گرایا۔ کسی کی نیت بد ہو تو پھر دوسری بات ہے۔" میں نے اندر سے کرسی منگوائی۔ دفتر فون کر دیا کہ آج نہیں آؤں گا۔ سامنے لان میں اڈا جما کر بیٹھ گیا اور اپنے سبیل کو کٹنے دیکھنے لگا۔

درختوں اور انسانوں کا ہزاروں لاکھوں برس کا ساتھ ہے۔ شاید جب انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا تو درخت بھی انسان کے سامنے جھک گئے تھے۔

درخت کٹا دیکھ کر بہت سے لوگ ہمارے پھاٹک کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی، بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ میں نے بشرے کو آواز دے کر پھاٹک بند کرنے کے لیے کہا تو وریام نے منع کر دیا کہ بعض بعض شہنا مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ مگر تے وقت پہلو بدل لیتا ہے۔ بند پھاٹک پر گرے گا تو پھاٹک کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے اس لیے اس کو کھلا ہی رکھیں۔

وہ بڑے بڑے ٹننے کاٹ کر راجن نیچے اتر آیا تو بابے نے کمالے سے کہا یہ آڑا ٹھننا تیرے سوا اور کسی سے نہیں کٹے گا۔ جیر رکھنے کی جگہ تنگ ہے اس کو بھی مارے گا تو کٹے گا، نہیں تو گلی کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔

کمالا لانگٹوس کے اور دونوں ہاتھ کاتوں سے لگا کر تنے پر چڑھ گیا اور راجن اسے کراس کر کے نیچے اتر آیا۔ کمالا سبیل پر ایسے کھڑا تھا جیسے ہوا میں کھڑا ہو۔ اس نے اٹے پہلو سے کلبھاڑا اٹھا کر شبنے پر ضربیں لگانا شروع کیں تو بڑے بڑے چھوڑے اور چھوٹی چھوٹی چیریں ہوا میں راکٹوں کی طرح اڑنے لگیں۔

اماں جعداری گھر سے کھیں لے آئی تھی اور گرتے ہوئے چھوڑے اٹھا اٹھا کر لان پر بچھے ہوئے کھیں میں ڈال رہی تھی۔

بابا وریام اپنا ہتھ اٹھا کر میرے پاس آ گیا تھا اور لان میں بیٹھ کر اوپر دیکھنے لگا تھا۔ اس نے مجھے متوجہ کئے بغیر اپنے پیچھے کود دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "بڑا صبر مند برچہ ہے۔ خوش مزاج اور دیالو۔ کس طرح سے اپنی دیہہ کے ٹوٹے زمین پھینک رہا ہے جیسے ہانسی پر بیٹھا تھی بادشاہ دونوں طرف مہرے لٹاتا جا رہا ہو۔"

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ ہمارے گھر کے سامنے بڑے احاطے میں جہاں ہمارے موسیٰ اور گھوڑے بندھے

گزر سکی تو یہیں گرگرا کر برس جائے گی۔ نہ برس سکی تو اوپر ہی اوپر اودے اودے بادل بن جائے گی۔
فلک کی کوئی بات نہیں۔“

ہم خوش ہو گئے کہ اُٹھنے سے اور کھانسی اُٹھانے سے جان بچی۔ لیٹ کر نظارہ کرنے کا موقع ملا اور اتنا سارا
گہرا اور رنگ ایسی کثرت سے اتنی دیر تک دیکھنے کا وقت ملا۔

پہلے تو مونے مونے ہوندے ہمارے چہروں اور ہاتھوں اور ہاتھوں پر پڑے۔ پھر لمبی لمبی دھاریں اُترنے
لگیں۔ ہم چار پائیاں اُٹھا کر اندر کو بھاگے۔ ہمارے اندر تک پہنچتے پہنچتے سارے سر بھیگ گئے اور ہم میں سے
طرح طرح کی خوشبوئیں آنے لگیں۔

بابا جی لنگر کی تھی کے پاس کھڑے ہم کو اندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بابا جلال کو
اونچی آواز دے کر باقی کی لائینیں جلانے کا حکم دیا کیونکہ سب کو یقین تھا کہ بجلی چلی جائے گی اور پھر ڈیرے کے
ڈونگھے کمرے میں صرف چوکیا دینے کی روشنی رہ جائے گی۔

چوکیا دیا ڈیرے پر مغرب کی اذان کے وقت جلا دیا جاتا تھا اور اس کی روشنی سے دیواروں پر چھوٹے
آدمیوں کے سائے بھی بڑے ہو جاتے۔ دن کے وقت اس دینے کے کڑوے تیل کی خوشبو سارے کوشے میں
پھیلی رہتی اور اس کمرے سے جو تکیہ، گدا، لحاف یا رضائی باہر لائی جاتی اس کے اندر سروں کے تیل کی خوشبو
رچی ہوتی جس سے صاف پتہ چل جاتا کہ یہ ڈونگھے کوشے سے آیا ہے۔

یہ دبا غالباً تانے کا تھا جو لوہے کے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچے سونے پر اس طرح سے فٹ تھا کہ دونوں اب
ایک ہی دھات کے دکھائی دیتے تھے۔ تیل، کالک اور میل کا کوٹ دیے کی میں سے لے کر اوپر تک چڑھا ہوا تھا
جو چاروں تیلوں کی روشنی میں اور بھی چمکدار ہو جاتا تھا۔ مغرب کے وقت یہ دیا باقاعدگی سے جلا دیا جاتا اور بجلی
کے بلب اس کے بعد روشن ہو جاتے۔ بلبوں کی روشنی کے باوصف یہ دیا صبح تک اسی طرح سے جلتا رہتا۔ رات کو
اُٹھنے والا کوئی نہ کوئی بالکا اس میں تیل کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ غٹ غٹ ڈال کر پھر اپنی جگہ جا کر سو جاتا۔
میں نے بابا جی سے اس دینے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اس کے جلانے جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے
فرمایا ”ہمارے پیر سائیں خدا بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ڈیرے پر اسی طرح کا دیا روشن کر کے رکھا کرتے
تھے۔ ہم نے بھی ان کے تتبع میں ویسا ہی دیا بنا کر روشن کر لیا ہے۔“

میں نے کہا ”حضور! اس زمانے میں تو خیر بجلی نہیں تھی اور گھاسلیٹ کے لیپ بھی عام نہیں ہوئے تھے۔
اس وقت تو دیا ٹھیک تھا لیکن اب اس کی کیا ضرورت ہے؟“ تو آپ نے فرمایا ”ہم اسے اپنے لکٹوں کی چاہت
میں روشن کرتے ہیں۔ فائدے نقصان کے لیے نہیں۔ چونکہ حضرت خدا بخش صاحب کے ڈیرے پر ایسی روشنی
تھی اس لیے وہ یہاں بھی ہونی چاہیے کیونکہ یہ ڈیرا اور یہ روشنی انہی کے کمال کا الحاق اور انہی کی برکت کا تسلسل
ہے۔ اس لیے یہاں وہی کچھ ہونا چاہیے جو وہاں ہوتا رہا ہے۔ ابھی ساری لائینیں پوری طرح روشن نہیں ہوئی
تھیں کہ بجلی بجھ گئی اور سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ دو تین لائینوں اور اندر پڑے چوکیا دیے کی روشنی میں
ہم ایک دوسرے کے ہولے دیکھ سکتے تھے لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایسی موسلا دھارا اور بھیانک بارش
میں نے اپنی زندگی میں کل تین مرتبہ دیکھی ہے اور اس کے گھبرا دینے اور دل دہلا دینے والے نقوش میرے دل
پر اب بھی ویسی ہی گرفت رکھتے ہیں جیسے سیلاب کے ترغے میں آنے والے روز رکھتے تھے۔

تھے کہیں سے ایک بلا آگیا۔ اس کے پیچھے چھوٹے بڑے آوارہ کتوں کا ایک غول ہمارے پھاٹک کے نیچے
سے کمریں گھسٹاتا اور لوٹنیاں کھاتا اس کے تعاقب میں لپکا اور اسے احاطے کے اندر کچی دیوار کے ساتھ ساتھ
بھگانے لگا۔ اگر بلا ایک جست بھر کو گودنی کے پیڑ پر چڑھ جاتا اور اونچے دو شانے میں بیٹھ کر اپنے دونوں
پنچے نیچے لٹکا دیتا تو کتے بھوک بھوک بھاگ کر چلے جاتے اور اس کی جان بچ جاتی لیکن اس پیچارے سے جست
بھری نہ جاسکی اور وہ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ یا گلوں کی طرح بھاگتا رہا۔ اصل میں زندگی اور موت
کے درمیان بس ایک جست ہی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ جو زندگی کے سرنگ بورڈ پر پورا بوجھ ڈال کر اور آخری فیصلے
کا پورا ہلار لے کر ایک لمبی زقند بھر جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ زندگی اور موت دونوں کی حدوں سے
آگے گزر کر ایک اور ہی وادی میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے جغرافیے کا تو ہم کو علم نہیں البتہ اس کی تاریخ
سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

اس بلے کا رنگ بھورا اور جسم پر پیلے رنگ کی بڑی بڑی دھاریاں تھیں۔ بھاگتے ہوئے اس کا سارا جھیرا
سروں کے باسی پھولوں کا گھٹا دکھائی دیتا تھا جو کھیتی کا گند گاڑی میں تیزی سے اوپر نیچے اچھل رہا ہو جسے کھیتی کا
ٹریکٹر اندھا دھند بھاگنے لے جاتا ہو۔

جب ایک لمبے کتے کا گندا پنچہ بلے کی کمر پر پہنچ گیا تو بلا ٹپ کر کھٹی دیوار پر کودا اور اپنے خوف کے جوش
میں منڈیر تک پہنچ گیا۔ اس کی بونٹی دیوار کے عین اوپر آگئی اور اس نے دیکھا کہ کھیتوں میں لائینیں جل پانی کر
کے واپس گھروں کو جا رہی ہیں۔ کتوں کی ڈاریں اپنے گھونسلوں کو آ رہی ہیں اور گودنا پھار اپنے ننگے پوتے کو
کندھوں پر بٹھائے اس کی دونوں کلائیوں اپنے کھردرے ہاتھوں میں پکڑے اس سے چھوٹی چھوٹی تالیاں بجواتا
بھیر دینا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے بلے نے ہیزل بلاڈ کے ایک سینکڑ کے ہزاروں حصے میں دیکھا اور
پھر ناخن نہ اڑنے کی وجہ سے زمین پر گر گیا۔ کتوں نے اسے پھر دائرے میں بھاگنا شروع کر دیا اور بلے کا سارا
وجود بالکل باسی ہو گیا۔

جب آوارہ کتے گولڈن بلے کو مار کر لے جاتے تھے تو اس کی دیہہ کا سونا آخری ڈیکھیں مار رہا تھا اور فتح مند
کتے جھولے کے مریضوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے اور کمزوری کی وجہ سے اپنے پیچھے ایک دوسرے
سے مارتے اور اونچکولے کھاتے جا رہے تھے۔

کیا کوئی دنیا کی اس دوڑ میں، لمبی چھلانگ مارے بغیر، تیرتی ہوئی زقند بھرے بغیر ابد میں جھانک کر دیکھ سکتا
ہے۔ ایک سینکڑ کے ہزاروں حصے کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ ہیزل بلاڈ کی کلک کی طرح!

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرا پاک میں آڑی ترچھی چمچی ہوئی کھانوں پر بیٹھے، لیٹے اور نیم دراز تھے۔ نومبر کا
شروع تھا اور بڑا ہی خوشگوار جانا پچھانا موسم تھا کہ اچانک پورب سے کالی گھٹا کا ایک پہاڑ آسمان کی طرف بڑھنے
لگا۔ اس پہاڑ کے آگے آگے خوفزدہ پردوں کی قطاریں تھیں جو تیزی سے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب بڑھ رہی
تھیں اور ان کے اور کالی گھٹا کے درمیان فرق تیز رفتاری کے ساتھ مٹا جا رہا تھا۔ گھبرائی صاحب نے کہا ”تیز
بارش آ رہی ہے چار پائیاں اندر کر لیں۔“

ہم اُٹھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ”فلک کی بات نہیں ہے۔ موٹی دل دار گھٹا ہے گزر جائے گی۔ نہ

بچگی اور پہلو والی گلیوں سے پانی کے ریلے ڈیرا پار کر کے اندر داخل ہو رہے تھے اور سارے احاطے میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے پکی سڑک کی طرف پانی کے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بابا جلال اور سیکرٹری صاحب نے بکریاں جلدی جلدی کھول کر اندر چھوٹی کٹھڑی میں کھڑی کر دی تھیں۔ پانی میں شرابور ہو جانے کی وجہ سے اور ڈر کے مارے وہ اپنے قدم سے آدھی رہ گئی تھیں۔ آسمان سے پانی کی آبشاریں بجلیوں کی طرح ٹوٹی پڑتی تھیں اور اندر احاطے میں پانی کے بڑے بڑے لہریے چل رہے تھے۔ اتنے میں جھپاک سے ڈوب گئے کوٹھے کا چوکھٹا دیا بجھ گیا اور ہم سب کے دل بیٹھ گئے۔ بھائی علی محمد نے اپنی دھیمی، بے خوف، ملائم اور سریلی آواز میں کہا ”پانی حضور کے کوٹھے میں داخل ہو رہا ہے۔“ ہم سب ادھر کو لپکے تو دیکھا کہ کوٹھے کے اندر پانی تیزی سے داخل ہو رہا ہے اور فرش پر رکھے ہوئے کھلی، آنے، گڑ، شکر اور سوکھی رسد کے سارے کنتسرات اس میں ڈوب چکے ہیں۔ پانی کی یہ باڑھ کوٹھے کے موکے میں سے آ رہی تھی جس نے نیلی دھار سے موکے کا گھیر بہت بڑا کر دیا تھا۔ اس کے قریب ایک بینگی ٹیڑھی بے کئی شہتیری تھی جس نے چھت کی ایک طرف کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اب یہ شہتیری ذرا سی دیر میں تیور کر گرنے والی تھی اور اس کے ساتھ آدھی چھت کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نے اکلوتی لائین اوپر اٹھا کر دیکھا تو شہتیری کو اپنے مقام سے پھرے ہوئے اور پانی کے دھارے کو موکے کی سرنگ میں پوری طاقت سے گزرتے پایا۔ ہر طرف ایک شور مچا تھا اور ہم سب بے بس کھڑے تھے۔ جوں جوں ہماری بے بسی بڑھ رہی تھی ہماری آوازیں اور شورے اونچے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی مضبوطی لکڑی مل جائے جسے عموداً کھڑی کر کے ہم گرتی ہوئی شہتیری کو ٹیک دے سکیں تو یہ مصیبت رفع ہو سکتی ہے۔ سیکرٹری صاحب کا خیال تھا کہ ”اگر کوٹھے میں داخل ہونی آبشار کو کسی طرح سے روکا جائے تو شہتیری اپنا وزن سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔“

باباجی کہہ رہے تھے کہ اللہ عظیم مطلق ہے اس کو پتہ ہے کہ کب اور کس وقت بارش بھیجی ہے اور کتنی بھیجی ہے۔ کس پر دباؤ ڈالنا ہے کس کو دباؤ سے نکالنا ہے۔ اس لیے ہر وقت اس کی رحمت کے طلبگار رہو۔ مشکل کے وقت زیادہ رحمت کی امید رکھو۔

میرے لیے یہ بات سمجھتی بہت مشکل تھی کہ کسی مصیبت کے وقت رحمت کیسے آ سکتی ہے کیونکہ اگر مصیبت پر رحمت کی بارش ہونے لگے تو مصیبت مصیبت نہ رہے راحت بن جائے اور مصیبت چونکہ اسی طاقت کی طرف سے بھیجی جاتی ہے جس کے پاس رحمت کے خزانے ہوتے ہیں اس لیے وہ عذاب بھیج کر اس کے ساتھ علاج کیونکر بھیج سکتا ہے۔ میرا مطلب کیوں بھیجے۔ اپنے پلٹن کو خود ہی کیوں ختم کرے۔ اپنے پیکیج ڈیل میں تبدیلی کیوں کرے۔ میرا ذہن چونکہ ایک اور طرح کے علم سے مزین ہے جس میں پیکیج ڈیل، ڈیلوہی، ڈائلاگ، اصولوں پر سمجھوتہ کے واضح خطوط سمجھے ہیں اس لیے میرا ان سے الگ ہو کر سوچنا بہت ہی مشکل ہے جو چیزیں میری معلومات کے غمہ نے پر پوری نہیں اترتیں وہ میرے حساب سے تمام کے تمام غلط اور بے معنی ہیں۔ وہ ہیں ہی نہیں۔ کبھی ہوتی ہی نہیں۔ ہو ہی نہیں سکتیں۔

اتنے میں کسی نے زور سے نعرہ مارا ”نور والے! نور والے!!“ اور ہم سب خاموش ہو گئے۔ رضا صاحب نے بوجھاڑ سے اونچی آواز نکال کر کہا ”حضور ہمارا شہتیر جو ہے اتنا لمبا، ایسا مضبوط، اس کی

ٹیک دے دیتے ہیں۔“

سب نے ٹل کر ہپ ہپ ہرے کے انداز میں ”نور والے“ کا نعرہ لگایا۔ ہر ایک سمجھ گیا لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ ایسے گھپ اندھیرے، برقی بارش، تاریک شہر، چھپی ہوئی مخلوق اور سبھی ہوئی خدائی سے ہم کیسے شہتیر مانگ کر لاسکتے ہیں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسے خطرناک موسم میں کوئی مست ملنگ کوئی مست فکرا اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر ٹرک، ٹرالی یا ٹھیلے پر شہتیر لاد کر ہمیں پہنچا سکتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ گرتی ہوئی چھت کو اس وقت کسی قسم کا سہارا دیا جاسکتا ہے۔ کراماتیں ضرور ہوتی رہی ہیں لیکن بڑھتے ہوئے سیلابوں کے آگے کراماتوں کی ڈائیں کبھی بھی نہیں باندھی جاسکیں۔ کم از کم میرے مطالعے میں اور میری معلومات میں ایسی کرامتیں کہیں بھی نظر نہ آتی تھیں۔

ڈیرہ پاک پر ڈاکٹر صاحب کی جگہ کے پیچھے اور غسل خانوں کے سامنے جہاں بکریاں بندھتی تھیں ایک بہت ہی پرانا شہتیر بڑا تھا جو تین چوتھائی سے زیادہ مٹی میں دبا ہوا تھا۔ اس شہتیر کے ساتھ موٹے موٹے رسوں کے کئی ہالے تھے جن کے ساتھ بکریوں کی رسیاں باندھی جاتی تھیں۔

جب ہم شہتیر اٹھا کر ڈوبنے کوٹھے کی چھت بچانے جا رہے تھے تو باباجی نے فرمایا ”صاحبو! یاد رکھو کہ سب پہلے موجود ہوتا ہے صرف دیکھنے والی آنکھ اور تلاش کرنے والی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشکل پڑنے سے پہلے اس کا ازالہ کرنے کا سامان پہلے سے مہیا کر دیا جاتا ہے۔ یہ شہتیر کئی سالوں سے یہاں پڑا تھا اور اس وقت کا سبب بنا کر پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کی رحمت کا شکر یہ ادا کرو اور ٹرک کر دے قلعندری مانگو! پھر فرمایا دعائے قلعندری یہ ہے کہ ”یا اللہ شیطان اور شرارت سے محفوظ رکھو۔ رحمت سے محروم نہ رکھو۔“ ہم سب نے ایک مدہم لائین کی روشنی میں یہ دعا کی اور اس شہتیر کو ڈوبنے کوٹھے کی چھت کا سہارا بنا کر ٹیک کے طور پر کھڑا کر دیا۔ پھر کئی سال وہ شہتیر سردھڑکی بازی لگا کر اور چھت کو اپنے آپ پر پورا تول کر اسی طرح کھڑا رہا جس طرح سے اس کو کھڑا رہنے کا علم دیا گیا۔

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرے پر مختلف ٹکڑیوں میں بٹے بیٹھے تھے اور اپنی اپنی دنیا میں محو تھے کہ ایک شخص روتا پینٹا، ڈھانسی مارتا رکشہ سے اُترا اور سیدھا آ کر باباجی کے سامنے کھڑا ہوا۔ اس کی کھلی موٹی پگڑی گردن میں لٹک رہی تھی اور اس کی آنکھیں روتے رہنے سے سوخ کر باہر آ گئی تھیں۔ پہلے تو وہ لمحہ بھر ہاتھ باندھ کر اسی طرح کھڑا رہا پھر اس نے اپنی پگڑی اُتار کر باباجی کے قدموں میں رکھ دی اور آخر میں ایک زور کی سھ مار کر سجدے میں گر گیا۔ اس کو سجدے میں پڑا دیکھ کر کسی نے میری روح کے رخسار پر ایک زنانے دارغماخ مارا۔ میں گڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سجدے میں گرے ہوئے پہلو ان کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا لیکن مجھ سے اس کی بھاری دیہہ اٹھائی نہ جاسکی۔ وہ بچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اپنا ماتھا زمین پر مار رہا تھا۔ خدا کے علاوہ کسی اور وجود کو سجدہ کرنے سے انسان کے سارے اعمال تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ شرک میں مبتلا ہو کر کافر سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کوئی شرک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ پہلو ان کو دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور اندر ہی اندر میری باجھیں کھل گئیں کہ میں دینی اور اخلاقی اعتبار سے نہ صرف ایک اچھا مسلمان تھا بلکہ اس شخص سے بہتر انسان بھی تھا۔ وہ ایک کمزور، بودا، بے یقین اور بے دین شخص تھا جو اتنا

مختند اور مضبوط ہونے کے باوجود ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور جس نے ہم سب کے سامنے اپنے آپ کو اسلام کے دائرے سے خارج کر لیا تھا۔

باباجی نے آگے بڑھ کر اس شخص کو زمین سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگا کر پوچھا ”بخار ابھی اتر نہیں؟“ اس نے زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ”بچہ مر رہا ہے سائیں جی، کوئی کوئی سانس باقی رہ گیا ہے۔ میری واپسی تک وہ بھی نکل گیا ہوگا۔“ اس نے تیزی کے ساتھ اپنی پیشانی کو پیٹا اور تڑپ کر باباجی کے قدموں سے لپٹ کر ان کے پاؤں چومنے لگا۔

میرے لیے یہ بڑی عبرت کا مقام تھا۔ ایک انسان ایک انسان کے پاؤں چوم رہا ہے، اس کی خوشامد کر رہا ہے اور اس کے سامنے عاجزیاں کر رہا ہے۔ مجھے پہلوان کے بچے کی زندگی کی بجائے اس کی عاقبت کی فکر پڑ گئی جو اپنے اس تن و توش کے ساتھ میرے سامنے دوزخ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔

میرے سامنے بابا ابراہیم کی سفید ڈاڑھی والا کالا چہرہ گھوم گیا جسے میرے بزرگوں نے سات توہوں کی سیابی اُتار کر سرسوں کے تیل میں حل کر کے اس کے منہ پر کالک ملی گئی اور اس کے پیر تیل سے رنگے تھے۔ پھر اس کو گاموں کہہ کر گدی پر بٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگوا دیا تھا۔ ہم چھوٹے بچے ٹھن کھڑا کرتے اس گدی کے آگے آگے چل رہے تھے اور ہمارے بڑے، امام مسجد صاحب کے ساتھ گدی کے دونوں جانب لعنت اللہ! لعنت اللہ کہتے جا رہے تھے۔ بابے ابراہیم کو خود مولوی صاحب نے اس کے گھر کے کچے چبوترے پر ایسی حالت میں دیکھ لیا تھا جس سے اس پر حد لازم ہو گئی تھی۔ بابا ابراہیم کا گھر کچا تھا اور اس کے چھن خانہ کی دیوار بھی کچی تھی۔ عام آدمی تو گلی میں چلتے ہوئے اس کے گھر اندر نہیں جھانک سکتا تھا البتہ مولوی صاحب، شہاب پوینچا اور کرتار سنگھ کھاتی کی نگاہ نہ چاہتے ہوئے بھی بابا ابراہیم کے گھر میں چلی جاتی تھی۔

مولوی صاحب نے دیکھا کہ بابا ابراہیم اپنے ڈیڑھ سالہ پوتے جمال کو چھوٹے پیڑھے پر سامنے بٹھائے اس کے کنگن والے پاؤں چوم رہا ہے اور دونوں گھٹنے زمین پر اس طرح سے لگائے ہوئے ہیں جیسے وہ اس کو بوجھ کر رہا ہو۔ مولوی صاحب نے اس واقعہ کی خبر میرے والد اور ذیلدار صاحب کو کر دی۔ بابا ابراہیم کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے فخریہ اس بات کا اقرار کر لیا کیونکہ اس کے بیٹے کے گھر جمال پورے نو برس بعد پیدا ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں کی انجمن اسلامیہ نے بابے ابراہیم کا شردور کرنے کے لیے فیصلہ کیا اور ہمارے ہاتھوں میں کنسٹر اور ڈنڈے پکڑا دیئے۔

جب میں آٹھویں میں پڑھتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے لیے اسپنول کا چھلکا لے کر آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اصطبل والی گلی میں سوڑھیوں کی حویلی کے چھوٹے دروازے کے ساتھ تھوڑا لاری کا بیٹا سیتا اور کرم چند عرائض نویس کا پوتا بکرم یوں لگے کھڑے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں ان کو اس طرح چور سے بنے دیکھ کر رُک گیا اور بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ جب میری ڈھٹائی کے آگے ان کی کارروائی بڑی دیر تک رُک رہی تو بکرم نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دروازے کے اندر جھانکنے کے لیے کہا۔ نیلے رنگ کے دروازے کی چتا برابر گانٹھ لگی ہوئی تھی اور اندر بڑے کمرے کے پرانے قالین پر چڑے سے منڈھا بڑا سا موٹھا ہار کھٹا تھا۔ اس موٹھے پر ہمارے ضلع کی مشہور کنجری صندلاں بیٹھی تھیں۔ میں صندلاں کنجری کو اور اس کے نام کو اس دن سے جانتا تھا جس دن وہ قلیبے ڈو کی نیائیوں میں گولے والا کھنکھرا پنہن کر

تاچی تھی۔ اس روز ستر، سمٹھ اسٹنٹ کمشنر ہمارے گاؤں آئے تھے اور انہوں نے ہی لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اس تاج کا حکم دیا تھا۔ یہ تاج سارے ہندوستان میں منائی جانے والی ان خوشیوں کا ایک حصہ تھا جو ہمارے شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کی خوشی میں منائی جا رہی تھیں۔

میں نے نیلے دروازے کی گانٹھ لگی موری میں سے دیکھا کہ صندلاں کنجری سرخ رنگ کا گولے والا دوپٹہ اوڑھے اپنے بالوں میں چڑیاں نکالے بیٹھی ہے اور اس نے بیتل کے تین بڑے بڑے کلپ اپنی کپٹی سے اوپر لگا رکھے ہیں۔ وہ پان کا آدھا پتہ اپنی پھلی پر رکھے اس پر آہستہ آہستہ کھٹا لگا رہی ہے اور اس نے اپنی ٹانگ فرش پر آگے کو پھیلا رکھی ہے۔ علاقے کا خوشنوار تھانیدار مقدر شاہ دونوں گھٹنے ٹیک کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر صندلاں کی گرگاہی، ایزھی سے اور تو سے بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھی ہے۔ صندلاں پان لگاتے ہوئے مسکرا رہی ہے اور تھانیدار گرگاہی پکڑے ہوئے رو رہا ہے۔ اس کی ہانگی بندھی ہوئی ہے اور ان ہچکیوں کی درت میں اس کا سارا بدن کانپ رہا ہے۔

باباجی اس فریادی پہلوان کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے اور میں بڑی دیر تک اکیلا بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اس کے پیچھے وہ کون سا جذبہ ہے جو انسان کو اس طرح سے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ جبر پکڑ لیتا ہے۔ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پائے بوس کرنے لگتا ہے لیکن یہ عقدہ مجھ پر کھل نہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب سرخے چائے کا لبریز پیالہ لے کر خود میرے پاس آئے اور بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ان کی باتیں میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند پھاڑ کے میری سوچ کی محدود تڑپ پر لینڈ نہ کر سکیں اور میں ہاں جی، ہوں جی، اچھا جی ہی کرتا رہا۔

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ میں ڈیرے میں سڑک کی جانب چارپائی کھینچے دھوپ میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ وقت وافر تھا۔ اخبار کا چھاپہ بہتر تھا۔ میں بڑے غور اور دمجی کے ساتھ خبروں کو اس طرح سے کرید رہا تھا جیسے گند کے ڈھیر پر مرغی اپنے بچوں سے روڑی پھرولا کرتی ہے۔ اتنے میں باباجی ہاتھ میں خالی لوٹا پکڑے ادھر آ گئے۔ میرے قریب کھڑے ہو کر فرمایا ”بیٹا اخبار اس قدر غور سے نہ پڑھا کرو یہ اخبار نہیں ہوتا“ اکھوتے بھار ہوتا ہے۔ اس سے نظر بھی کمزور ہو جاتی ہے اور روح پر بھی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔“

میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا ”یہ جی بس ایسے ہی..... کوئی خاص نہیں باباجی..... کبھی کبھی..... کہیں سے مل جاتا ہے تو اس توجہ سے پڑھتا ہوں ورنہ مجھے تو وقت ہی نہیں ملتا..... لائے مجھے لوٹا دیجئے میں بھر لاتا ہوں۔“

فرمایا ”دھوپ اچھی ہے، چارپائی ٹھکانے سر بھیجی ہے۔ سرخ چائے تیار ہو رہی ہے اور آپ کو چھٹی ہے، ایسے اچھے حال کو لوٹے بھرنے میں ضائع نہ کریں۔ ہم آپ سے ہر حال میں راضی ہیں.....“

آپ آگے نکلے کی طرف چلے گئے اور میں اسی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے نکلے کی ہتھی گیزی۔ تھوڑا سا پانی لوٹے میں ڈالا۔ اس کو چھلکا اور پانی زمین پر اٹیل دیا۔ پھر انہوں نے ایک ہاتھ میں لوٹا پکڑے پکڑے گیزر اور سارا لوٹا بھر کر نکلے سے ذرا دور تنور والی جگہ کے پاس چلے گئے اور وہاں چھوٹی سی چبوتری پر بیٹھ کر وضو فرمانے لگے۔

باباجی وضو کرنے پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام سے وضو کرتے تھے۔ یہ وضو ایسا نہیں ہوتا تھا جیسے ہم محتاط اور دیندار لوگ کیا کرتے ہیں کہ انگلیوں کی خلال صبح ہو۔ ڈاڑھی کے اندر پانی چڑھایا جائے۔ کانوں کے پیچھے مسح کے ساتھ اس طرح سے لواتے جائل کہ ساری گردن پر پانی کا پوتا پھر جائے۔ پھر پاؤں کی ایڑی کہیں سے سوھی نہ رہ جائے۔ نچے کا جزیرہ اوپر ہونے کی وجہ سے گھٹا ہونے سے محروم نہ رہ جائے۔

آپ کا وضو کرنے کا انداز کچھ مختلف سا تھا۔ ابتداء انتہا اور اس کے درمیان کے ارکان بالکل ہمارے جیسے تھے۔ پانی استعمال کرنے اور اعضاء دھونے کی ڈرل وہی تھی لیکن وضو کے اندر انتہا کچھ ایسا تھا جیسے گہرے مراقبے میں چلے گئے ہوں اور وضو سے ہی انہوں نے حضوری کی ابتدا کر دی ہو۔ وہ وضو ایسا تھا جیسے غسال مُردے کو غسل دیا کرتے ہیں۔ جن کی ساری توجہ اور ساری مرکزیت سامنے کی میت ہوتی ہے۔ باباجی وضو کیا نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ سے باہر نکل کر سائیں فضل شاہ صاحب کو وضو کرایا کرتے تھے۔ ان کی میت کو غسل دیا کرتے تھے۔ انہیں صاف ستھرا کر کے، سجا بنا کر، بکٹ سجا کے انہیں اپنی بیٹی اور عاجزی کی سامگری سے خوشبودار کر کے انہیں اٹھا کر لے جاتے تھے۔ جیسے انہیں اپنی سفارش کے لیے بڑی سرکار کے روبرو لے جا رہے ہوں۔

آدی گندا ہو یا میندا، نانا ہو یا لہبا، موٹا ہو یا پتلا، وہی ہو یا عیبی، اس کو پر اتھنا کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے سیس کٹانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بغیر حاضری ممکن ہی نہیں۔ اور ایک مرتبہ جب حاضری ہو جائے تو کہتے ہیں کہ حضوری کا لمحہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ رسم آج کی نہیں صدیوں پرانی ہے۔ اپنے وجود کو بنا سنوار کر، ہار سنگھار کر، عطر پھیل لگا کر اور اپنے ہی ہاتھ سے پانی کے چھاپے لگا کر گلے میں ری ڈال کر محراب تلے لے جانا ہوتا ہے۔ جب وجود سر جھکا تا ہے تو ری والا پکار کر کہتا ہے ”ہے داتا! بلیدان کی بھیک ہے۔ سیس کٹانے کی آگیا ہو۔ پر اتھنا پوری ہو جائے۔ ارداس ہے! ارداس ہے! ارداس ہے!!! لیکن وجود کو کوع میں رہتا ہے اور وجود کے مالک کی کوک پکار پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ اس طرح اپنے مینڈھے کی ری پکڑے پکڑے بلبلاتا رہتا ہے اور سندھیا کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ، اپنے اپنے وجود کی رسیاں پکڑے جوق در جوق عبادت کدوں سے نکلتے ہیں اور اپنے اپنے جانوروں کو نکال احتیاط سے ہٹاتے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا تو نہیں پر سنا ہے کہ کبھی کبھی کسی خوش قسمت کے مینڈھے کو کوع کے اندر سیس دینے کا اذن مل جاتا ہے اور اس کا مالک وہیں، اس وقت، اسی قربان گاہ پر اپنے وجود کو خود غسل دے کر آگے پیش کر دیتا ہے اور اس کی گلے کی ری نکال کر گول گول لیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے اور گھر کی طرف چلا جاتا ہے۔ مو تو قبل اتنوتو..... مو تو قبل اتنوتو..... لوگ پوچھتے ہیں ”آج بٹ صاحب کو مغرب کے وقت نہیں دیکھا۔“ مولوی صاحب کہتے ہیں ”عشاء کے وقت تشریف لائیں گے تو پوچھیں گے۔ شاید کسی مینڈر کے سلسلے میں باہر چلے گئے ہوں۔“ لیکن عشاء کے وقت جب بٹ صاحب آتے ہیں تو بٹ صاحب وہ نہیں ہوتے ہمارے والے۔ وہ دوسرے والے ہو چکے ہوتے ہیں حالانکہ ان کی رہائش وہی ہوتی ہے بلکہ نمبر 36، ایم بلاک ڈیفنس ایکسٹینشن..... فیروز.....!

وضو کرنے کے بعد باباجی سیدھے لنگر چھپر تلے پہنچ گئے اور دھلے ہوئے پیالوں کے اندر سے پانی جھاڑ جھاڑ

کران کے مینار بناتے گئے۔ اس روز شلم کوشت کا پتلا پک رہا تھا اور اس کے ساتھ گڑ کے چاول تیار ہو رہے تھے۔ میاں سراج نے آکر تندور تپانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی بے نگی آواز میں سلطان باہو کے ابیات گا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوھی ہوئی خاردار جھاڑیوں کو کھوئے سے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی موٹی شاخ کلباڑی کے پھل تلے سے پھدک کر اس کے ہاتھ پر لگتی تو وہ خاردار جھاڑی کو ایک گندی سی گالی دے کر کاٹنا چھیننے والی جگہ کو اپنے موٹے اور بدھے ہونٹوں سے چوستا اور پھر زمین پر ٹھوک دیتا۔ دراصل میاں سراج جھبن کی وجہ سے اپنا ماس نہیں چوستا تھا بلکہ اپنے وجود کو بوسہ دینے کے مواقع تلاش کرتا تھا۔ وہ بڑا مضبوط، تنومند، گٹھا ہوا کسرتی نوجوان تھا لیکن اس کو اپنی دیہہ بڑی پیاری تھی۔

میں نے اخبار اچھی طرح سے تھہر کر کے اس کا ایک طمانچہ سا بنا لیا تھا۔ بالکل ویسا طمانچہ جیسا نقلیں کرنے والے بھانڈے لطفے کی بیخ لائن پر اپنے ساتھی کو مارا کرتے ہیں۔ میرے کھڑے زانو پر اور چار پائی کے پھٹے ہوئے پائے پر جو کبھی جی آکر بیٹھتی تھی میں اس کا تسلی سے نشانہ لے کر اور پوری آنکھیں کھول کر کھیلنے لگتا تھا۔ اخباری طمانچہ مارنا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی کبھی بیخ کر جاتی تھی۔ اگر کوئی بیخ بھی جاتی تھی تو تھوڑی دیر بعد واپس زانو پر پائے پر پہنچ جاتی تھی۔

میں ایک کبھی کا نشانہ لے ہی رہا تھا کہ میرے سامنے ایک قد آدم سایہ آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو باباجی کھڑے تھے۔ آپ نے بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”یہ کیا ہیں آپ کے ذوق کشتن کے لیے بنائی گئی ہیں جو آپ انہیں اس بے دردی سے ہلاک کر رہے ہیں۔“

میں چوروں کی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا اور کچھ گہرا سا گیا تھا۔ ان کی اس ترکیب ”ذوق کشتی“ نے مجھے بالکل نہتا کر دیا تھا اور میرے پاس اپنے دفاع کے لیے صرف یہی فقرہ رہ گیا تھا کہ حضور! یہ جراثیم پھیلانے والی مخلوق ہے اور اس سے اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ آپ نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور فرمایا ”کبھی انسان کی محسن ہے۔ بیٹا کرم فرما ہے اور چونکہ محسن کو مارنے کا کوئی دین دھرم بھی اجازت نہیں دیتا اس لیے کبھی کو مارنا بھی اپنے مہربان کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔“

میں نے آپ کے منہ سے کئی نئی اور مختلف باتیں سنی تھیں۔ کئی ایسے ارشادات سنے تھے جو ہمارے آزمودہ اور طے شدہ اصولوں کے منافی تھے۔ کئی ایسے اعلان سنے تھے جن سے ہماری زندگی کے چلن کا بطلان ہوتا تھا۔ کئی ایسے نظریے برداشت کئے تھے جن کا بلند پایہ کتابوں اور ولایتی انسائیکلو پیڈیوں میں دوسری طرح کے اندراج تھا۔ ان کی کئی ایسی باتیں برداشت کر لی تھیں جن کے تسلیم کرنے کی اہمیت الکتب میں سخت متناہی تھی لیکن یہ کبھی کے محسن ہونے کا نہ تو فلسفہ میری سمجھ میں آیا اور نہ ہی میرا دل اس بات کو مانا کہ اسے مارا نہ جائے ختم نہ کیا جائے۔

باباجی نے فرمایا ”کبھی تمہاری چوکیدار ہے جو ہر وقت خبردار، پھرے دار بولتی رہتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جھنڈی ہے اور یہ ہمیں صرف اتنا بتانے کے لیے آتی ہے کہ یہاں گند ہے، غلاظت ہے، ناپاکی ہے، کوڑا ہے، اس جگہ کو فوراً صاف کر لو اور سارے کام چھوڑ کر یہاں کی صفائی کی طرف توجہ دو لیکن تم انسان ہو، غافل مخلوق ہو، ابھی معلوم ہوا ہے ابھی بھول جاؤ گے۔ اس لیے میں اس وقت تک

یہاں سے نہیں ہوں گی جب تک تم اس جگہ کو صاف اور پاک نہیں کر لو گے۔ میں بڑی دُور سے آئی ہوں اور تم کو صرف اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔“

میں صبح جب ڈیرا پاک پر آیا تھا تو لنگر چھپر کے نیچے کونے میں ایک خستہ پونڈے کا بڑا سا کھڑا کھڑا تھا۔ میں نے بھائی علی احمد صاحب سے پوچھا کہ یہ گنا کس کا ہے تو انہوں نے اپنی مخصوص بنچیدگی کے ساتھ جواب دیا ”آپ کے انتظار میں رات سے یہاں کھڑا ہے۔ آپ ہی کا ہے۔ آپ پر ثار ہونے کے لیے بے قرار ہے۔“ میں نے گئے کا وہ کھڑا اٹھالیا اور دھوپ میں آکر اس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پونڈے کے چھلکے کو ہونٹوں میں پکڑ کر بھی کھینچو تو نوکری بھر چھلکا بڑے مزے سے اتر آتا ہے۔ میں مزے لے لے کر گنا چوستا رہا اور اس کے چھلکے اور پھوک چارپائی کے سامنے پھینکا رہا۔

میں نے نیچے جھک کر چھلکے، پھوک اور گئے کا کوڑا اٹھانا چاہا تو آپ نے ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دیا۔ بابا جلال کو آواز دی۔ وہ بجلی کی طرح لپکا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کوڑا اپنی جھولی میں ڈالنے لگا۔ فرمایا ”جونہی یہ جگہ صاف ہو جائے گی اور لمبیوں کے طے کردہ معیار کے مطابق صاف ہو جائے گی تو وہ اس جگہ سے چلی جائیں گی۔ پھر وہ اسی صورت میں لوٹ کر یہاں آئیں گی اگر یہاں ایک دانے کے برابر بھی گندگی ہوئی۔“ پھر مسکرا کر فرمایا ”جسٹڈی والے کو، ریلوے پھانک والے کو، چوکیدار کو، پنسال نویس کو، ٹریفک کے سنتری کو مارنا نہیں چاہیے۔ اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے وہ آپ کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔“

جب بابا جلال سارا کوڑا اٹھا کر اور اچھی طرح سے جھاڑو دے کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ کھیاں ایک ایک کر کے وہاں سے وداع ہو رہی ہیں اور ان کے جانے میں کبھی نہ لوٹ کر آنے کی اڑان ہے۔ باباجی کی یہ بات میں نے عقلی طور پر تو مان لی لیکن جذباتی طور پر میں اسے تسلیم نہ کر سکا۔ حال ہی میں میرے چچا زاد نے فیصل آباد میں جراثیم کش دواؤں کی ایجنسی لی تھی اور اس کو بلدیہ کی طرف سے ڈی ڈی سپلائی کرنے کا بہت بڑا آرڈر موصول ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کبھی مار دواؤں کی ایک بہت بڑی انڈسٹری کل عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ لاکھوں ہزاروں خاندانوں کی زندگی اور ان کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیا اس انڈسٹری کو ختم کر دیا جائے۔ پھر غریب ممالک کو اربوں ڈالر کی امداد جراثیم کش ادویات کے لیے دی جاتی ہے۔ اس سے کئی سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے چلتے ہیں بلکہ چھوٹے ملکوں کی تو حکومتیں بھی اس ایڈ کے سہارے چلتی ہیں تو کیا صرف ایک مہی کی خاطر اتنی بڑی ایڈ کو بند کر دیا جائے۔ ان لوگوں کو صرف اپنے مقامی اور ناکارہ وسائل کے اندر محدود کر دیا جائے جو پستی سے ترقی کی طرف اور ترقی سے ترقی پذیری کی طرف جارہے ہیں لیکن باباجی چونکہ رموز مملکت سے آشنا نہیں ہیں اور اقتصادی دباؤ کے عالمی اصولوں کو جانتے نہیں ہیں اس لیے آپ پٹنٹی سائیڈ کے ایکٹ کو سمجھ نہیں سکتے۔

اس دن کے بعد سے میں نے آج تک کبھی کوئی کبھی نہیں ماری۔ جھاڑو دینا سیکھ لیا ہے۔ ٹاکی بھی مار لیتا ہوں اور لمبی ٹیوب لگا کر فرش بھی دھو لیتا ہوں۔

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ ڈیرا پاک کے سامنے سے ایک شخص کچھ بکرے ہنگامتا ہوا گزرا۔ باباجی اس وقت بادام

روغن نکلوا رہے تھے۔ بکروں کو جاتے دیکھ کر آپ نے کسی لڑکے کو بکروال کے پیچھے بھگایا اور اسے ڈیرے پر منگوا لیا۔ بکرے نہایت ہی خوبصورت اور اچھے پلے ہوئے تھے۔ سہا کے ہوئے بدنوں پر دھوپ کی روشنی میں وہ بوکی کے تھان دکھائی دیتے تھے۔ چار دو ندے تھے اور تین کھیرے لیکن اپنے قد بت کے اعتبار سے بھی چوگے چمکے نظر آتے تھے۔ باباجی نے دو بکرے پسند کر کے ان کی قیمت دریافت کی تو ان کے اندازے سے زیادہ نکلی۔ انہوں نے جو قیمت پیش کی وہ بکروال کو منظور نہ تھی۔ بڑی دیر تک سودا اور بیچے ہوتا رہا لیکن جدواہا مانا نہیں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کچھ لوگ جو وہاں موجود تھے انہوں نے بتایا کہ یہ لنگر کے لیے چاہئیں ذاتی استعمال کے لیے نہیں لیکن باباجی نے انہیں سختی سے منج کر دیا کہ لنگر کا بوجھ ڈال کر اس کو مجبور نہ کیا جائے کیونکہ اس دباؤ میں آکر اگر بکروال مان گیا تو یہ تاق ہو گا لیکن وہ بکروال صاحب بھی ایسے ضدی تھے کہ انہوں نے کسی بات کی بھی پروا نہ کی اور اسی قیمت پر انکے رہے جو انہوں نے پہلے بتائی تھی۔ باباجی نے اپنی بھلی بھلی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ”اچھا ابھی آپ کی مرضی ہے۔ مال آپ کا ہے۔ سودا آپ کا ہے۔ حکم آپ ہی کا چلے گا۔ ہم مجبور ہیں آپ کے حکم کے مطابق نہیں دے سکتے۔“

جب بکروال بکرے لے کر چلے لگا تو آپ نے فرمایا ”بھائی آپ کا ہمارا سودا نہ بن سکا۔ یہ منظور نہ تھا لیکن یہ بکرے تو ڈیرے کے مہمان ہیں انہیں ہم نے خود آواز دے کر بلایا ہے۔ انہیں تو ہم بغیر کھائے پئے نہیں جانے دیں گے۔“

بکروال نے کہا ”مجھے دیر ہوتی ہے باباجی۔ میں زیادہ رُک نہیں سکتا۔“

فرمایا ”بس پانچ منٹ کی بات ہے اس کے بعد چلے جانا۔“ اتنے میں بکروال کے لیے ایک بڑی سی ٹرے میں گلابی چائے کا پیالا، رس سسٹ، مٹیوںیاں اور امرتیاں لگ کر آ گئیں۔ وہ موٹے سے پر ٹرے گود میں رکھ کر بیٹھ گیا اور اونچی آواز میں بولا ”لوؤ بھئی بکرے او! آپ کی وجہ سے ہم کو کیا کیا نعیتیں مل گئیں۔ اب آگے تمہاری قسمت۔“

حضور نے فرمایا ”ان کی قسمت بھی اچھی ہے بابا۔ ڈیرے پر جو آگئے ہیں۔ جو اس ڈیرے پر آتا ہے اچھی قسمت والا ہی ہوتا ہے۔“

اتنے میں بابا جلال سر پر برسم کا گٹھا اٹھائے اور اپنی جھولی میں دو اڑھائی سیر چنے ڈالے آ گیا۔ اس کے پیچھے اعظم تھا جس نے بھاگ کر قریبی بیرہری سے کلباڑی کے ساتھ سبز سبز ناشیں کاٹی ہوئی تھیں۔ بکرے اور ان کا مالک بڑی دیر تک بیٹھے اپنی اپنی خوراک کھاتے رہے اور جب وہ چلنے لگے تو باباجی ان کو دروازے سے باہر سڑک کے دوسرے کنارے تک چھوڑنے گئے۔

☆☆☆

ایک روز یوں ہوا کہ میں اپنے گلبرگ والے پرانے دفتر میں بیٹھا فشری کے ان خطوں کا جواب لکھ رہا تھا جو میرے خیال میں فشری کو نہیں بھجوانے چاہیے تھے۔ ان خطوط کی زبان اور ان کے مضمون کا لب و لہجہ کچھ ایسا تھا جس کا میں عادی نہ تھا۔ عادی کیا مجھے ایسی عبارت سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ میں نے ایسے تحریری جھڑکے اپنی زندگی میں کبھی سنے ہی نہ تھے۔ سامنے کے جھڑکے بیسیوں مرتبہ سنے تھے اور انہیں خوش اسلوبی سے برداشت بھی کیا تھا لیکن تحریر کے اندر ایسی ہنک آمیز گفتگو سننا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہنک آمیز تحریر پڑھتے

ہوئے چونکہ ہنک کرنے والا سامنے موجود نہیں ہوتا اس لیے وہ فقرے پڑھتے ہوئے اپنی ہنک خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ یعنی ظالم کا روپ بھی خود ہی اختیار کرنے کی مجبوری ہوتی ہے۔ جب انسان ایک ہی وقت میں خود ہی ظالم، خود ہی مظلوم اور خود ہی مجبور بنا کھڑا ہو تو اس کی حمایت کو کوئی نہیں آتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پراچین دور کی دھوپ جلی چٹان ہو جس کے اندر تین گہری دراڑیں پڑ کر نیچے تک اتر گئی ہوں۔ وہ چٹان ویسی کی ویسی کھڑی ہو اور دھپنے والے بھی اس کو ایک چٹان ہی سمجھتے ہوں۔ ایک ہنک آمیز خط پڑھتے وقت ہر ذلت آمیز فقرے کے ساتھ اپنی بے عزتی خود کرتے جانا مر جانے کا مقام ہے۔ اس خود سے انسان میں گہرے شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ساری شخصیت جزائی ہو جاتی ہے اور دشمنوں کے اندر سے سفید سفید مادہ ہر وقت رستا رہتا ہے۔ کسی اور کو یہ مادہ نظر نہ آئے، بوند آئے، مٹن نہ آئے دوسری بات ہے لیکن اپنے آپ کو یہ کوڑھ ہر وقت دکھائی دیتا رہتا ہے اور ستم کی بات ہے کہ اس کوڑھ پر ترس کھا کر کوئی خیرات بھی نہیں دیتا۔

میں تین چار مرتبہ خط پڑھ کر اپنی بے عزتی کر چکا تھا اور ابھی اپنے آپ کو اور کھڑکانے کا ارادہ تھا کہ رشید چودھری میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ رشید چودھری کے بات کرنے کا اور بات نہ کرنے کا ایک اپنا ہی انداز ہے۔ جب وہ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے خاموش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب وہ چپ بیٹھے ہوتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہیں لیکن آپ ان کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں ان کی معیت میں بہت چوک رہتا ہوں اور ان کی بات پکڑنے کے لیے ہر لمحہ پہاں بھار ہو کر گزارتا ہوں۔ وہ دوپہر میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ دوپہر تھی جب اپنی فشری کے سیکرٹری کے نام میرے محبت تھے اس کا جواب مجھے سیکرٹری کے پی۔ اے کی طرف سے مل رہا تھا۔ اس خط کی میں دوسری باتیں تو آپ کو بتانا نہیں سکتا البتہ اس کا واحد شفیق، خلیق اور شائستہ جملہ سنائے بغیر نہیں رہوں گا کہ

I am obliged to state categorically that the Secretary has no desire to develop a friendship with you. In view of this, I am sure you will agree that it is inconsistent with gentlemanly standards of conduct to inflict one's company where it is not wanted.

چودھری رشید صاحب کے پاس گیان کا اگر پورا ایک باب نہیں تو اس کے کچھ ورق ضرور موجود ہیں۔ وہ جس دفتر کی کام کے لیے میرے پاس آئے تھے مجھے اس کا علم تھا کیونکہ وقت اور مقام ہمارے درمیان فون پر طے ہو چکا تھا۔ پھر ان کے ہاتھ میں وہ کاغذات بھی تھے جن کے بارے میں ہم کو گفتگو کرنا تھی۔ پھر میرے محترم جماعت کا انٹرکوم پر مجھے بتا دینا کہ ہم کو تیسری شق منظور نہیں ہے اس بات کی تین دلیل تھی کہ وہ پہلے سے طے شدہ کام کے لیے میرے پاس تشریف لا رہے ہیں۔

لیکن انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنی فائل میز پر رکھ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیں بنا کر انہیں ایک دوسرے سے پیوست کیا۔ پھر شاید کچھ بولے یا شاید نہیں بولے۔ میری سمجھ میں اس لیے نہیں آیا کہ گو میں اس خط کی وجہ سے ذہنی طور پر پہاں بھار کھڑا تھا لیکن میں چودھری صاحب کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

پھر چودھری صاحب نے گلا صاف کر کے بہت اونچی آواز میں کہا ”آپ نے میری بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک شانتی نیکتن ہے جہاں نور والے لوگ رہتے ہیں اور شبنم جیسی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی رنجی ہو، آزرده ہو، تنگن ہو یا لاچار ہو۔ وہاں اس کا علاج ہو جاتا ہے۔ وہ ذہنی مریض کا بھی علاج کرتے ہیں اور بدنی طور پر بھڑھو جانے والے کی دوا دارو بھی کرتے ہیں۔ آپ انہیں اور ابھی میرے ساتھ چلیں۔“

میں تک تک چودھری صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مجھے سب سے بڑا انفس اس بات کا تھا کہ چودھری صاحب نے میری زخم خوردگی کو بھانپ لیا تھا اور اب وہ علاج کی غرض سے مجھے وہاں لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے ان کی اس ٹیلی پیٹھی میں اپنی ذلت محسوس ہوئی اور میں نے ان کے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا میں کسی ایسے شانتی نیکتن میں جانا نہیں چاہتا جو مجھے میری خودی سے علیحدہ کر دے اور مجھے اپنی راہوں کو خود اجالنے سے محروم کر دے۔

چودھری صاحب نے کہا ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ خودی شکن ہیں۔ وہ تو سیدھے سادے اللہ کے پیارے ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ اللہ کے پیارے کون ہیں۔“

چودھری صاحب نے کہا ”یہ اپنے آپ کو ”نور والے“ کہتے ہیں اور نور والے کہلاتے ہیں۔ حضور کا ام گرامی حضرت فضل شاہ صاحب ہے اور یہ جالندھر شریف سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔“

جالندھر کے ساتھ مجھے شریف کا لفظ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور وہ بھی چودھری رشید صاحب کے منہ سے۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا ”پھر کسی دن تمہیں گے رشید صاحب۔ کسی اچھے سے، کھلے سے دن۔ جس دن طبیعت امنگ پر ہو اور آرزو جوان ہو اور خواہش کے گھوڑے کا رخ کسی شانتی نیکتن کے سینٹیل ساگر کی طرف ہو۔“

رشید صاحب نے کہا ”آج سے اچھا اور کون سا دن ہو سکتا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ سردی شباب پر ہے۔ دھوپ کھلی ہوئی ہے اور ڈیرے پر جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ آج ہی چلتے ہیں۔“

مجھے جمعہ سے اور ڈیرے سے دونوں سے اعتنا تھا اور رشید صاحب یہ دونوں الفاظ ایک ہی فقرے میں بول گئے تھے۔ میں نے پوچھا ”یہ ڈیرا کیا بلا ہے؟ قلندروں اور چمندرلوں کا سکون؟“

رشید صاحب نے کہا ”وہاں بھی کچھ ہے، قلندر بھی چمندر بھی۔ سیکرٹری صاحب بھی، ڈاکٹر صاحب بھی، میاں صاحب بھی، دیوان صاحب بھی۔ ڈیرا ایک پوری زندگی ہے، ایک کل ہے۔ وہاں سبھی کچھ ہے۔ آپ انہیں تو سہی۔“

میں نے کہا ”دیکھئے چودھری صاحب! باوجود اس کے کہ میں اس وقت غم خوردہ ہوں اور باوجود اس کے کہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے اور باوصف اس کے کہ آپ جیسا مخلص دوست مجھے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں جا نہیں سکتا۔“

”لیکن کیوں؟“ چودھری صاحب نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہم ان چیزوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا ”ہمارا گم ان فضاں میں ہے۔“

اور ہم پشتوں سے پڑھے کھلے لوگ ہیں۔ معاصر الامرا کی دوسری جلد میں ہمارے بزرگوں کے نام بولتے ہیں اور ہم جبکہ اس رنگ میں چلے ہوئے آج یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہم خانقاہوں میں جا کر پیروں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ یہ ہماری خودداری کے منافی ہے۔ ہمارے وجود کی توہین ہے۔ ہم میں صاحب السیف بھی تھے اور صاحب القلم بھی۔ سردار بھی تھے اور سالہ سردار بھی۔ ہم حکمران بھی رہے اور حکمرانوں کے صلاح کار بھی لیکن ہم کبھی کسی آستانے پر سر جھکا نے نہیں گئے۔ تبادلہ خیال کرنے ضرور گئے ہیں۔ کم از کم پچھلی دس پندرہ پشتوں سے ہم نے ایسا نہیں کیا۔“

چودھری رشید حیرت زدہ میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا ”میں تصوف کو اور صوفی ازم کو اسلام کے منافی سمجھتا ہوں۔ شرع نے جو ہم کو بتلایا ہے، سمجھا دیا ہے اس کے علاوہ باقی ہر شے بدعت ہے اور ہمارا گھرانہ بدعت کے سخت خلاف ہے، اور ہم صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کے پابند ہیں۔ اسی میں ہماری فلاح، اسی میں ہماری ترقی اور اسی میں ہمارا مستقبل پوشیدہ ہے۔ یہ تصوف اور گیان، چودھری صاحب! ان لوگوں کی اختراع ہے جو زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو گریز کا راستہ اختیار کرنے کو خدا کی عطا کردہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی راہیں خود استوار نہیں کر سکتے۔ سن لیجئے چودھری صاحب! مجھے اپنا مستقبل خود بنانا ہے اور اپنی راتوں کو خود منور کرنا ہے۔ میں اقبال کا شاہین ہوں۔ رانی کھیت کی جال بلب مرغی نہیں ہوں۔ میں! میں! میں! گھوں گھوں گھوں.....“

چودھری رشید نے بڑے سادہ دارن طریق پر کہا ”چلتے آج جمعہ تو وہیں پڑھ لیتے ہیں۔ کھانا کھا کر آ جائیں گے۔“

میرا چودھری صاحب کے ساتھ ایک کام پھنسا ہوا تھا اس لیے میں مجبور ہو گیا۔ کمرے سے اٹھ کر اپنی فوکسی نکالی اور چودھری صاحب کو رہنما کے طور پر ساتھ بٹھا کر آگے نکل گئے۔

نہر کنارے چلتے چلتے جب دھرم پورے کا ٹپ آیا تو چودھری صاحب نے دائیں مڑنے کو کہا۔ دائیں مڑ کر میں نے سامنے نظر ڈالی تو ایک چھوٹا سا گروہ ڈھول بجاتا دھال ڈالتا سبز چادر ہاتھوں میں تانے میاں میر صاحب کی درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے جا رہا تھا۔ میں نے معنی تیز نظروں سے چودھری صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا زیادہ دور نہیں بس سامنے ہی ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سامنا بھی آ گیا۔

میاں میر صاحب کے آستانے کو اندر کی طرف جانے والی سڑک کے سامنے ایک بڑا سا کالا بورڈ لگا تھا جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا ”نور والوں کا ڈیرا۔“

یہ دو ڈھائی کنال کا مربع نما قطعہ زمین تھا جس کے ارد گرد پختہ اینٹوں کی چار دیواری تھی۔ سامنے سڑک کی جانب دیوار مشکل سے دو ڈھائی فٹ اونچی ہو گی لیکن پہلوؤں کی جانب چار دیواری قد آدم اونچی تھی۔ اس چار دیواری کے اندر چھپر اور پھوس کی جھونپڑیاں تھیں جو بیشتر چار دیواری کی بیک پر بنی ہوئی تھیں۔ یہیں بائیں ہاتھ پر ڈوہنگا کوٹھا تھا جو سطح زمین سے دو ڈھائی فٹ نیچے تھا اور جس کے اندر چھت پر کڑیوں میں کندے ڈال کر ہاتھ سے کھینچنے کا پنکھا لگایا گیا تھا۔ اس ڈوہنگے کوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈھارا تھا جس میں چار پانچ بکریاں بندھی تھیں۔ اس ڈھارے کے ساتھ ایک کھلا چھپر تھا جس میں دو بڑے بڑے چولہے تھے اور کھانے

پکانے کے برتن رکھے تھے۔ یہ ڈبرے لنگر تھا جہاں دن رات آگ جلتی تھی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ پکنا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سیکرٹری صاحب کی جھکی تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا موٹے اور مضبوط چمچر کا کوشا تھا لیکن یہ تفصیل تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی جب میں نے باقاعدگی سے وہاں جانا شروع کیا۔ اس روز تو ہم ایک کھلے اور لمبے چوترے پر جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں دو تین چار پائیاں آڑی ترچھی پڑی تھیں اور ایک پٹھی پرانی دری اور موٹا سا پرانا قالین قبلے کی ٹیڑھ میں بچھے ہوئے تھے۔ کچھ آدی چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ قالین پر۔ ایک دو نفل پڑھنے میں مشغول تھے۔

چودھری صاحب نے ایک ایک آدمی کے ساتھ باری باری دونوں ہاتھوں والا مصافحہ کیا اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ ساتھ میرا نام بھی بتاتے گئے اور میں بھی ان سے مصافحہ کرتا گیا۔ گرے سوٹ کے اندر میری سرخ ڈبیل اور پیتل کے چمکدار بنٹوں والی واسکٹ کو سبھی حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا ”ڈاکٹر صاحب آگئے، ڈاکٹر صاحب آگئے۔“ اور سب اپنی اپنی جگہوں پر چوکس ہو گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اکیرے بدن کا ایک نوجوان، سیاہ ڈاڑھی تیل سے چمکائے، سنہرے فریم کا چشمہ اور اونچی دیواروں کی جناح کیپ نمٹا ٹوپی سر پر لگائے خراماں خراماں ہماری جانب آ رہا تھا۔ اس کے کپڑوں میں صرف کلف لگی سفید شلوار نمایاں تھی۔ باقی سب کچھ ایک چترائی کوٹ نے اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا جس کا رنگ گہرا براؤن تھا اور جو کہیں کہیں پتیلی جھلک بھی دے رہا تھا۔ چودھری صاحب ڈاکٹر صاحب کی طرف لپکے اور بڑی سپردگی کے ساتھ ان سے ملے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور پیچھے پلٹ کر قدرے اونچی آواز میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے لمحہ بھر ٹھنک کر میری طرف دیکھا۔ ذرا اڑکے، ہیزل بلاؤ کے ایک سینکڑے ہزارویں حصے میں مجھے جانچا اور پھر بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیے۔

یہ میری اور ڈاکٹر صاحب کی پہلی ملاقات تھی اور ہم نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ ہم نے دو مختلف چار پائیوں پر آسنے سانسے بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیں اور تھوڑی ہی مدت میں کئی موضوعات پھلانگ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بات کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ ان کا انداز بیاں مربوط اور ادائیگی تسلسل انگیز تھی۔ ہر بات دھیمی دھیمی دلیل میں لپٹی ہوتی جس سے سننے والا نہ تو چوکنہ ہوتا اور نہ ہی اپنے آپ کو مضروب دلیل خیال کرتا۔ انہیں سامع کی توجہ جذب کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا جیسے کمرے کے پیچھے لمبے برآمدے میں کوئی جھانجھ بجا کر چل رہا ہو اور کمرے کے جالی والے روشندان سے تھنک تھنک کی قدم قدم آواز دم بدم آ رہی ہو۔ ان کا چہرہ تابنے کے شیچو کی طرح مضبوط اور ان کی آنکھیں بہت گہرے اتر جانے کی غماز تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن وہ ان کی اپنی نہ تھی۔ حکم کے ماتحت گنتی تھی کہ ”کسی کو اپنے قدم سے مرعوب نہیں کرنا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب سے میرے بارے میں، میرے دفتر کے بارے میں اور اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھتے رہے اور میری وضاحت کے دوران ان ساری چیزوں کو اپنے ایک ایک فقرے کی کلور سے کم اہم بناتے گئے جو میرے نزدیک بہت ہی اہم تھیں۔ میں اس چیز کا عادی نہیں تھا اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان جھکوں کو پہلی ہی ملاقات میں پسند کر لیا جنہیں لوگ عام طور پر پسند نہیں کیا کرتے۔ میں نے سوچا ان کے ساتھ خوب رہے گی اور چونچا چونچی میں لطف آیا کرے گا۔

میں اور ڈاکٹر صاحب مصروف گفتگو تھے کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی جلدی اٹھے اور فرمانے لگے ”حضور آگئے۔“ میں نے مڑ کر دیکھا وہاں ”حضور“ قسم کے کوئی بھی صاحب نہ تھے۔ ایک خوبصورت اور مسکراتا ہوا بابا کھڑا تھا جس نے سر پر چوکوشہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گھٹنوں تک گرم فلائین کا لمبا سا کرتہ تھا۔ نیچے لال پٹی والا ٹکڑا تہبند، بہت سی جیبوں والی ایک واسکٹ اور گلے میں ایک نیم گرم صاف گہرے سرخ رنگ کا۔ موٹے موٹے پاؤں میں پرانی وضع کے چرمی سلپر تھے۔ میں نے ان حضور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس بابے سے زیادہ خوبصورت مرد میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک نہ دیکھا تھا۔ میں گل حمید، صدر ایوب خان اور وانگنیو کے حسن سے بڑا متاثر تھا لیکن یہ صورت تو کچھ اور ہی تھی۔ ایسا حسن مجھے کسی وجود پر کسی تصویر میں، کسی خواب میں بھی نظر نہ آیا تھا۔ میری سیٹی گم ہو گئی۔ چودھری صاحب نے سر جھکا کر کہا ”حضور یہ ہمارے اشفاق صاحب ہیں۔ اشفاق احمد صاحب۔“

حضور نے ایک مکھم سانفرہ لگایا ”نوروالے“ اور پھر تالی بجا کر یولے ”رحمتاں والے برکتاں والے۔ خدائی مہمان لوؤ جی یہ اشفاق صاحب بھی ہمارے جانی جان ہیں۔ نوروالے۔“

میرے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ ویسے ہی رہ گئے اور آپ نے میرا کندھا تھپتھا کر کہا ”آتے جاتے رہا کریں۔ بزرگان دین سے میل جول رکھیں۔ رحمتوں والے، برکتوں والے۔“

اتنے میں کسی نے پوچھا ”حضور جمعہ کی اذان کہیں؟“

فرمایا ”اشفاق صاحب کو کھانا کھلا دیا ہے؟“

میں نے عرض کیا ”حضور کوئی جلدی نہیں جمعہ کے بعد کھالیں گے۔“

فرمایا ”جمعہ کے ادب میں کہہ رہے ہو یا ابھی بھوک نہیں۔“

میں نے کہا ”جناب کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس بعد میں ہی سہی۔“

باباجی نے اشارہ دیا۔ رضا صاحب نے اذان دینی شروع کی اور ہم جہاں کھڑے تھے ویسے ہی کھڑے رہے۔ جمعہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھایا اور جمعہ پڑھنے کے بعد ہم سب لنگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لنگر کے پاس پہنچ کر باباجی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا ”پترا! آپ اندر چلیں، بڑے کونٹھے میں مہمانوں کو بھیج دیں لے چلیں۔ سیکرٹری صاحب، اعظم صاحب، حاجی صاحب۔ سب لوگ وہیں چلیں وہیں بیٹھیں۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے باباجی کے ڈوبنے کوٹھے کے اندر قدم رکھا۔ باہر سے مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ کمرہ گہرا ہے اور اس کا فرش باہر کی سطح سے ڈھائی تین فٹ گہرا ہے اور اس کے اندر اترنے کے لیے ولینز کے ساتھ فٹ بھر کا زینہ بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ خود کمرے میں اترے۔ ان کے بعد چودھری صاحب اور پھر آہستہ آہستہ سبھی لوگ اندر آ گئے۔

اندر اچھا خاصا اندھیرا تھا اور دروازے سے کبھی ہوئی تار کے ساتھ بجلی کا ایک مدیم سا لاٹو روشن تھا جو مشکل سے چالیس کینڈل پاور کا ہوگا۔ کوٹھے کے اندر دروازے کے ساتھ ساتھ دو رنگ کنسترو، ڈبے، ڈولن، بوریاں، تھیلے اور ڈرم پڑے تھے جن کے اندر اجناس، گڑ، تیل، اچار، مربے، مٹھائیاں، مکھانے، چھوہارے اور کھانے پکانے کے مصالحے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے ان تھیلوں، بوروں کے ساتھ ساتھ بے شمار بستر پڑے تھے اور کونے میں تین چار کھائیں کھڑی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دروازے کے عین سامنے، کمرے کے زیادہ منور حصے میں جہاں ایک پرانا مکمل اور اس کے ساتھ ایک کہنہ رتی بچھی ہوئی تھی ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ایک سبز پوش بزرگ جن کا لمبا کرتہ اور جھاڑو جی دھوتی دونوں ہی گہرے سبز رنگ کے تھے پلاسٹک کا ایک تہہ شدہ دسترخوان لے کر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سبز پوش بزرگ کا تعارف یہ کہہ کر کیا کہ ”اس مخلوق کا نام بابا جلال ہے اور آپ اس ڈیرے کے ناسی اور شرکروگوں میں سے ایک ہیں۔“ میں نے چہرہ اٹھا کر بابا جلال کی طرف دیکھا تو نہ وہ مجھے ناسی نظر آئے اور نہ ہی شرکرا البتہ ان کی حیثیت عرفی میں ان دو انگریزی الفاظ کے استعمال سے ان کی شکل بڑی مضحکہ خیز ہو گئی جہاں انہوں نے چھوٹے سے شلغم جیسے چہرے پر بہت لمبی مہر دار ڈاڑھی لٹکا رکھی تھی اور حریری چوگوشیہ ٹوپی کے ساتھ پیپر کلب لگا کر ایک عام سا پھول ٹانگ رکھا تھا۔ جب دسترخوان بچھ گیا تو بڑی عمر کے ایک اور بزرگ پانی کا جگ اور ٹین لیس ٹیشل کے گلاس لے کر آ گئے۔ بڑے مضبوط جتنے کے بزرگ تھے اور ڈیرے کے خادم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”مہر صاحب روٹی کھالی ہے؟“ تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا ”جی جناب کھالی ہے!“

”پھر اب کیا ارادہ ہے؟“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

”جس طرح جناب ارشاد فرمائیں۔“ انہوں نے کہا۔

”تو پھر آپ چلیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے رکھائی سے کہا ”دیر ہو رہی ہے۔ لمبا فاصلہ ہے اور آپ کی سواری بھی قابل اعتماد نہیں۔“

”بہت بہتر جناب!“ انہوں نے نیاز مندی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

اتنے میں بالا جلال ڈوگنوں، پلیٹوں، چمچوں اور روٹیوں کا تھال بھرے اندر آ گیا اور اپنا تھال دسترخوان پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ایک کر کے پلیٹیں مہمانوں کے آگے چنیں، روٹیوں والا چوخانہ رومال نکال کر درمیان میں رکھا اور دونوں ڈوگنوں کے ڈھکنے کھول دیئے۔ شلجم گوشت پکا تھا اور گرم گرم شوربے سے بھاپیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پلیٹ میں آدھ آدھ پاؤ کی دو بوٹیاں، دہی کی ایک بی سی ٹی اور چوسنے والی ہڈی کا ایک چمچا ڈال دیا۔ میں نے بہتر شور بچایا۔ نہ نہ کی۔ تھالی آگے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور کوئی سیر بھر ملے میری رکابی میں ڈال دیا۔

جب ہم کھانے لگے تو لال سرخ، دیسی گندم کی خیرری اور تھوری روٹی خود بخود شوربے میں اترنے، چوسنے اور ڈوبنے کے عمل میں مبتلا ہو گئی۔ روٹی کے ٹکڑے شوربے میں رچ کر اسفنج کے موٹے موٹے ٹکڑوں کی طرح پھول گئے اور ان کا اٹھانا مشکل ہو گیا۔ میں نے ایسے خوشبودار، لذیذ اور گرم گرم ٹھہر اس سے پہلے کشمیریوں کے گھروں میں بھی نہیں کھائے تھے۔ میری ساری توجہ، سارا وجود، تمام تر خودی اس کھانے میں غرق ہو گئی اور مجھے اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہ رہا کہ میرے گرد میرے متعلق ہی باتیں ہو رہی ہیں۔

اتنے میں بابا جی دھنیا پودینے اور انار دانے کی باریک پسلی ہوئی چٹنی کا ایک پیالہ لے کر اندر داخل ہوئے۔ اپنے بھاری وجود، لمبے قد اور عمر کے تقاضے کی وجہ سے وہ چوکھٹ کے اندر سیدھے داخل ہو کر زمین پر نہیں اترے بلکہ پہلو کے بل ہو کر انہوں نے دھب کر کے اپنا داہنا پاؤں اندر زینے پر رکھا اور دوسرا باہر ہی رہنے دیا۔ پھر انہوں نے ”نور والے“ کا ایک مکھم نعرہ لگایا اور دوسرا پاؤں بھی اٹھا کر اندر زینے پر رکھ لیا۔ اعظم صاحب

نے بھاگ کر ان کے ہاتھ سے چٹنی کا پیالہ پکڑ لیا اور باباجی آکر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا ”حضور اشفاق صاحب کو آپ کا یہ کمرہ بہت پسند آیا ہے۔“ میں نے پلیٹ سے پسینے میں بھرا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر کہا ”اور اسی کمرے کے ساتھ ساتھ یہ کھانا بھی بہت پسند آیا ہے۔ دونوں ہی خوب ہیں۔ دونوں ہی عجیب ہیں اور دونوں ہی دلربا ہیں۔“

دلربا کا لفظ سر باباجی نے ایک ہلکی سی تالی بجائی اور ایک نعرے کے انداز میں کہا ”یہ کمرہ بھی ان کا، یہ کھانا بھی ان کا، یہ ڈیرا اور ڈیرے کا سامان بھی ان کا اور ہم بھی ان کے..... نور والے۔“

باباجی جب صبح میں آکر کوئی بات کرتے تو اپنے بھاری بھاری ہاتھوں سے پوے پوے تالی بجا کر گویا اپنے آپ کو خود ہی متوجہ کرتے اور اپنی بات خود ہی کو سناتے۔

جب میں سب سے آخر میں کھانا کھانے سے فارغ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میری واسکٹ اور میری چٹلون میرے وجود پر تنگ ہو رہی ہے اور میری سانس پر ٹھن کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ میں نے ٹھن کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا، بہت کچھ لکھا تھا اور ٹھن کے بہت سے متاثرین کو ملا بھی تھا لیکن خود کبھی ٹھن کا شکار نہ ہوا تھا۔ ٹھن دراصل ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ارفع اور اعلیٰ خیالات کے حامل ہوں اور جن کے پاس کہنے کی بہت سی اونچی، بلند پایہ اور دانش افروز باتیں ہوں، جن کے پاس نئے فلسفیانہ افکار اور جرأت کے نئے اظہار ہوں۔ جو حقیقت کو جان چکے ہوں اور سچ کا راز پا گئے ہوں اور جن پر روح کا نجات کتاب کے صفحے کی طرح واضح اور روشن ہو چکی ہو لیکن جو بد قسمتی سے ظلم و استکبار اور وجود و استبداد کی وجہ سے اپنے افکار حقیقی اور اپنے تصورات کا اظہار نہ کر سکیں۔ جو اپنی زندگی کے ہر دور کے ٹھن میں راز حیات کو عام کرنے سے معذور ہیں اور سچ کی اتنی بڑی حقیقت کو ظالموں کے خوف کی وجہ سے اپنے ساتھ ہی لے جائیں اور اپنے ہم وطنوں کو سچ کی ایک عظیم نعمت سے محروم رکھے جب چاہے اس دنیا سے گزر جائیں۔ تھرڈ ورلڈ میں اپنے پیچھے تیس پینتیس کتابیں چھوڑ جانے کے باوجود مصنفین ٹھن کی وجہ سے وہ بات نہیں کر سکے جو ان کے ذہنوں پر یونانی فلسفیوں کے علوم کی طرح مرقوم تھی اور جس کے لیے انہوں نے سالہا سال ریاضت بھی کی تھی۔

میں بھی ٹھن کی وجہ سے اور بے جا پابندی کی وجہ سے کم از کم اپنی تین عظیم کتابیں اپنے ہم وطنوں کو نہ دے سکا تھا مگر آج کی ٹھن میری اپنی تھی اور میری ذاتی تھی۔ میں اس کا صاحب حال تھا، اور یہ مجھ پر ڈائریکٹ گزر رہی تھی۔ پہلی ٹھن کا میں صاحب قال تھا اور میرا اور اس کا تعلق صرف ذہنی تھا۔

ڈیروں پر، خانقاہوں پر، عبادت گاہوں پر، لنگروں کے کھانے گھر کے کھانوں سے بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے معزز ہوٹلوں اور ریسٹورانوں اور شادی بیاہ کے کھانوں سے اور امریکی ضیافتوں اور صدر مملکت کی دعوتوں اور سٹیٹ بینک کورٹس سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ لنگر کے کھانے بے خوشبوئے، بے مصالحوئے، بے ترکیبے، بے ذائقہ لیکن حد درجہ لذیذ اور مزیدار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں امریکی اور شرفانی کھانے خاص ترکیبوں، خاص مصالحوں اور خاص لاگوں سے تیار کئے جاتے ہیں لیکن کھانے والے انہیں لذت کی وجہ سے نہیں حرص کی وجہ سے کھاتے ہیں۔ امریکی ضیافتوں میں زیاں کو خاص دخل ہوتا ہے۔ کھانا تیار کرنے سے پہلے بھی اصراف کیا جاتا ہے اور کھانا کھانے کے دوران بھی ضائع کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ لنگر کے کھانے چاہے پھٹی پر رکھ کر کھائے جائیں، چاہے زمین پر بیٹھ کر گود میں رکھ کر رکھ کر، ان کا ایک عجیب طرح کا

احترام ہوتا ہے کہ کوئی شے ضائع نہیں کی جاتی۔ کوئی لقمہ ناپسندیدہ ہونے کی بنا پر پھینکا نہیں جاتا اور کوئی دانہ ارادی یا غیر ارادی طور پر گر نہ نہیں دیا جاتا۔ امریکی اور شرفانی دعوتوں کے ہر کھانے میں چونکہ جائلز، جادواری، زعفران، سوٹھ کے ساتھ ساتھ تکبر اور گھمنڈ کا روغن بھی ملا ہوتا ہے اس لیے وہ کھانا روح پر اور دماغ پر بھاری ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں پر بھی جو تکبر اور غرور میں میزبانوں سے بھی زیادہ متکبر اور غصہ ور ہوں۔ امریکی، شرفانی، سرکاری اور سلطنتی دعوتوں میں چونکہ اشیاء کو مہمانوں کے مقابلے میں زیادہ وقعت دی جاتی ہے اور کھانے کو مہمانوں پر فوقیت دی جاتی ہے اس لیے ان کا رنگین، خوش وضع، جاذب نظر اور اشتہا انگیز کھانا لنگر کے بے رنگ، بے کیف اور لینڈ کھانے کے مقابلے میں وجود پر آہ بن کر چلتا رہتا ہے۔ لنگر کے کھانے کی تیاری میں شے کے مقابلے میں کھانے والوں کا احترام کیا جاتا ہے اور مہمان کی مہما کی جاتی ہے اس لیے لنگر کا کھانا کچھ اور ہی ہوتا ہے حالانکہ اس میں کم کم کچی روٹی اور پچنے کی زیادہ کٹی دال اور پودینے کے سوسے ٹکڑوں کی چٹنی ہوتی ہے۔

باباجی نے ڈونگے میں بچے ہوئے ہمارے سالن میں سے گٹ کی ایک بوٹی اٹھا کر اسے چوتے ہوئے کہا ”سکیرٹری صاحب اشفاق صاحب کے لیے چادر کرتا نکال کر ان کے سونے کا بندوبست کریں اور باہر ڈیوڑھی کے پاس تھڑے پر ان کی چارپائی ڈال دیں۔“

پہلے تو میں نے انکار کرنے کی کوشش کی اور کچھ تکلف کا اظہار کیا لیکن اتنے میں سکیرٹری صاحب ایک نیلی کناری والا تہہ اور کھدر کا ایک دھلا ہوا سفید کرت لے آئے۔ میں نے ڈونگے کو ٹھکے کے ساتھ والی جھگی میں جا کر کپڑے تبدیل کئے اور واپس آکر باباجی سے درخواست کی کہ ”اگر وہ مجھے دھوپ میں سونے کی بجائے بیٹھیں، اپنے کمرے میں آرام کرنے کی اجازت عنایت فرمائیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔“ انہوں نے بڑی خوشی سے اور خوشدلی سے اجازت دے دی اور میں کنستروں، ڈبوں، بوریوں اور اچار کے مرتبانوں کے درمیان ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔

میرا اس وقت کا لینڈ کچھ اس طرح کا تھا گویا میں غسل کے تختے پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے گرد یہ کنستروں، ڈبے، تین مرتبان گرم پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کافور، عرق گلاب اور نیم کے پتوں کا اہلا ہوا پانی شامل ہے اور ان سے ابھی مجھے غسل دیا جاتا ہے۔ ارد گرد کے لوگوں کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں لیکن وہ خود میرے قریب نہیں آ رہے۔ ان سب کو غسل کا انتظار ہے جو ابھی تک پہنچا نہیں ہے اور اس کے بیٹے نے آکر بتایا ہے کہ باباجی کھانا کھا کر سو گئے ہیں اس لیے کوئی آدھ کھٹے تک آئیں گے۔

جب میں سو کر اٹھا تو گہری شام ہو چکی تھی۔ ڈونگے کو ٹھکے کے اندر، میری چارپائی سے ذرا دور چوکھیا دیا ہل رہا تھا اور باہر سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور چارپائی سے ٹانگیں نیچے اتار کر سوچنے لگا کہ آج یہ میرے ساتھ کیا ہوا!!!

میرا خیال ہے کہ خراکوں کے کپ میں سلائی کیا جانے والا لڑکا جب پہلی مرتبہ سو کر اٹھتا ہوگا تو اس کے ذہن میں بھی ایسے ہی خیال آتے ہوں گے۔ میں نے نیلی کناری والے ٹانے کے تہہ کو جو سوتے میں، کھلنے کے برابر ڈھیلا ہو گیا تھا پھر کس کر باندھا اور باہر آ گیا۔

باہر ڈیرے پر روشنی ہو چکی تھی اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے شام کا کھانا تیار کر رہے تھے۔



نوجوان طبقہ بزکشی کے کھیل میں کافی دلچسپی لے رہا ہے۔ بلوچستان میں اس کھیل کی سرپرستی ملک موسیٰ جان کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ٹیم کے لیے کم از کم دس سدھائے ہوئے گھوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت صوبے میں چار باقاعدہ تربیت یافتہ ٹیمیں موجود ہیں جن کے درمیان ہر جمعہ کے روز کپلاک کے مقام پر مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور سہ ماہی ٹورنامنٹ بھی کرائے جاتے ہیں۔ بزکشی کے ایک ماہر ڈاکٹر عبدالباقی نے بتایا کہ صدیوں پرانے اس کھیل کا آغاز منگولیا سے ہوا ہے اور چنگیز خان کے جنگجوؤں نے اسے مرکزی ایشیائی خطوں تک پھیلا دیا جہاں سے یہ افغانستان پہنچا۔ ان کا کہنا تھا کہ بزکشی کھینے کے لیے کھلاڑی کا دلیر ہونا لازمی ہے۔ اس کھیل میں مخالف ٹیموں کے کھلاڑی ایک مردہ بکرے یا بکری کو ایک دوسرے سے چھیننے ہیں اور تقریباً چالیس پچاس گز دور ایک پول کے پاس لے جاتے ہیں جس سے نمبر ملتے ہیں یا گول ہوتا ہے۔ بکرے کو فارسی زبان میں ”بز“ کہتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کھیل کا نام بزکشی پڑ گیا ہے۔ کھیلنے سے پہلے بکرے کو ذبح کیا جاتا ہے اور سر علیحدہ کرنے کے بعد کھلاڑی گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے نیزوں کی مدد سے بکرے کو اٹھاتے ہوئے مخالف کھلاڑی سے دور لے جاتے ہیں۔ بعض کھلاڑیوں نے بتایا کہ دوسری چیزوں کے ساتھ بکرے بھی منبٹے ہو گئے ہیں اور اب وہ بزکشی کے کھیل میں پھڑے استعمال کرتے ہیں۔ صوبائی سرپرست ملک موسیٰ جان نے کہا کہ حکومت کی جانب سے انہیں کوئی تعاون حاصل نہیں اور اب تک وہ اپنی مدد آپ کے تحت کام کر رہے ہیں اور کوئٹہ کے قریب کپلاک میں بزکشی کا گراؤنڈ بھی خود بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر حکومت کا تعاون حاصل ہو تو وہ اس کھیل کو ملک

سایہوں کو میدان جنگ میں ہر طرح کے شدید حالات کے لیے تیار رکھنا تھا۔ یہ کھیل وسطی ایشیاء کے کئی ممالک میں اب تک بے حد مقبول ہے۔ افغان مہاجرین کی پاکستان آمد کے بعد بزکشی نے یہاں بھی رواج پا لیا ہے۔ بزکشی کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ زبان و مکان کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ یہ کھیل اب ایک مد کے اندر کھیلا جاتا ہے۔ میدان کے ایک سرے پر ایک گول دائرہ کھینچا جاتا ہے جس کے بیچ میں ایک ان شدہ بکری رکھ کر کھلاڑی جسے بزکشی کی اصطلاح میں ”پہلوان“ کہا جاتا ہے، زور بازو سے اٹھاتا ہے اور میدان کے دوسرے سرے میں متعین نشان سے گولم کر دوبارہ اس دائرے میں پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دوران کھلاڑی کو سخت کھٹکھٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بکری دائرے میں پھینکنے کے عمل کو ”حلال“ کہا جاتا ہے جو کہ ایک پوائنٹ کے برابر ہوتا ہے۔ گول کرنے والا کھلاڑی جب بکری ”حلال“ کرتا ہے تو داد و تحمیں کے لیے شائقین کا رخ کرتا ہے۔ شائقین انہیں نقد رقم دیتے ہیں۔ یہ دراصل ان کا انعام ہوتا ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑیوں کو چوٹ آنا معمول کی بات ہے بلکہ جان کا خطرہ بھی موجود رہتا ہے۔ قوت بازو اور مہارت اس کھیل میں شرط اول ہے۔

یہ کھیل گزشتہ 25 سالوں سے کوئٹہ میں کھیلا جا رہا ہے مگر بدقسمتی سے حکومتی سطح پر خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی گئی۔ فیڈریشن اپنی مدد آپ کے تحت بزکشی کے مقابلے منعقد کرتی ہے۔ افغانستان پر 1978ء کی روسی جارحیت کے نتیجے میں پاکستانی پناہ گزینوں نے اپنے کھیلوں سے بھی مقامی لوگوں کا آشنا کر لیا۔ اس میں توپ گولہ اور بزکشی قابل ذکر ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق صوبے کے اکثر مقامات پر



عارف محمود ایل

بزکشی..... افغانستان کا قومی کھیل

چنگیز خان کے دور میں شروع ہونے والا یہ کھیل بلوچستان اور وسط ایشیائی ریاستوں میں آج بھی بہادروں کا کھیل تصور کیا جاتا ہے!

پاکستان میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں پاکستان بزکشی فیڈریشن کے زیر اہتمام کوئٹہ میں بزکشی کے تین روزہ مقابلے ہوئے۔ صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کے مضافاتی علاقے کپلاک میں منعقدہ بزکشی کے مقابلوں میں کئی ٹیموں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ بزکشی افغانستان کا قومی کھیل ہے تاہم اس کھیل کی ابتدا چنگیز خان کے دور میں ہوئی جس کا مقصد

بزکشی وسطی ایشیاء کے وسیع و عریض گھاس کے میدانوں میں کھیلا جانے والا قدیم ترین روایتی کھیل ہے۔ اس کا تعلق منگول جنگجو سردار چنگیز خان کے دور سے ہے جس کی فوجیں 13 ویں صدی میں ایشیاء کو روندتی چلی گئیں۔ بزکشی جری اور سخت جان قبائل کا پہلوانی خطرناک مگر دلچسپ کھیل ہے۔ طاقتور اور زور آزمائی اس کھیل کا لوازمہ ہے۔ یہ کھیل اب

”خود جلیس دیدہ اغیار کو بینا کر دیں“



husain.8@hotmail.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے مدیرین قاری اور مستقل لککار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیا تھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد عیسیٰ مٹھاس، لیمن کی گھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے!!

فرمودات

☆ کہنے کی کوشش کی تھی۔ اس شخص کے سوال پر اس نے کہا کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ میں کچھ سیکھ کر مردوں۔
☆ زندگی میں کتاب اور کمپیوٹر دونوں کی اہمیت ہے لیکن میں کتاب کو اہمیت دیتا ہوں۔ کتاب ”ون ڈش“ ہے اور کمپیوٹر کو آپ ”بوتے“ کہہ سکتے ہیں۔ ون ڈش اس لیے بہتر ہے کہ اس سے پیٹ خراب نہیں ہوتا۔

☆☆☆

انسان کا دشمن انسان ہے

☆ دیو جانس کلبی یونان کا ایک عجیب کنزوار تھا۔ تاریخ اسے نسل انسانی کا سب سے بڑا متوکل اور سب سے بڑا قاعد پسند دانشور کہتی ہے۔ وہ آنکھوں سے اندھا لیکن دل و دماغ سے روشن شخص تھا۔ اس کے

☆ جو شخص تمہاری ضرورت کو تمہاری نگاہوں سے نہیں پڑھ سکتا اس سے کچھ مانگ کر خود کو شرمندہ نہ کرو۔ (حضرت علیؓ)
☆ ہم کیا تھے؟ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہم کیا ہیں اس کا ہمیں شعور ہونا چاہیے۔ ہم کیا ہوں گے اس کی ہمیں فکر کرنی چاہیے۔
☆ ہمارے طلباء میں کم کوشی اور آرام طلبی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں، وہ کامیابی کے لیے مختصر گڈ ٹریاں ڈھونڈتے ہیں۔
☆ زندگی کا حاصل علم ہے۔ البیرونی نے مرنے سے چند گھنٹے پہلے ہی ایک شخص سے قانون وراثت

نعت (روح ادب)

یہ حکم الہی ہے تمہیں حکم ادب ہے
آواز نہ ہو اونچی کہ یہ سوئے ادب ہے
محفل ہے نبی ﷺ کی، ذرا آنکھ رہے نیچی
گردن کو جھکا لیجئے، یہی حسن ادب ہے
آئیے گا سنور کے یہ ہے محفل کا تقاضا
ہے عید ولادت کی یہاں شوق و ادب ہے
دلکش ہے وہی محفل جہاں ذکر نبی ﷺ ہے
پڑھئے، سلام کہیے کہ یہ رسم ادب ہے
اس محفل خاکی میں حاضر ہیں ملائک بھی
مجلس ہے محمد ﷺ کی یہاں نور ادب ہے
رکتی نہیں آنکھوں سے جھڑی ذکر نبی ﷺ پر
انکھوں سے سجے محفل، یہی ذوق ادب ہے
(شمس بازغہ شروانی۔ دہلی)

کے دوسرے حصوں میں بھی فروغ دیں گے۔

☆ اس کھیل سے واقفیت رکھنے والوں کو اس کے قواعد کافی آسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بکرے کو اپنی زین سے نہیں باندھ سکتے۔ آپ اپنے مخالف سے بکرے کو کھینچنے کے لیے اس کے ہاتھ پر ضرب نہیں لگا سکتے اور آپ دوسرے گھڑسواروں کو گرانے کے لیے ری کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر یہ قواعد کچھ عجیب لگتے ہیں تو انہیں بزکشی کا ایک فوری سبق سمجھ لیں۔ بلاشبہ قواعد کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے لیکن اس درشت کھیل سے واقف کھلاڑی انہیں اچھے کھلاڑیوں کے اطوار کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ پاکستان میں بزکشی کا کھیل زیادہ تر موسم سرما میں کھیلا جاتا ہے کیونکہ اس وقت کا شکار زیادہ نہیں ہوتا

☆ اور گھوڑے اور گھڑسوار زیادہ گرمی کا شکار ہوئے بغیر اسے کھیل سکتے ہیں۔ چاہے یہ کھیل کسی بھی شکل یا موقع پر کھیلا جائے بزکشی کا انحصار جیتنے والے گھوڑوں اور گھڑسواروں کے علاوہ کھیل کی رسمی تقریب کی سرپرستی پر ہوتا ہے۔ قبائلی سردار گھوڑے پالتے ہیں اور ان کے نسلی سلسلے پر فخر کرتے ہیں۔ بزکشی میں کامیابی حاصل کرنے سے گھوڑے کے مالک کی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قبائلی سردار اور اسی طرح علاقے کے سربراہان اور لوگ اپنے گھوڑوں کے لیے خصوصی گھڑسوار ملازم رکھتے ہیں جنہیں چنیدہ کہا جاتا ہے۔ سب سے اہم چیز ان کی جانب سے پرسرست تقاریب کی سرپرستی ہے جہاں بزکشی کا روایتی کھیل کھیلا جاتا ہے۔ بزکشی کے لیے مردہ جانور کا دھڑ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں بکروں کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن بکروں کی عدم دستیابی کی صورت میں چھوٹے بچھڑوں سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔ بزکشی کا مقابلہ شروع ہونے سے قبل کھلاڑی جانور کے دھڑ کو کم از کم 24 گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں بھگو کر رکھتے ہیں۔ یہ عمل اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ بکرے کا دھڑ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم رہے اور کھیل کے دوران سینکڑوں چنیدہ اوزوں کی اسے چمین کر فاقہ دارے میں لے جانے کی آزمائی کے دوران وہ کھڑے کھڑے نہ ہو جائے۔ بزکشی کا کھلاڑی ایک بہادر اور زور آور انسان ہوتا ہے۔ وہ بڑی پر پٹی بندھوانے، گرنے کے بعد گھوڑے کی پشت پر دوبارہ سوار ہونے اور کھیل جاری رکھنے کے لیے رکتا ہے۔ بزکشی کے گھوڑوں کے تربیت کار انہیں جینی اور جوگی عام غذا کے علاوہ وقفوں وقفوں سے خشک میوے اور کھن کھلاتے ہیں۔

فوری جواب دے دے لیکن ایسا ممکن نہیں ہوتا۔
چوبیس گھنٹے 4x4 کی سکرین کے سامنے
گزارنے سے ہمیں بہت معلومات کا ذخیرہ تو مل
جائے گا لیکن اسے استعمال میں لانے کے لیے
ہمارے دماغ میں اتنی جگہ ہی نہیں ہوگی کہ اسے سنور
کر سکیں اور وقت پڑنے پر اس سنور شدہ مواد کو نکال
کر استعمال میں لایا جاسکے۔ کچھ عرصہ قبل تک جب
ہم کمپیوٹر کی الف ب سے واقف نہ تھے تب ہم چھوٹی
سے بڑی چیز کو اپنے دماغ کے نہاں خانوں میں چھپا
کر رکھتے تھے لیکن اس کی تخلیق کے بعد ہم نے یہ کام
بھی کمپیوٹر کے سپرد کر دیا کہ جیسے کمپیوٹر کو ہم نے نہیں
ہمیں کمپیوٹر نے بنایا ہو۔ گزشتہ دنوں ایک تحقیق
سامنے آئی ہے جس کی رو سے کمپیوٹر انٹرنیٹ سے
انسانی یادداشت کی صلاحیت متاثر ہو رہی ہے۔ تحقیق
سے یہ بات سامنے آئی ہے جس کی رو سے کہ چیزیں
یاد رکھنے کے لیے ہم ”ٹرانزیکٹو میموری“ پر انحصار
کرتے ہیں یعنی یادداشت کا کام دماغ کے علاوہ کوئی
اور کر رہا ہے یعنی وہ کام اب کمپیوٹر سرانجام دے رہا
ہے۔ کمپیوٹر پر مکمل انحصار کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ہم
انتہائی ہلکے پسند ہو گئے ہیں۔ ہم کوئی بھی ایسا کام نہیں
کرنا چاہتے جس میں ہمیں دماغ کا استعمال کرنا
پڑے۔ ہماری ہی معلومات کا ذخیرہ ہے جسے ہم نے
کمپیوٹر کی یادداشت میں ڈال دیا لیکن اب ہماری
دماغی کاوشیں بھی اسی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔
کولمبیا، ہارورڈ اور یونیورسٹی آف وکونسن میں ایک
ریسرچ سے ثابت کیا گیا ہے کہ جب بچوں سے کوئی
سوال پوچھا گیا تو انہوں نے وہ آسان جواب دینے
پر اکتفا کیا جسے وہ آسانی سے یاد رکھ پائے اور یہ خیال
کرنے لگے کہ وہ اس کا جواب انٹرنیٹ پر تلاش کریں
گے۔ دوسری کی گئی ریسرچ سے یہ بات سامنے آئی
کہ بچے صرف وہی چیز یاد رکھنا چاہتے ہیں جس کی

شب اس کی کل کائنات تھا۔ ایک دن سردیوں کی
سنہری دوپہر تھی، دیو جاسن شب میں لیٹا تھا۔ ایتھنز
کا ایک ہرکارہ اس کے پاس آیا اور اسے خوشخبری
سنائی ”مبارک ہو سکندر اعظم پوری دنیا فتح کر کے
واپس ایتھنز آ رہا ہے۔“ دیو جاسن کلبی نے قہقہہ لگایا
اور اس کے بعد وہ تاریخی فقرہ کہا جو آنے والے
زمانوں میں دیو جاسن کی پہچان بن گیا۔ جس نے
پانچ ہزار برس بعد بھی دیو جاسن کو زندہ رکھا۔ اس
نے کہا ”اگر انسان قاعدت پسند ہو تو وہ مٹی کے اس
شب میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو
جائے تو پوری کائنات بھی اس کے لیے چھوٹی ہے۔“
”انسان اگر مطمئن ہوتا سیکھ لے تو وہ مٹی مٹی
کے شب میں بھی خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے لیکن اگر
اس کی آنکھوں میں حرص آ جائے تو ساری دنیا کی
گاڑیاں، ساری دنیا کے جہاز، ساری دنیا کے
مخلات، ساری دنیا کا سونا چاندی، ڈالر اور ساری دنیا
کا اقتدار مل کر بھی اس کی بھوک نہیں مٹا سکتا۔ وہ اپنی
پوری زندگی مزید سے مزید اور زیادہ سے زیادہ کی
تلاش میں گزار دیتا ہے۔“
(”زیرو پوائنٹ“ جاوید چودھری کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

4x4 کی سکرین

کمپیوٹر سائنس نے ہماری زندگی کو جس قدر ہل
کر دیا اتنی ہی مشکلات بھی پیدا کر دیں۔ اب ہمیں
اگر کسی چھوٹی سی چیز کے بارے میں معلومات چاہیے
ہوں تو ہمارا ذہن فوراً کمپیوٹر کی طرف راغب ہو جاتا
ہے کہ گوگل پر ایک چیز لکھیں تو فوراً اس کا جواب مل
جاتا ہے۔ ہم انسانوں نے کمپیوٹر کی یادداشت تو بڑھا
دی لیکن اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔ اگر کبھی کسی چیز
کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوں تو ہم ایک
دوسرے کی شکل دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی اس کا

کہنا تھا انسان کی ضروریات انتہائی مختصر ہیں لیکن
انسان ضروریات کے دائرے کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ
پوری زندگی کے سفر کے باوجود یہ دائرہ ختم نہیں ہوتا۔
اس کا کہنا تھا بہادر شخص وہ ہے جو اپنے اندر کے خوف
کو شکست دے دے۔

دیو جاسن کلبی زندگی کے آخری حصے میں شہر
سے نکل کر جنگل میں آباد ہو گیا تھا۔ کسی نے اس سے
پوچھا ”تمہیں جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔ اس
نے مسکرا کر جواب دیا ”انسان کا دشمن انسان ہے،
جانور نہیں“ ایک اور جگہ لکھا ہے ”انسان کو جانوروں
سے نہیں انسان سے خطرہ ہے۔“ وہ کہا کرتا تھا
”انسان سے بچو، انسان کی زندگی ہزار درندوں پر
بھاری ہے۔“ دیو جاسن کلبی آخری عمر میں توکل اور
قناعت کی انتہائی میزبانی پر چڑھ گیا۔ اس کے پاس
مٹی کا ایک پیالہ ہوتا تھا وہ اس سے پانی بھی پیتا تھا
اور اس پیالے سے پلٹ کا کام بھی لیتا تھا۔ ایک
دن وہ پانی پینے کے لیے ندی پر گیا۔ اس کا ایک
شاگرد بھی ساتھ تھا۔ شاگرد نے ایک جانور دیکھا۔
جانور ٹھٹھا ہوا جنگل سے نکلا، ندی کے کنارے پہنچا،
پانی پر جھکا، پانی پیا اور ٹھٹھا ہوا جنگل میں واپس چلا
گیا۔ شاگرد نے استاد کو جانور کی حرکات و سکنات
بتائیں تو دیو جاسن نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ”تم پر
تف ہو، ایک جانور بھی توکل میں تم سے کتنا آگے
ہے، تم ابھی تک پیالے کی محتاجی سے آزاد نہیں ہو
سکتے“ اس نے اسی وقت پیالہ پتھر پر مارا اور کچریاں
اٹھا کر ندی میں پھینک دیں اور اس کے بعد ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے پیالے کی محتاجی سے بھی آزاد ہو گیا۔
دیو جاسن سارا دن جنگلوں اور ویرانوں میں مارا
مارا پھرتا تھا اور شام کو واپس اپنے ٹھکانے پر آ جاتا
تھا۔ یہ ٹھکانا مٹی کی کاچھوٹا سا بن تھا۔ وہ شب میں
ٹھٹھا، ٹانگیں باہر لٹکاتا اور سوچتا سوچتا سو جاتا۔ یہ

پاس ایک کتا تھا۔ یہ کتا اس کا ساتھی بھی تھا اور بہرو
رہنما بھی۔ اس کتے کی نسبت اسے ”کلبی“ کہتے تھے۔
دیو جاسن کلبی ارسطو اور سکندر اعظم کے دور میں تھا اور
اس کے بارے میں عجیب اور دلچسپ واقعات مشہور
تھے۔ مثلاً کہا جاتا ہے وہ ایک دن دوپہر کے وقت
ہاتھ میں چراغ لے کر ایتھنز کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔
کسی نے اس سے پوچھا ”دیو جاسن تم چراغ لے کر
کیا تلاش کر رہے ہو؟“ اس نے مسکرا کر جواب دیا
”میں آدمیوں کے ہجوم میں انسان تلاش کر رہا ہوں۔“
اس زمانے میں ارسطو نے انسان کے بارے میں اپنا
مشہور فلسفہ دیا تھا ارسطو نے کہا تھا ”انسان ایک ایسا
جانور ہے جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور اس کی قامت
سیدھی ہوتی ہے۔“ یہ فلسفیوں، عالموں اور علم پرستوں
کا دور تھا چنانچہ ارسطو کا یہ فلسفہ کلی گلی، محلے محلے دہرایا
جانے لگا جہاں دو لوگ جمع ہو جاتے وہ آپس میں
”ارسطو کے انسان“ کے بارے میں گفتگو شروع کر
دیتے تھے۔ دیو جاسن کلبی کی درویشی اور سادگی
پورے یونان میں مشہور تھی۔ وہ عموماً شہر سے باہر رہتا
تھا اگر اسے کھانے کے لیے کچھ مل جاتا تھا تو وہ کھا لیتا
تھا بصورت دیگر فاقے کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ وہ
کسی حد تک توحید پرست بھی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ
اس کائنات کی تمام چیزیں دیوتاؤں نے بنائی ہیں لیکن
دیوتاؤں کو کس نے بنایا ہے؟ اوہ کہتا تھا دنیا کا سامان و
اسباب انسان کو اصل خوشی سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر
انسان زندگی میں حقیقی خوشی پانا چاہتا ہے تو اسے دنیا
کے ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔
اس کا کہنا تھا ہمارا گھر بار، ہمارے بیوی بچے، شہر،
لوگ، عزیز رشتہ دار، روایات، قوانین اور ضابطے ہماری
آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔
انسان اس وقت تک پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا
جب تک وہ دنیا داری سے رہائی نہیں پالیتا۔ اور اس کا

کی زد سے باہر رہتی ہیں۔

(دستور ساز اسمبلی میں پروڈائل پر بحث
”سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں“
احمد سلیم کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

چراغِ تلے

نستے چلے آئے ہیں کہ آم، گلاب اور سانپ کی
طرح عورتوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ فرق صرف
اتنا ہے کہ آم اور گلاب کی قسم کا صحیح اندازہ کانٹے اور
سوتھنے کے بعد ہوتا ہے اور اگر مارگریزیدہ مرجائے تو
سانپ کی قسم کا پتہ چلانا بھی چنداں دشوار نہیں لیکن
آخر الذکر، خالص مشک کی طرح، اپنی قسم کا خود اعلان
کر دیتی ہیں۔ ایک بزرگوار جنہوں نے اپنی عمر اور
کمانی ریس کورس اور ”طواف کوئے ملامت“ میں
گنوائی ہے اکثر کہا کرتے ہیں کہ گھوڑے اور عورت
کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا
ہے لیکن اس قسم کے مقولوں کی حیثیت ہارے ہوئے
جواہر کی لفظی پچھلیوں سے زیادہ نہیں، جو فضا کو
روشن کریں یا نہ کریں، آنکھوں میں کچھ دیر کے لیے
ضرور چکاچوند پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد
تاریکی کچھ اور زیادہ تاریک معلوم ہوتی ہے۔ گھوڑے
اور سانپ کے خصال کی تصدیق یا تردید کا حق ویسے
تو سلوتریوں اور سپردوں کو پہنچتا ہے یا پھر ان حضرات
کو جوڑے جا چکے ہیں یا دہلی کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں
لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ شرم منوعہ اگر
سانپ کے پھن پر بھی رکھا ہوتا تو وہاں بھی آدمی کے
حریص ہونٹ بے دھڑک اسے چوم لیتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات قسموں کی ہو رہی
تھی اور ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ آج کل عورتوں کو دو
قسموں میں باننا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو مومنہ ہیں،
دوسرے وہ جو دہلی نہیں ہیں۔ آپ کہیں گے ”آخر

تھے۔ جناب والا.....

”یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان سب سے بڑی
اسلامی ریاست ہے۔ تاریخ کے طالب علم یہ جانتے
ہیں کہ کس طرح خلفائے راشدین کے عہد میں عام
زندگی کو پاک رکھا جاتا تھا اور اقرباء پروری، جانبداری
اور خرید و فروخت کی برائیوں پر کس طرح قابو پایا گیا
تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو بھی
معاف نہیں کیا۔ انہوں نے قانون کی زد میں آنے
والے ہر شخص کو سزا دی۔ یہاں تک کہ عظیم جرنیل
حضرت خالد بن ولید جو ایک عظیم اسلامی رہنما تھے اور
جنہوں نے بہت سے اہم معرکے سر کئے اور جنہیں
سیف الاسلام کہا جاتا تھا، نے بھی ملکی قانون کی
خلاف ورزی کی تو انہیں بھی نہیں بخشا گیا اور ایک
عظیم جنگ کے دوران ہی انہیں بے طرف کر دیا گیا۔“
میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پلین کے
شہنشاہ عبدالرحمن سومؒ کا حوالہ دوں گا جس نے تیس
سال سے زائد عرصہ تک چین پر حکمرانی کی، اس
نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی ایک بڑے جرم میں
ملوث ہونے پر پھانسی کی سزا پانے سے نہیں بچایا۔
تاریخ میں رقم ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس سال
بعد تک زندہ رہا مگر کسی نے اس کے چہرے پر
مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ اسے اس طرح شدید
صدے سے دوچار ہونا پڑا مگر اس نے قانون کے
راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ آج میں اس بات
پر خوش ہوں کہ میں اس بل کے منظور کروانے میں
حصہ لے رہا ہوں جس سے پاکستان میں
ایمانداری رواج پا جائے گی۔ جناب والا.....

اس ایوان میں کہا گیا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ
انتظامیہ پر اپنا اعتماد کھو رہے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے
ہیں کہ بدعنوانی اور بے ایمانی میں صرف چھوٹے
لوگ پکڑے جاتے ہیں جبکہ بڑی مچھلیاں قانون

جعلی ڈاکٹر کی؟

☆☆☆ بھوک زیادہ خطرناک ہوتی ہے یا بھوکا انسان؟
(اردو پوائنٹ ڈاٹ کام سے ماخوذ)

☆☆☆

تاریخی الفاظ

ہمارے محبوب قائد اعظم اور بابائے قوم نے کہا تھا:
”دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ
یہ ہے کہ ہندوستان جن بڑی لعنتوں میں سے گزر رہا
ہے ان میں رشوت اور بدعنوانی سرفہرست ہیں۔ میں
یہ نہیں کہتا کہ باقی ممالک ان سے پاک ہیں مگر
میرے خیال میں ہماری حالت اس سلسلے میں بہت
خراب ہے۔ یقیناً یہ ایک زہر ہے ہمیں ایک نولادی
ہاتھ سے اس کا خاتمہ کرنا ہے اور میرے خیال میں
جب بھی اس اسمبلی کے لیے ممکن ہوا آپ لوگ اس
سلسلے میں مناسب اقدامات کریں گے۔“

”کالا دھن ایک لعنت ہے مجھے علم ہے کہ کالا
دھنڈا کرنے والے اکثر پکڑے جاتے ہیں اور سزا
پاتے ہیں۔ ہماری عدالتوں کے مطابق انہیں سزا
سنائی جاتی ہے اور بعض اوقات محض جرم نامہ کیا جاتا
ہے۔ اب آپ نے اس جرم کا مقابلہ کرنا ہے جو کہ
معاشرے کے لیے سیاہ ناگ بن چکا ہے۔“

پھر انہوں نے کہا:

”میرے ذہن میں اگلا خیال اس ورثے کے
بارے میں آتا ہے جو بہت سی اچھی باتوں کے ساتھ
اقرباء پروری اور خرید و فروخت جیسی برائی کی صورت
میں ہم تک منتقل ہوا ہے۔ اس برائی کو سختی سے پکڑنا
ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں کسی بھی قسم
کی دلائی، اقرباء پروری یا اثر انداز ہونے کو برداشت
نہیں کروں گا۔ جہاں کہیں بھی میں نے اس برائی کو
پایا خواہ یہ کم ہو یا زیادہ ختم کر کے دم لوں گا۔“
یہ وہ تاریخی الفاظ ہیں جو بابائے قوم نے کہے

ضرورت ہے۔ دوسری معلومات سے ان کا کوئی
سرکار نہیں ہے۔ کمپیوٹر کی یادداشت ”ٹرانس ایکٹو
میموری“ کہلاتی ہے۔ اس میں وہی سب چیزیں محفوظ
ہوتی ہیں جو ہم سنور کرتے ہیں۔ اس میں نیا کچھ بھی
نہیں ہوتا اور یہی معلومات ہم صدیوں سے استعمال
کرتے آ رہے ہیں جبکہ ماہرین اور سکارلز اس کوشش
میں ہیں کہ کمپیوٹر کی یادداشت میں ایسا مواد بھی بھرا
جائے جس میں نئی تحقیقات موجود ہوں۔ کمپیوٹر میں
محفوظ چیزوں کا یہ فائدہ ہے کہ ایک ٹخن دبانے پر صحیح
معلومات ہمارے سامنے آ جاتی ہیں لیکن اس
ٹیکنالوجی نے ہمیں دماغی طور پر ست کر دیا ہے جس
کی وجہ سے مجموعی معلومات کی اہمیت ہمارے لیے ختم
ہو چکی ہے کیونکہ ہمیں جو بھی انفارمیشن چاہیے وہ گوگل
پر موجود ہوتی ہے۔ اگر ہم اس رفتار سے کمپیوٹر کی
یادداشت پر انحصار کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب
کمپیوٹر ہی طے کرے گا کہ ہمیں کیا سوچنا ہے اور کیا
کرنا ہے کیونکہ کمپیوٹر ہماری یادداشت پر قابض ہو
جائے گا اور ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔

(بی بی سی ڈاٹ کام سے ماخوذ)

☆☆☆

سوا.....لات

☆☆☆ خشک سالی زیادہ خطرناک ہے یا صرف سالی؟
☆☆☆ بیوی کی ڈانٹ زیادہ خطرناک ہوتی ہے یا
ساس کی؟
☆☆☆ عورت کے آنسو مرد کو جلدی گھائل کرتے ہیں
یا اس کی مسکراہٹ؟
☆☆☆ آج کل برقہ پردے کے لیے پہنا جاتا ہے
یا چہرے کے عیب چھپانے کے لیے؟
☆☆☆ فی زمانہ لڑکیاں چھیڑنے سے پریشان ہوتی
ہیں یا نہ چھیڑنے سے؟
☆☆☆ بددوق کی گولی زیادہ خطرناک ہوتی ہے یا

ہو جاتی تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے؟

☆☆☆

ہم آج تک کرکٹ نہیں کھیلے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اس کی برائی کرنے کا حق نہیں۔ اب اگر کسی شخص کو کتے نے نہیں کاٹا تو کیا اس بد نصیب کو کتوں کی مذمت کرنے کا حق نہیں پہنچتا؟ ذرا غور کیجئے۔ افیم کی برائی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو افیم نہیں کھاتے۔ افیم کھانے کے بعد ہم نے کسی کو افیم کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔ برائی کرنا تو بڑی بات ہے ہم نے کچھ بھی تو کرتے نہیں دیکھا۔

کرکٹ انگریزوں کے لیے مشغلہ نہیں، مشن ہے لیکن اگر آپ نے بھی کرکٹ کی ٹیموں کو مٹی جون کی بھری دوپہر میں عاقبت نااندیشانہ جرات کے ساتھ موسم کو پہنچ کر دیکھا ہے تو ہماری طرح آپ بھی اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تصویریں مشقت ہے جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر کوئی سر پھر امنہ مانگی اجرت دے کر کبھی اپنے مزدوروں سے ایسے موٹی حالات میں یوں کام کرائے تو پہلے ہی دن اس کا چالان ہو جائے مگر کرکٹ میں چونکہ عام طور سے معاوضہ لینے کا دستور نہیں اس لیے چالان کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں جس طرح ہلکا پھلکا کھیل ترقی کر کے کام میں تبدیل ہو گیا وہ اس کے مؤجدین کے وہم و گماں میں بھی نہ ہوگا۔ غالب نے شاید ایسی ہی کسی صورت حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم مغل بنے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار سکتے ہیں۔

جاہلوں کا ذکر نہیں، بڑے بڑوں کو ہم نے اس خوش فہمی میں مبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم پورے بائیس کھلاڑی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی کی

بات بھی ثابت کر دی ہے کہ ذہنی الجھاؤ کا نتیجہ بالآخر جسمانی بیماری کی صورت میں نکلتا ہے۔ ذہن کی پیچیدگی براہ راست اور بالواسطہ دل کے امراض، پتہ اور گردوں میں پتھری کا باعث بنتی ہے۔ متواتر ذہنی دباؤ سے اعصابی نظام میں ناقابل علاج شکست و ریخت بھی ہو سکتی ہے۔ منہ خیالات سے محدے کا السر، تیزابیت اور قبض لاحق ہو جاتا ہے۔

ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے لوگ ایسے ذرائع اختیار کرتے ہیں جن سے شعور ذہنی طور پر معطل ہو جاتا ہے مثلاً شراب نوشی، نشہ کی دوسری چیزیں اور نیند آور ادویات کے ذریعے دماغی سکون تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ ادویات ذہنی ساخت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتیں بلکہ ایک خاص وقت تک خود فراموشی طاری کر دیتی ہیں۔ ان ذرائع سے نہ صرف جسمانی صحت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ اعصابی نظام کمزور پڑ جاتا ہے اور آدی جلد بڑھاپے تک پہنچ جاتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

انسانی ذہن

دنیا میں جتنی ترقی ہو چکی ہے اس کے پیش نظر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دور علم و فن اور تخیل کائنات کے شباب کا دور ہے۔ انسانی ذہن میں ایک لاتناہی وسعت ہے جو ہر لمحہ اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تخلیق تخیل کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ابھی مخفی ہے۔ صلاحیتوں کا ایک حصہ منہ شہود پر آچکا ہے لیکن انسانی اتان کی ان گنت صلاحیتیں اور صفات ایسی ہیں جو ابھی مظہر خفی سے مظہر جلی میں آنے کے لیے بے قرار ہیں۔ انسانی ذہن ہزاروں سال پہلے بھی ایک معمہ تھا اور آج کے سائنسی دور میں بھی ایک معمہ ہے۔ آج ہمارے پاس پہلے سے کہیں زیادہ علمی اور تجرباتی ذرائع موجود ہیں جن کی مدد سے نئی نئی وضاحتیں

تسمکھا کر کہتے ہیں کہ درحقیقت کرکٹ صرف ایک ہی شخص کھیلتا ہے مگر اس کھیل میں یہ وصف ہے کہ بقیہ اکیس حضرات سارے سارے دن اس مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک سارس کی طرح کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر اس تھکان کو تندرستی سمجھ کر پڑے رہتے ہیں۔

☆☆☆

نہ گلہ نہ شکوہ

میں آسودہ ہوں۔ 80 سال کا عمر صدمہ ہے یہ..... نہ میرے دانت ٹوٹے ہیں نہ میری آنکھ کمزور، نہ حافظہ خراب، نہ کمر خمیدہ نہ گلہ نہ شکوہ..... ایک متوازن، مکمل، صحت مند زندگی گزارتا آ رہا ہوں۔ روگ انہیں لگتے ہیں جو انہیں پالتے ہیں۔ منہ سوچیں اور برا عمل انسان کو مضلل کرتا ہے۔ اس کے اعصاب، حافظہ اور اعضاء سب جلدی جواب دے جاتے ہیں۔ مثبت سوچ انسان کو توانا رکھتی ہے۔ زندگی کو اس کے دکھوں اور خوشیوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں آنا ایک بڑا تجربہ ہے۔ زندگی کو نائل طریقے سے گزارنا ایک کامیابی ہے۔

☆☆☆

منہی خیالات

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ذہنی یکسوئی تندرستی کے لیے ضروری ہے اور مسلسل پریشان رہنے سے بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ توانائی زیادہ مقدار میں خرچ ہونے سے قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے اور امراض حملہ کر دیتے ہیں۔ اعصابی قوت مضلل ہو جائے تو دماغی افعال سست پڑ جاتے ہیں۔ قوی میں کمزوری آ جاتی ہے اور قوت حافظہ متاثر ہوتی ہے۔ قوت فیصلہ کم ہونے کی بناء پر زندگی کے مراحل میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ تجربات نے یہ

دانشوروں کے سامنے آ رہی ہیں۔

ایک پرت کی ادھیڑ بن کی جاتی ہے تو دوسرا پرت سامنے آ جاتا ہے۔ دوسرے پرت کو اچھی طرح نہیں دیکھ پاتے کہ نیا روزن کھل جاتا ہے۔ سائنسدانوں اور علم النفس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ انسان ابھی تک اپنی صلاحیتوں کا پانچ سے دس فیصد بھی استعمال کرنے پر قادر نہیں ہو سکا۔ باقی قوتیں اس کے اندر خوابیدہ ہیں۔ گویا نوع انسانی نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ صرف پانچ سے دس فیصد صلاحیتوں کے استعمال کا ثمرہ ہے۔

ان معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور کی علمی کامیابیوں جن میں علم طب، علم حیوانات و نباتات، جینیات، طبیعیات، کیمیا، برقیات، تعمیرات، سائیکولوجی، بیرو سائیکولوجی اور دیگر علوم و فنون شامل ہیں یہ سب انسانی صلاحیتوں کے عکس ہیں لیکن جب ہم ان علمی و فنی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ہمارے ذہن میں بہت کم آتی ہے کہ یہ ہماری ذہنی قوتوں کے مظاہر ہیں جو قدرت نے ہمارے اندر محفوظ کر رکھی ہیں۔

جینیات (Genetics) کے علم ترقی کے بعد یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی شکل و صورت ماں، باپ یا رشتہ داروں سے مشابہت رکھتی ہے۔ نوعی اعتبار سے بچہ ان ہی خدوخال پر پیدا ہوتا ہے جو اس کے نوع کے دیگر افراد کے ہیں۔ نہ صرف جسمانی خدوخال وراثت میں منتقل ہوتے ہیں بلکہ عادات و اطوار بھی منتقل ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر نوع کے نقوش اور کائناتی ذہن کی صفات ایک ریکارڈ کی طرح والدین سے بچے کو منتقل ہوتی ہیں۔

(اردو پوائنٹ ڈاٹ کام سے)

☆☆☆

عجیب حسن اتفاق

قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش 25 دسمبر ہے اور ان کی وفات کی تاریخ 11 ستمبر ہے۔ یوم آزادی کی تاریخ 14 اگست ہے اور لیاقت علی خاں کی شہادت کی تاریخ 16 اکتوبر ہے اور یہ سب تاریخیں سال میں جس دن پڑتی ہیں وہ دن ایک ہی ہوتا ہے۔ اس برس یہ تاریخیں اتوار کے دن پڑتی ہیں۔ عیسوی کیلنڈر جب تک رائج ہے یہ سب تاریخیں اسی طرح ہر سال ایک ہی دن پڑتی رہیں گی۔ یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے۔

(جنگ ڈاٹ کام ڈاٹ پی کے)

11 ستمبر 2011ء سے اقتباس)

☆☆☆

زیر اور پیش

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب صادق محمد خاں خاص نے اپنے ملازم خاص سے بچے کے لیے پانی طلب کیا۔ اب یا تو نواب صاحب کی پیاس میں شدت تھی یا پھر ملازم خاص نے پانی لانے میں دیر کر دی۔ اس پر نواب صاحب اپنے ملازم سے اس قدر ناراض ہوئے کہ اسے فوراً محل سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ ملازم روتا پینتا رنجیدہ حالت میں محل سے باہر آ گیا۔ کچھ عرصہ تک ریاست میں مارا مارا پھرتا رہا اور اپنی غلطی کی تلافی کے لیے سفارش ڈھونڈتا رہا لیکن کس کی جرأت کہ وہ اس معاملہ میں نواب صاحب سے بات کرے۔ آخر کار کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خواجہ غلام فرید صاحب کے پاس جائے ہو سکتا ہے نواب صاحب ان کی بات مان میں اور اسے دوبارہ اس خدمت میں نواب صاحب واپس لے لیں۔ لہذا اس نے کوٹ مٹھن کا رخ کیا اور خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام داستان کہہ سنائی تو حضرت خواجہ غلام فرید نے تاریخ

کا مختصر اور انتہائی جامع سفارشی خط لکھا۔ اس خط میں اس مرد قلندر نے لکھا: صادق! زیر بن، زیر نہ بن متاں پیش پوندی ہو دی (فرید)

اس خط میں زیر، زیر اور پیش کا استعمال جس انداز میں کیا گیا ہے یہ خواجہ صاحب کی خصوصیت ہے۔ خدمت گار سفارشی خط لے کر نواب صاحب کے دربار میں پیش ہوا۔ نواب صاحب نے خط کو پڑھا اور خط کی عزت و تکریم کے بعد ملازم کو اس کے عہدے پر فوراً واپس رکھ لیا۔

(”مجلد العباس“ 2011ء سے اقتباس)

☆☆☆

چہرہ قدرے بھونڈا اور تھوڑی سی توند لگی ہوئی۔ وہ بہت امیر آدمی تھا۔ کروڑوں کی جائیداد تھی لیکن اللہ نے اس پر ہر آسائش اور رزق حلال حرام کیا ہوا تھا۔ وہ نہایت سستے کپڑے پہنتا، اگر کبھی تھری پیس سوٹ میں بھی ملیں ہوتا تو لگتا تھا وہ ابھی ابھی گھر سے نکال کر لایا ہے۔ اس پر ”وٹ“ پڑے ہوئے اور چٹلون کی کتنی ہی کریریں نظر آتیں۔ اس کا کوئی ایک روپ نہیں تھا۔ وہ دن میں موقع محل کے مطابق کتنے ہی روپ بدلتا، اگر اسے مجھ سے کوئی کام ہوتا تو اس کی خوشامد نہ بنی رُکے نہ رُکتی اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو اس کا چہرہ مزید کھنچ کر پہلے سے زیادہ مخوس ہو جاتا۔ اس کا کوئی نظریہ کوئی عقیدہ نہیں تھا مگر بوقت ضرورت وہ ہر نظریہ اور ہر عقیدہ اوڑھ لیتا تھا چنانچہ کبھی وہ دائمی رکھ لیتا اور کبھی منڈا ڈالتا، وہ کبھی کبھار مسجد میں بھی جاتا تھا مگر کچھ اس طرح کہ سب نمازیوں کو اس کی آمد کی خبر ہو جاتی تھی۔ وہ مسجد میں داخل ہوتے ہی پہلے ایک زوردار کھٹکورا مارتا جس پر نمازیوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کے بعد وہ ایک سستے سے عطر کی شیشی ہاتھ میں پکڑے ایک ایک نمازی کے پاس

جاتا اور اس کی قمیص پر یہ عطر لگاتا جس کی وجہ سے وہ اسے ہمیشہ یاد رکھتے کیونکہ اس عطر کا نشان عمر بھر جاتا نہیں تھا۔ عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں وہ عربی لباس میں ملیں اوتھ پر سوار نظر آتا اور محرم میں کالی قمیص پہن کر پھرتا۔ انڈیا اور پاکستان میں بیچ کے درمیان اپنے کاروبار کے سلسلے میں وہ اگر انڈیا میں ہوتا تو انڈین کھلاڑیوں کو انڈیز سے زیادہ اچھل اچھل کر داد دیتا اور اگر پاکستان میں ہوتا تو پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے لگاتے اس کا گلا بیٹھ جاتا۔

اس کا کوئی ایک کاروبار بلکہ دھند نہیں تھا بلکہ وہ ہر دو نمبر کام کرتا تھا اور اس سے اس نے کروڑوں کی جائیداد بنائی تھی۔ لالہ موسیٰ میں اس کی جعلی کاسٹیکس کی فیکٹری تھی۔ شیخوپورہ روڈ پر اس نے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی بھی بنائی ہوئی تھی جہاں جعلی ادویات تیار ہوتی تھیں۔ قبضہ گروپ سے بھی اس کے رابطے تھے۔ شنید ہے کہ اس نے ایک صاحب سے تیس لاکھ روپے یہ کہہ کر اٹھتے تھے کہ ہزار ہزار کے جعلی نوٹ تیار کرنے کا پورا ساز و سامان اس کے پاس موجود ہے چنانچہ وہ اگر اس ”پراجیکٹ“ میں شامل ہونا چاہے تو صرف تیس لاکھ کے عوض وہ دنوں میں کروڑ پتی بن جائے گا۔ واللہ اعلم، اس کے علاوہ اس نے تین مالدار بیواؤں سے یکے بعد دیگرے شادی بھی کی تھی اور وہ ان کی یکے بعد دیگرے موت کو بخش اتفاق قرار دیتا تھا۔ ایک دن اسے مجھ سے کوئی کام تھا۔ سو اس روز اس کی خوشامد نہ بنی دیدی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”چوہدری! ایک بات تو بتاؤ؟“ دانت نکال کر اور اپنے گول گول دیدے گھماتے ہوئے بولا ”سرکار! پوچھیں“ میں نے کہا ”تم دو نمبر کام کرتے ہو کبھی ضمیر پر بوجھ محسوس نہیں ہوا؟“ یہ سن کر اس نے اپنا منہ اتنا زیادہ کھول کر قہقہہ لگایا کہ اس کے طاق کا ”کوا“ دکھائی دینے لگا۔ اس کا جواب یہ

انہیں میں کا فرق ہے کیونکہ دونوں ناموں میں لفظ ”میر“ مشترک ہے۔

بے مثال نے اس نوعیت کے کئی سوال پوچھے جن کے آگے ہماری ہمت جواب دے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد ہم نے خود کو دنیا کا اہم ترین آدمی قرار دیا کہ بزبان خود بھی شرح آرزو نہ کر سکے۔ خیر اظہار عشق کا پروگرام اگلے دن پرمٹو کر دیا۔

اگلے روز بے مثال جلد ہی آگئی۔ تدریس کے آغاز سے قبل اپنے پروگرام کی عملی جامہ پوشی کرنا چاہی لیکن کوئی مناسب رومانوی جملے نہ بن پڑے۔ سوچا کل ایسے موقع پر بولے جانے والے ڈائلاگ یاد کر کے رکھیں گے..... انگش کے بعد اس نے اردو کی کتاب کھولی تو گھبرا گئے کہ شامت آگئی۔ کیونکہ بے مثال ایک ”حاضر سوال“ لڑی تھی، پڑھتی کم تھی اور سوال زیادہ کرتی تھی۔ بہر حال ہم اپنے ذہن کو تیار کرنے لگے تاکہ اس کے سامنے اعلیٰ ادبی ذوق کا خاطر خواہ مظاہرہ کر سکیں۔ اس نے دریافت کیا: ”آپ کا پسندیدہ شعر؟“ عرض کیا ”میر شیر“ یہ حیوانی ظرافت سن کر وہ کھکھلا اٹھی۔ آنکھوں میں شرارت لیے ہوئی:

”تم حسین آزاد کون تھے؟“ محمد حسین آزاد مرد تھے۔ ثبوت کے لیے مصرع ملاحظہ ہو۔
”حق مغفرت کرے عجب، آزاد مرد تھا“
اس نے مسکرا کر پھر استفسار کیا ”تو پھر ابو الکلام آزاد کون تھے؟“

”ابو الکلام آزاد کے ابو تھے۔“ ہم نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔
یہ رشتہ داری سن کر اس نے ایک زوردار تہقہہ لگایا۔ موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔ مسکراتے ہوئے وہ بہت حسین نظر آتی۔

”حسن اتفاق“ تھا۔ ہم جمال یار میں ایسے محو ہوئے کہ پلکیں جھپکنا بھول گئے کہ اچانک کرن صاحبہ کی آواز ابھری۔

”یہ ہے میری دوست..... بے مثال، اگلے ماہ اس کا امتحان ہے۔ میں اسے آپ کی شاگردی میں سوچنے آئی ہوں.....“
”مگر“ ہم نے بولنا چاہا ”دیکھیں آپ انکار نہیں کریں گے۔“

ہم بھلا کیوں انکار کرنے لگے تھے، فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ طے یہ پایا کہ بالآخر بے مثال اگلے دن سے روزانہ شام کو بذات خود ہم سے انگریزی، جغرافیہ اور اردو ادب پڑھا کریں گی۔

ہم بڑی بے تابی سے اگلے روز کا انتظار کرنے لگے۔ تمام دن با آواز بلند یہ مصرع گنگنا تے گزر گیا ”لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا“ اور بے مثال آئی گئی۔ وہ آئی تو یوں لگا جیسے ویرانے میں چنکے سے بہار آئی ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ دل کا جاز بیان کرنے کا یہ سنہری موقع تھا مگر اس نے آتے ہی انگریزی کی کتاب کھول لی اور درس دینے کا حکم دیا۔ درس دیتے رہے، درس دیکھتے رہے..... اور انگریزی کا سبق ختم ہو گیا۔

انگریزی کے بعد جغرافیہ کے میدان میں داد تدریس دی۔ اب اردو کی باری تھی۔ اس مضمون سے ہمیں چڑ تھی۔ چنانچہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن بے مثال نے موقع پاتے ہی ایک سوال داغ دیا۔

”آپ کے نزدیک میر بڑا شاعر ہے یا غالب؟“
جواب دیا ”عمر کے لحاظ سے تو میر بڑے شاعر ہیں قد میں شاید غالب میر سے بڑے تھے۔“
اس نے مسکرا کر پوچھا ”میر درد اور میر انیس کی شاعری میں کیا فرق ہے؟“
جواب دیا ”میر درد اور میر انیس کی شاعری میں

یہ چوہدری سے میری آخری ملاقات تھی۔ چند دن کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ہارٹ ایک سے فوت ہو گیا ہے۔ ایک دن سر راہ اس کے بیٹے سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے رکی طور پر تعزیت کی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”والد صاحب بہت خوش قسمت تھے کہ ان کی وفات رمضان المبارک کے مہینے میں ستائیسویں شب کو ہوئی۔ یہ نعمت صرف اللہ کے نیک بندوں ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ والد صاحب نے وصیت کر رکھی تھی کہ ان کے ایصال ثواب کے لیے زیادہ سے زیادہ قرآن مجید کی تلاوت کی جائے چنانچہ ابھی تک ایک لاکھ مرتبہ قرآن مجید پڑھا جا چکا ہے نیز والد کی وصیت کے مطابق چار حفاظ قرآن ان کی قبر پر چھ چھ کھنے تلاوت کرتے ہیں اور یوں چوبیس کھنے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔“ میں نے کہا ”بسم اللہ۔ پھر تو آپ کے والد صاحب سیدھا جنت میں جائیں گے، دوزخ کے فرشتے تو دانت ہی کچکپکاتے رہ جائیں گے!“ بولا ”اس میں کیا شک ہے!“
مجھے بھی اس میں کوئی شک نہیں اگر آپ میں سے کسی کو شک ہے تو وہ ہاتھ کھڑا کرے۔

(عطا الحق قاسمی کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

موصوفہ صوفہ پر

ایک دن چمپل قدی سے فراغت کے بعد گھر آئے تو اپنے کمرے میں اپنی بنت عم کو موجود پایا۔ ان کے سامنے ایک اور موصوفہ صوفہ پر براجمان تھیں۔ انہیں غور سے دیکھا تو دل ستم زدہ کو تمام تمام لیا۔ ارے، یہ تو وہی دوشیرہ تھی جس کی تلاش میں ہم گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہے..... کسی حسینہ سے اتفاق ملاقات کو ”اہل دل“ ”حسن اتفاق“ کہتے ہیں اور یہ ہماری زندگی کا اہم ترین

تہقہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”اور یہ جو تم کروڑوں کے مالک ہونے کے باوجود دیکھو اور بسوں میں دھکے کھاتے ہو کوئی تمہیں تمہارے ایشیئس کے مطابق نہیں ملتا؟ ہر ایک تم سے تو نکار ہی کرتا ہے تو یہ دو نمبر دھندوں سے کمائی ہوئی دولت کس کام کی؟“ اس دفعہ وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا اور کہا ”سرکار! آپ نے کبھی ایک کروڑ روپیہ اکٹھا دیکھا ہے؟“ میں نے جواب دیا ”ابھی تک تو نہیں!“ بولا ”پھر آپ کو کیا یہ دولت کیا چیز ہوتی ہے اور اس میں اضافہ اور اسے سنبھالا کیسے جا سکتا ہے؟“ میں نے کہا ”لو مان لیتا ہوں کہ مجھے اس ”سائنس“ کا کوئی علم نہیں مگر یہ بتاؤ چوہدری کہ کیا تم موت پر یقین رکھتے ہو؟“ بولا ”اس سے انکار کون کر سکتا ہے، یہ تو ایک حقیقت ہے۔“ میں نے پوچھا ”کیا تمہارا آخرت پر بھی یقین ہے؟“ اس نے جواب دیا ”میں ایک لبرل قسم کا شخص ہوں۔ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر مرنے کے بعد حساب کتاب تو ہونا ہے؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”اگر حساب کتاب ہوتا ہے تو پھر یاد رکھو فرشتوں نے تمہاری خاطر مدارت کے لیے ابھی سے دس نمبر تر تیل میں بھگو کر رکھا ہوا ہے“ اس پر چوہدری بھی ہنسا اور بولا ”آپ فکرنہ کریں میں نے بھی حفاظتی بندوبست کر رکھے ہیں۔“ وہ اٹھ کر جانے ہی کو تھا کہ مجھے یاد آگیا کہ اس نے اتنی دولت کے باوجود اپنی حالت قیہوں جیسی بنا رکھنے کے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں۔ میں نے یاد دلایا تو اس نے جواب دیا ”سرکار!“ میں اپنے گھر میں اور دوسرے شہر یا ملک میں جا کر ٹاٹھ باٹھ سے رہتا ہوں۔ یہاں آکر ٹاٹھ باٹھ سے رہوں تو لوگ یا ادھار مانگنے لگتے ہیں اور یا پھر ریغال بنا کر کروڑوں روپے تاوان طلب کرتے ہیں اور سرکار حق حلال کی کمائی اس طرح تو نہیں کمائی جاتی۔“ مجھے اس وقت بہت حزا آیا جب اپنی اس بات پر اسے خود بھی ہنسی آگئی۔

”ضرور ہوتی ہوں گی لیکن میری بیوی ایسی نہیں ہے۔“ میں نے بھی دعوے سے کہا۔ ”یہ تو ناممکن ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس نے پھر دعوئی کیا۔ ”دیکھو، ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں، ہم میں باہمی پیار اور اعتبار بھی ہے پھر کاہے کا خطرہ ہے۔“

ایک بیوی کا دلچسپ ماجرا! جو دن بھر کی گھریلو مشقت سے پریشان تھی

دینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ میرا ہاتھ جھٹک دیتی ہے تو میں پوچھتا ہوں۔

”کیا بات ہے ڈارلنگ؟“

”تم نے مجھے کون سا سکھ دیا ہے“ وہ پھٹ پڑتی ہے۔

”اور میں نے تمہیں دکھ کون سا دیا ہے۔“

”یہ دکھ نہیں تو اور کیا ہے، سویرے ناشتہ بناتی

وہ اچانک باورچی خانے سے باہر آئی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس کا چہرہ دھواں دھواں اور شکوہ شکوہ سا ہو رہا تھا اور شکوہ کے ساتھ غصہ بھی محسوس ہو رہا تھا، پھر اس کا منچلا ہونٹ کپکپانے لگا تھا اور جب اس کا ہونٹ کپکپانے لگتا ہے وہ رونے لگتی ہے اور اس کی آنکھیں پھٹکنے لگتی ہیں۔ میں ایسے میں اس کو بڑی ملامت سے دلاسا



”اچھا“ طوطا چشم“ کا کیا مطلب ہے؟“
”ایسا شخص جس کی آنکھیں سبز ہوں۔“
یہ سن کر وہ بے تحاشہ ہنسی، اتنا ہنسی کہ دو ننھے ننھے آنسو آنکھوں سے نکل کھڑے ہوئے اور گلابی گالوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ یہ منظر کتنا دلغریب تھا ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔ نہ سوال واصل، نہ عرض و غم!!

کل بے مثال کا پہلا پرچہ تھا۔ آج وہ آخری بار پڑھنے آئی۔ ہم نے یہ منہم ارادہ کر رکھا تھا کہ آج بر ملا اظہار تمنا کر دیں گے۔ وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہ تھی۔ وہی جمیل سی آنکھیں، وہی احمر لب اور وہی سرخ و سپید رنگت!!! کچھ دیر فضا میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھا:
”آج کتابیں کیوں نہیں لائیں، کل تو تمہارا پرچہ ہے؟“

وہ الجھتی، شرماتے ہوئے گویا ہوئی:
”میں..... امتحان..... نہیں دے رہی۔“
”مگر کیوں؟“ ہم نے حیرت سے استفسار کیا۔
اس سوال پر بے مثال کا چہرہ شرم سے گھٹا ہو گیا، نظریں جھک گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی:

”بات دراصل..... یہ ہے کہ..... اگلے ہفتے میری..... سش..... شادی ہو رہی ہے۔“ یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ تمام کائنات گھومتی نظر آئی۔
”اچھا! میں چلتی ہوں..... خدا حافظ“

بے مثال نے یہ کہا اور رخصت ہو گئی۔ ہم ہونٹ بے کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے۔

(”کتنی شکستہ“ وحید الرحمن خاں

کی کتاب سے اقتباس)

تعلیم و تعلم کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے آیا کرتی۔ روز ہی ہم حال دل بتانے سے قاصر رہتے..... انگلش اور جغرافیہ کے مضامین میں تو ہم اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے لیکن جب وہ اردو کی کتاب کھولتی تو دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوتی۔ دراصل ہماری اردو اتنی ہی کمزور ہے جتنی کہ ہماری صحت۔ وہ بھی شاید شہزادہ کی غرض سے اوٹ پٹا لنگ استفسارات کرتی۔ ایک دن کہنے لگی:

”امیر مینائی کے حالات زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟“

جواب میں گویا ہوئے ”امیر مینائی بہت دولت مند آدمی تھے۔ غالباً انہوں نے ایک ”مینا“ بھی پال رکھی تھی۔ ابتدا میں وہ بہت غریب تھے۔ اس لیے لوگ انہیں ”غریب مینائی“ کہہ کر پکارتے تھے۔ دن رات کی محنت سے انہوں نے دولت کمائی اور حاسدوں کو جلانے کے لیے اپنا نام ”امیر مینائی“ رکھ لیا۔“

امیر مینائی کے یہ حالات زندگی سن کر اس کے لبوں پر مسکان آ گئی۔ ”اُف، وہ گلاب جیسے ہونٹ اور مولی جیسے دانت!! بے مثال عجیب نظروں سے ہمیں کافی دیر تک دیکھتی رہی..... جانے کیوں؟

میں دن یونہی گزر گئے۔ دس دن بعد اس کے امتحان شروع ہو جائیں گے۔ پھر وہ ہم سے جدا ہو جائے گی..... یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگا۔ کیوں نہ آج اسے صاف صاف دل کا ماجرایا بیان کر دیا جائے، ہم نے اٹل فیصلہ کر لیا..... وہ جب آئی تو بے ہوش کہہ دیا:
”بے مثال تم سے ایک بات کہنی ہے.....“

پہلے آپ یہ بتائیں کہ ”قط سالی“ سے کیا مراد ہے؟

مجبوراً جواب دینا پڑا ”یہ ترکیب ایسے شادی شدہ شخص کے لیے بولتے ہیں جس کی کوئی سالی نہ ہو۔“

ہوں، پھر دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہوں، اس سے فارغ ہوتی ہوں تو رات کا کھانا اور یوں سارا دن باورچی خانے میں گزر جاتا ہے۔“

میں دم سادھے رہتا ہوں۔

”روزانہ ہانڈی اُتارتے وقت میرے ہاتھ جلتے ہیں، کل تو میرا دوپٹہ بھی جل گیا۔“

”اوہو، ڈارلنگ، نائیکون کا دوپٹہ مت اوڑھا کرو۔“

”تو پھر گھر میں اور کون سا دوپٹہ اوڑھا کروں، میری شکل دیکھی ہے تمام دن کام کرتے کرتے کالی سیاہ ہو گئی۔“

”نہیں ڈارلنگ نہیں، یہ تمہارا وہم ہے تم پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوئی جا رہی ہو۔“

”اس لیے کہ باورچی گندے بہت ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ اول نمبر کے بے ایمان

”بھاڑ میں جائے ایسا خُسن، مجھے نہیں چاہیے ایسا خُسن۔“ اس نے تک کر کہا۔

”اچھا تو پھر یوں کرتے ہیں کہ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا تم تیار کر لیا کرو۔ رات کا کھانا ہوٹل میں کھا لیا کریں گے۔“

”اس سے تو خرچ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”اگر کچھ کرنا ہے تو پھر مجھے ایک ملازمہ رکھ دیں جو کھانا بھی پکائے اور دل بھی بہلائے۔“ اس سے تو بات نہیں بنے گی۔

”کیوں نہیں بنے گی۔“

”اس لیے کہ باورچی گندے بہت ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ اول نمبر کے بے ایمان

فرمودات واصف علی واصف

☆ جموئے معاشرے میں عزت کے نام سے مشہور ہونے والا آدمی دراصل ذلت میں ہے۔

☆ معاشرے انسان کو جنم دیتے ہیں اور انسان معاشرے کو جنم دیتا ہے۔

☆ جو کسی مقصد کے لیے مرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہیں اور جو بے مقصد جیتے ہیں وہ جیتے نہیں۔

☆ وہ شخص مر گیا جو کسی کے دل میں نہ رہا۔ آدمی کب مرتا ہے، جب دل سے اترتا ہے۔ زندہ کب ہوتا ہے، جب دل میں اترتا ہے۔

☆ ایسا کوئی نہیں ملے گا جو اسلام کی ایسی تعریف پیش کرے جس سے سارے پاکستانی مسلمان ثابت ہو جائیں۔ ناممکن ہے۔ آدھے لوگ تو ضرور کافر ثابت ہوتے ہیں۔

☆ مسلمان وہ ہے جو ہندو کی نگاہ میں مسلمان ہو۔

☆ پسندیدہ چیز سے جدائی موت ہے۔ جن کی پسندیدہ چیزیں موت سے پرے ہیں ان کو مرنا آسان ہے۔

☆ جن کی پسندیدہ چیزیں یہاں رہ جائیں گی ان کے لیے موت مشکل ہے۔

☆ غصہ ایسا شہر ہے جو تمہارے مستقبل کو بکرا بنا کر کھا جاتا ہے۔

☆ جس سے طاقت ملتی ہے اس سے کمزوری ملتی ہے۔ جس کو سیاست میں عزت ملے گی اس کو سیاست میں ذلت ملے گی۔ جس کو دوست کی طرف سے عزت ملے گی اس کو دوست ہی کی طرف سے ذلت ملے گی اور جس کو اللہ کی طرف سے عزت ملے گی تو اسے عزت ہی ملے گی اور اگر ذلت ہے تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔

ہوتے ہیں۔“

”اور نوکرائیاں کیا کم ہوتی ہیں، ہاتھ تک نہیں دھوئیں، برتن تو بعد کی بات ہے۔“

”ہاں یہ بات ٹھیک تو ہے لیکن سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ پھر میں تو اس پر تھانے دار بنی رہوں گی۔“

”ڈارلنگ، یورپ اور امریکہ میں لوگ اپنا سارا کام خود کرتے ہیں خواہ ان کا سماجی رتبہ جیسا بھی ہو۔“ لیکن وہاں کی تہذیب اور ہے۔

”اچھا بابا میں ہارا، اب ملازمہ کے لیے سر توڑ کوشش کروں گا۔“

ایک دن میرے ایک دوست نے ذکر کیا کہ ایک ملازمہ تو اس کی نظر میں ہے لیکن بھابھی اس کو ہرگز نہیں رکھے گی۔

”کیوں نہیں رکھے گی؟ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا۔“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ ملازمہ بڑی خوب عورت ہے۔“ اس نے وجہ بتائی۔

”لیکن یار ہمیں تو ایسی ہی ملازمہ کی ضرورت ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”عورتیں خوبصورت نوکرائیوں کو پسند نہیں کرتیں۔ خود میری بیوی خوبصورت نوکرائی سے بھاگتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے کہ تمہاری بیوی بہت تنگ دل اور تنگ نظر ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ میری اور تیری بیوی کی بات نہیں ہے تمام عورتیں غشی اور تنگ نظر ہوتی ہیں۔“ اس نے دعوے سے کہا۔

”ضرور ہوتی ہوں گی لیکن میری بیوی ایسی نہیں ہے۔“ میں نے بھی دعوے سے کہا۔

”یہ تو ناممکن ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس نے پھر دعوئی کیا۔

”دیکھو، ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں، ہم میں باہمی پیار اور اعتبار بھی ہے پھر کاہے کا خطرہ ہے۔“

”پھر کوئی خطرہ نہیں، اچھا میں ملازمہ کو بھجوا دوں گا۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر شام سے قبل

ملازمہ ہمارے ہاں آگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بڑی حسین و جمیل عورت تھی لیکن مجھے اس سے

کیا۔ میں اس سے تنخواہ وغیرہ کی بات کرنے لگا تھا کہ بیوی نظر آگئی۔ وہ غسل خانے سے نہا کر باہر آ رہی تھی۔

”لو، ڈارلنگ تمہاری مراد برآئی ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”باہر برآمدے میں بیٹھی ہے۔“

بیوی خوش ہو گئی، میں اس کی خوشی سے خوش ہو گیا، وہ برآمدے کی طرف گئی اور میں گھر سے باہر چلا گیا۔

پھر کافی دیر بعد چراغ جلے میں گھر آیا تو دیکھا کہ بیوی حسب سابق باورچی خانے میں کام کر رہی تھی، میں اس کو باورچی خانے سے باہر لے آیا۔

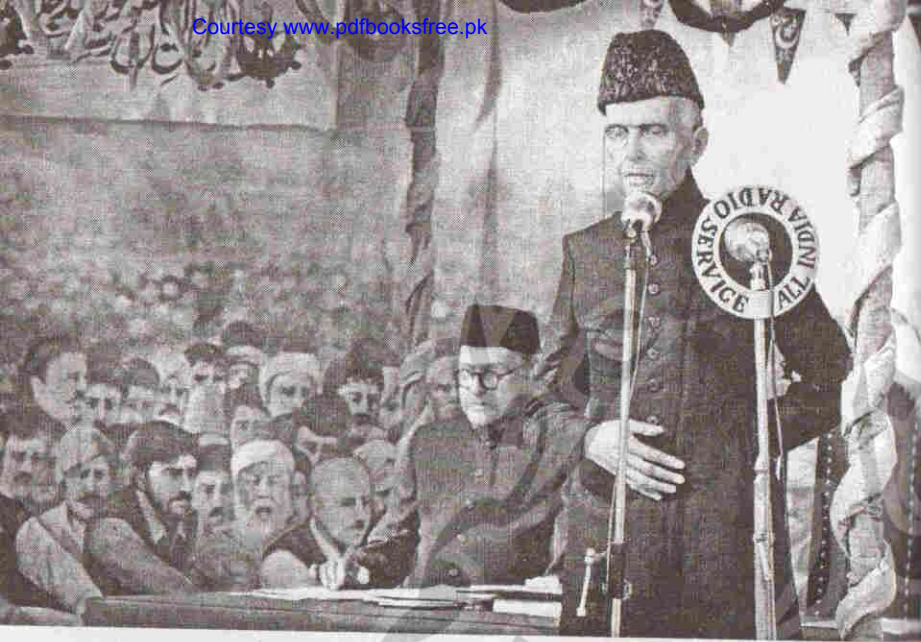
”بس کرو، ڈارلنگ، اب ملازمہ کو کام کرنے دو۔“

”وہ واپس چلی گئی ہے، میں نے اس کو نہیں رکھا۔“ اس نے بڑے مزے سے کہا۔

”کیا... کیا... کیا... کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے بڑبڑا کر، بوکھلا کر پوچھا۔

اس پر وہ شرمائی، لپٹائی، ہچکچائی، آگے آئی، میرے گلے میں بائیں ڈال دیں اور کہا۔

”ڈارلنگ اور کیا کرتی۔ اس کو تو پڈنگ بھی بنانی نہیں آتی تھی۔“



کامران امجد خان

قائد اعظم محمد علی جناحؒ

آپ نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں کانگریس کو محض ہندوؤں کی نمائندہ جماعت قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو جانے کی تلقین کی۔ 1940ء میں آپ نے حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ ان کا سب کچھ ہندوؤں سے جدا ہے، اس لیے انہیں ایک الگ وطن چاہیے۔

برصغیر کے عظیم ترین رہنما محمد علی جناح کے مختصر حالات زندگی

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ 25 دسمبر 1876ء کو مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام پونجا جناح تھا جو کہ ایک ممتاز تاجر تھے اور چمڑے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ آپ کا خاندان گجرات کا تھیاواڑ سے ہجرت کر کے کراچی آیا تھا اور یہیں قائد اعظمؒ کی ولادت ہوئی۔ جس عمارت میں آپ پیدا ہوئے اسے وزیر مینشن کہا

جاتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم الفنس ورناکلر سکول کراچی سے حاصل کی۔ جہاں سے انہوں نے گجراتی کی چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ 4 جولائی 1887ء کو ان کا داخلہ سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں انگریزی کی پہلی جماعت میں ہوا۔ وہاں چند ماہ زیر تعلیم رہنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں

انہیں انجمن اسلام ہائی سکول میں داخل کروایا گیا۔ 23 دسمبر 1887ء کو قائد کراچی واپس آ گئے اور سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل ہوئے۔ یہاں تیسرے درجے تک تعلیم جاری رکھی۔ 5 جنوری 1891ء کو طویل غیر حاضری کے باعث ان کا نام سکول سے خارج کر دیا گیا لیکن ایک ماہ چار دن کے بعد 9 فروری 1891ء کو آپ اسی ادارے میں دوبارہ داخل ہو گئے۔ 30 جنوری 1892ء تک یہاں زیر تعلیم رہے۔ 8 مئی 1892ء سے 31 اکتوبر 1892ء تک چرچ مشن سکول میں چھٹی جماعت کے طالب علم رہے۔ پھر سکول چھوڑ دیا اور والد کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ جنوری 1893ء میں بہ سلسلہ کاروبار بذریعہ بحری جہاز انگلستان تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ کاروبار کیا اور اسی دوران قانون کے مطالعہ کی شرائط پوری کرنے کے لیے حسب دستور ابتدائی امتحان پاس کیا۔ 25 اپریل 1893ء کو ابتدائی امتحان کے لاطینی حصے سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ 29 اپریل 1896ء کو انہوں نے لیکن ان یونیورسٹی سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔

لیکن ان یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا سبب یہ تھا کہ یونیورسٹی میں بنی نوع انسان کو قانون سکھانے والی عظیم ہستیوں میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کا اسم مبارک سر فہرست تھا۔ آپ 1896ء میں واپس وطن تشریف لائے۔ 24 اگست 1896ء کو بمبئی کی عدالت عالیہ میں ان کا نام بطور بیرسٹر درج ہوا اور اس طرح انہوں نے وکالت کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ 1897ء میں بمبئی چلے گئے، بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل میکفرن کی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔ 1900ء میں بحیثیت پریذیڈنٹی ملازمت کی پیشکش ہوئی، یہ عہدہ عارضی تھا۔

☆..... ”اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات و ادبیات اس امر پر شاہد ہیں کہ کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو اپنے مذہب میں بھی جمہوری نقطہ نظر رکھتے ہیں۔“

1917ء میں ہوم رول تحریک میں شرکت فرمائی۔ آپ کی پہلی شادی 1892ء میں لالہ حکیم جی کی بیٹی ایم بی ہائی سے پنسیلی گاؤں میں ہوئی تھی۔ ایم بی ہائی طاعون کی بیماری سے انتقال کر گئیں۔ اس وقت آپ لندن میں زیر تعلیم تھے۔ آپ کی دوسری شادی رجب المرجب 1336ھ بمطابق 1918ء

بمبئی کے ایک پارسی سر ڈسٹریکٹ کی دختر رتن بائی سے ہوئی جو نکاح سے قبل حلقہ گوش اسلام ہو چکی تھیں۔ ان کا اسلامی نام مریم بائی رکھا گیا۔ آپ کی شادی کی خبر سب سے پہلے اخبار ”سینٹس مین“ نے شائع کی۔ رتن بائی کی جانب سے مولانا محمد حسین علی نے بطور گواہ دستخط کئے۔ جس سال آپ کی شادی ہوئی اسی سال جنگ عظیم اول کا خاتمہ ہوا۔ محترمہ مریم بائی کو ”سُر“ کے خطاب سے سخت نفرت تھی۔ آپ کہا کرتی تھیں کہ اگر جناح نے ”سُر“ کا خطاب قبول کیا تو وہ ان سے الگ ہو جائیں گی۔ محترمہ مریم بائی 1929ء میں فوت ہوئیں، ان کے لپٹن سے 15 اگست 1919ء کو ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام دینا جناح رکھا گیا۔ قائد کی کوئی زینہ اولاد نہ تھی۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے 1918ء میں لارڈ رولڈن کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی اور 1919ء میں رولڈ ایکٹ کے خلاف بطور احتجاج امیرل کنسل سے استعفیٰ دے دیا۔ 1920ء میں آپ نے کانگریس سے مکمل علیحدگی اختیار فرمائی اور 1921ء میں آپ نے گاندھی حکمت عملی سے مکمل کھلا اختلاف کیا۔ 1928ء میں شہرہ رپورٹ کی ابتدا ہوئی۔ 28 مارچ 1929ء کو قائد اعظم نے تاریخی پورہ نکات کا اعلان کیا۔

11 ستمبر 1930ء کو مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے چمپی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ 7 ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ آپ نے اس گول میز کانفرنس میں فرمایا:

☆..... ”اب ہم ایک ایسے مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ مسلمانوں کا موقف کیا ہے، تو میں اپنے فرض سے غفلت برتوں گا۔ میں انکشاف الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم سمجھوتہ ہندوستان میں کوئی نیا دستور نافذ کرنے سے پہلے کا ایک ضروری اور ناگزیر مسئلہ اور بنیادی شرط ہے۔ جب تک آپ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دیں جس کی بناء پر وہ حکومت ہند کے آئندہ دستور کے تحت مکمل سلامتی اور خود اعتمادی محسوس کرنے لگیں، جب تک آپ ان کا تعاون، غلطی اور رضامندی حاصل نہ کریں گے، اس وقت تک جو دستور بھی آپ ہندوستان کے لیے بنائیں گے چوبیس گھنٹے بھی نہ چل سکے گا۔“

11 اپریل 1938ء کو آپ نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں کانگریس کو محض ہندوؤں کی نمائندہ جماعت قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو جانے کی تلقین کی۔ 1940ء میں آپ نے حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ ان کا رہن سہن اور تہذیب و تمدن سب کچھ ہندوؤں سے جدا ہے، اس لیے انہیں ایک الگ وطن چاہیے۔ اس سلسلے میں 24 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قرارداد لاہور کو منظور کیا گیا، اس اجلاس میں قائد اعظم نے تاریخی خطاب بھی کیا۔

1942ء میں ہندوستان میں کرپس مشن آیا اور اس نے قائد اعظم سے ملاقاتیں کیں اور پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کیا۔ 18 نومبر 1942ء کو مسلم لیگ کے لائل پور کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ:

☆..... ”مجھے اہل دیہات کی غربت اور مفلوک الحالی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے، میں نے سفر کے دوران جب ریلوے سٹیشنوں پر پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے گروہ دیکھے تو مجھے ان کے افلاس سے سخت دکھ ہوا۔ پاکستان کی حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہو گا کہ ان لوگوں کا معیار زندگی بلند کرے

بلکہ زندگی سے شاد ہونے کے سامان ہم پہنچائے۔“
26 جولائی 1943ء کو ایک خاکسار ریٹن صابر
مزگئی نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن آپ بال بال
بچ گئے۔ 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
میں خطاب کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے فرمایا:

☆.....”پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا،
جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس
زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت
بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کا بنیاد
کلمہ تو حید ہے، وطن نہیں اور ہندوستان کا جب پہلا
فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ اس
جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم
وجود میں آ گئی۔“

28 جون 1945ء کو آپؒ نے لاہور پول کی
شملہ کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ اکتوبر 1945ء کو
آپؒ نے بلوچستان کا دورہ کیا اور 21 نومبر
1945ء کو پشاور میں خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ:
☆.....”ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں نہ
انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو بننے پر۔ ہم دونوں کے
خلاف جنگ کریں گے خواہ وہ آپس میں متحد کیوں نہ
ہو جائیں۔“

29 جولائی 1946ء کو وزارتِ مشن کو مسترد
کرتے ہوئے آپؒ نے راست اقدام کا اعلان فرمایا
جس پر تمام خطاب یافتہ محرموں نے اپنے خطابات
واپس کر دیے۔ 16 اگست 1946ء کو لاہور ڈیول
کی طرف سے عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا
گیا، قائد اعظمؒ نے اس اعلان پر احتجاج کیا اور مسلم
لیگ کی اس عبوری حکومت میں شمولیت کا مطالبہ کیا۔
دسمبر 1946ء کو آپؒ برطانوی حکومت کی دعوت پر
لندن تشریف لے گئے اور واپسی پر مفتی اعظم امین
حسینی نحاس پاشا اور عزام پاشا سے ملاقاتیں کیں۔

مارچ 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن وائسرائے اور گورنر
جنرل ہندوستان بن کر آیا تو آپؒ نے وائسرائے
سے ملاقاتیں کیں اور پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔
12 اپریل 1947ء کو کانگریس کی طرف سے بنگال
اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ 3 جون
1947ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس
میں آپؒ نے تقریر فرمائی۔

14 اگست 1947ء کو پاکستان کا قیام عمل میں
آیا۔ 15 اگست کو قائد اعظمؒ نے پاکستان کے پہلے
گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا، لاہور
ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر عبدالرشید نے ان سے
حلف لیا۔ حلف کے یہ الفاظ تھے:

☆.....”میں محمد علی جناح قانون کے مطابق
قائم ہونے والے پاکستانی دستور، حکومت سے سچی
عقیدت اور وفاداری کا عہد مصمم کرتا ہوں اور میں
عہد کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے گورنر جنرل کی
حیثیت سے شہنشاہ معظم جارج ششم اور ان کے ولی
عہدوں اور چانشینوں کا وفادار رہوں گا۔“

قائد اعظمؒ محمد علی جناح نے یوم آزادی کے سلسلے
میں 15 اگست 1947ء کو ریڈیو پاکستان سے پہلی
بار خطاب فرمایا۔

قائد اعظمؒ کا لفظ سب سے پہلے دہلی کے سر
روزہ اخبار ”الامان“ نے شائع کیا۔ پاکستان کی
دستور ساز اسمبلی نے 15 اگست 1947ء کو محمد علی
جناح کے لیے قائد اعظمؒ کا سرکاری خطاب منظور کیا۔
سب سے پہلے محمد علی جناح کو مظہر الدین نے
قائد اعظمؒ کہا۔

18 اگست 1947ء کو بحیثیت گورنر جنرل آپؒ
نے قوم کے نام عید کا پیغام دیتے ہوئے فرمایا:
☆.....”اس میں شک نہیں کہ ہم نے
پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے۔

عظیم الشان



مثال کلاس

تسليم کوثر چیمہ

کئے ہوئے بال، بلیو جینز اور ہائی ٹیک سوئیر میں وہ پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آگئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت پروگریسو اور ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہے۔ ہم تو معمولی سے مڈل کلاس لوگ ہیں۔ پتہ نہیں یہ شادی کیسے ہوگی۔ میں اور گولڈی باجی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یہی سوچ رہے تھے۔

دولڑکیوں کی کہانی، خواب دونوں کے ایک سے تھے مگر تعبیریں بالکل مختلف!

دیکھنے کو ملتا ہے۔ گولڈی باجی پڑھائی میں بہت لائق، شکل و صورت میں بہت حسین، کردار کی بہت اعلیٰ اور زبان اتنی شیریں کہ لگے انوں میں شہد گھل رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فرصت میں تخلیق کیا تھا۔ طبیعت میں بہت سادگی، نہ زیور کپڑوں کا شوق نہ میک اپ سے رغبت نہ فیشن سے دلچسپی۔ ان کو

بچپن میں نام تو ان کا ستارہ رکھا گیا تھا مگر تائی امی ان کو پیار سے سونے کی ڈلی کہہ کر بلاتیں تو تایا ابو نے ان کو پیار سے گولڈی کہنا شروع کر دیا اور یوں خاندان بھر میں وہ گولڈی کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ وہ ہمیشہ سے میرا آئیڈیل رہی ہیں۔ کسی انسان میں اتنی ساری خوبیوں کا اکٹھے ہونا بہت کم

زیارت تشریف لے گئے۔ کرمل الہی بخش، ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ڈاکٹر محمد علی مستری اور ڈاکٹر محمد اشرف عطا آپ کے خصوصی محفلین رہے۔ آپ کا وزن 112 پاؤنڈ تھا جبکہ آخری دنوں میں صرف 70 پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ 11 ستمبر 1948ء کو آپ بذریعہ ہوائی جہاز واپس کراچی تشریف لائے اور اسی شب دس بج کر پینتالیس منٹ پر آپ انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ کی عمر 71 سال 8 ماہ اور 16 دن تھی۔ آپ قیام پاکستان کے بعد ایک سال 27 دن زندہ رہے۔ آپ کی نماز جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔

آپؐ کی نماز جنازہ میں چار لاکھ سے زیادہ
فرزندِ اسلام نے شرکت کی اور چالیس روز تک
سوگ منایا گیا۔ آپؐ کے آخری الفاظ تھے.....
”اللہ..... پاکستان“

محمد علی جناحؒ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے دوسرے بھائی احمد علی اور بندے علی غیر معروف رہے جبکہ ایک بہن فاطمہ جناحؒ تو ساری زندگی ان کے ساتھ رہیں جبکہ باقی دو بہنیں مریم اور شیریں غیر معروف رہیں۔ قائد اعظمؒ کی شخصیت پر پہلا سیاسی اثر دادا بھائی نوروجی کا ہوا جو انگلستان میں اس وقت پارلیمانی انتخاب میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے رہے تھے۔ آپؒ نے دادا بھائی کی انتخابی مہم میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ملت اسلامیہ کے لیے ایک علیحدہ وطن کا حصول صرف اللہ کی رضا اور قائمہ اعظم کی مشیت و روضت کے نتیجے میں ہوا۔ انہوں نے ہمیں آزادی کی جو نعت دلائی، قوم اس کے لیے ہمیشہ ان کی شکر گزار رہے گی۔

اب بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آ پڑی ہیں اور جتنی ذمہ داریاں ہوں، اتنا ہی بڑا ارادہ، اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں، جو کوششیں کی گئی ہیں، پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی کم از کم اتنی ہی قربانیاں دینا اور کوششیں کرنا پڑیں گی۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آپہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت و فطانت اس بار عظیم کو آسانی سے برداشت کرے گی اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام مشکلات کو آسانی سے جھلے گی۔“

24 اکتوبر 1947ء کو آپؐ نے قوم کے نام
عیدالاضحیٰ کا پیغام دیا۔ 30 اکتوبر 1947ء کو پنجاب
یونیورسٹی کے کھلے میدان میں قوم سے خطاب فرمایا۔
23 جنوری 1948ء کو بحری بیڑہ (دلاور) کا افتتاح
کیا۔ قائد نے 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار
ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے پیغمبرِ آخر
الزماں حضرت محمد ﷺ کو نذرانہ عقیدت ان الفاظ
میں پیش کیا:

☆.....” ”آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کی عزت و تکریم کروڑوں عام انسان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ ﷺ کے سامنے سر جھکا تی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار، بندۂ ناجیز اتنی عظیم، عظی موں کی بھی عظیم ہستی کو بھلا کیا اور کسے نذرانہ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ عظیم مصلح تھے، عظیم رہنما تھے، عظیم قانون دان تھے، عظیم سیاست دان تھے، عظیم حکمران تھے۔“

14 جولائی 1948ء کو آپؐ بغرض صحت

تو ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں خوشیاں اور ستارہ کو محبتیں بانٹنے کے لیے بھیجا ہے۔“ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے۔

”نہیں مراد بھائی، اللہ تعالیٰ نے گولڈی باجی کو اردو ادب کی خدمت کے لیے بھیجا ہے۔ آپ ان کی ادبی صلاحیتوں اور ادبی خدمات کو بھی سراہا کریں۔“ وہ میرے مشورے پر ہنس دیے اور گولڈی باجی کے چہرے پر حیا کی سرخی اور بڑھ گئی۔

رات کو تائی امی نے گولڈی باجی سے بریانی پکوائی۔ مراد بھائی پھپھو اور پھوپھا جان کے ساتھ چند سال کراچی کیا رہ لیے وہ بریانی اور نہاری کے دیوانے تھے۔ پنجاب کے سارے کھانے تو تائی امی بہت اچھے پکاتی تھیں مگر بریانی نہیں پکا سکتی تھیں۔ گولڈی باجی نے اپنی کراچی والی دوست شہناز سے خاص طور پر بریانی اور نہاری سیکھی تھی۔ ہر ہفتے کو وہ تائی امی کے کہے بغیر ہی پکتن میں گھس کر کوکنگ کر دیتیں اور یہ جانتے ہوئے کہ مراد بھائی ضرور چکر لگائیں گے اور کھانا کھائیں گے تو وہ بریانی ضرور پکاتیں۔ مراد بھائی کھانا کھاتے ہوئے مجھے مشورہ دیتے۔

”یعنی تم گولڈی سے بریانی ضرور سیکھو بہت کام آئے گی۔“

”فی الحال تو آپ اس کی بائیولوجی، فزکس اور کیمسٹری پڑھنے میں مدد کریں تاکہ ایف ایس سی میں اتنے اچھے نمبر آجائیں کہ وہ میڈیکل میں جا سکے۔“ پھر گولڈی باجی نے مجھے کنیرڈ کالج میں داخل کروادیا۔ پڑھائی مشکل تھی۔ ایف ایس سی میں مجھے بائیولوجی بہت مشکل لگ رہی تھی۔ مراد بھائی نے مجھے پڑھانا شروع کیا تو میرے ذہن کی بند گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ گولڈی باجی بی اے آنرز کے ایم اے او کالج میں اردو ادب میں ایم اے

سہارتی ہے۔“ میری نظریں ان کے سیاہ ریشمی بالوں پر ٹھہر گئیں۔ وہ بال کسکا کر لمبی چوٹی کوندھ کر کھڑی ہوئیں تو میں مسحوری ہو گئی۔

”گولڈی باجی اگر میں اپنے کئے ہوئے بال لیے کر لوں تو آپ مجھے چوٹی کرنا سکھائیں گی۔“

”ارے ہاں یعنی میں تم سے یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم اب بال مت کٹوانا ان کو بڑھنے دو۔ لڑکیوں کی کمر پر چوٹی کا کھن کچھ الگ ہی نظر آتا ہے۔“

بہت عرصہ سے مجھے اندازہ تو تھا کہ پھپھو نے مراد بھائی سے گولڈی باجی کا رشتہ اس لیے ہی طے کیا تھا کہ مراد بھائی کو ان کی مشرقیت بہت پسند تھی۔ سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں لگا کا جل، نازک کلائیوں میں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں، پتلی کمر پر لہراتی لمبے بالوں کی چوٹی۔ مراد بھائی کو اپنی مشرقی قدروں سے پیار تھا۔ مشرقی اقدار سے محبت تو ان کی آنکھوں سے چمکتی تھی۔ وہ کنگ ایڈورڈ میں پڑھ رہے تھے۔ رہائش تو ان کی ہوٹل میں تھی مگر ہر ہفتے ان کا تایا ابو کے ہاں چکر ضرور لگتا تھا۔ مراد بھائی کو سی ایس ایس کر کے فارن سروس میں جانے کا شوق تھا مگر جب ان کو پتہ چلا کہ گولڈی کو ڈاکٹر بہت پسند ہیں تو انہوں نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ کر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا اور اب وہ تیسرے سال میں تھے۔ مجھے لاہور میں پا کر انہوں نے بڑی گرجوئی کا اظہار کیا۔

”یعنی تم نے اچھا کیا ہے لاہور آگئی ہو اب تو تمہارے قہقہے سننے کو ملیں گے۔ تم تو LAUGHING MACHINE ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہنسنے ہنسانے کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے۔ ہر انسان کے دنیا میں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد

”یعنی تم اب بھی قہقہوں کے پیچھے بھاگتی ہو اور پھولوں کی پتلیاں اپنی کتابوں میں رکھتی ہو؟“

”ارے نہیں گولڈی باجی وہ سب کچھ میں نے چھوڑ دیا ہے۔ اب تو میں افسانے اور کہانیاں پڑھتی ہوں۔ خود میرا لکھنے کو بھی بہت دل چاہتا ہے مگر مجھے آپ کی طرح لکھنا تو نہیں آ سکتا۔ یہ تو خدا داد صلاحیتیں ہوتی ہیں۔“

”یعنی میرے پاس رہو گی تو سیکھ جاؤ گی۔“ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔

شام کو گولڈی باجی نے میرے سامنے رسالوں کا ڈھیر لگا دیا۔

”یعنی ان سب میں میرے افسانے چھپے ہیں تم پڑھو گی تو مجھے اپنی رائے دینا۔“

رسالوں کا اتنا انبار دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ میں اپنے سارے کام چھوڑ کر رسالوں میں گم ہو گئی۔ گولڈی باجی نے اتنے خوبصورت افسانے لکھے تھے کہ پڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی ان کو اتنے خوبصورت الفاظ کہاں سے مل جاتے ہیں۔ لفظوں کا انتخاب، ذہنی سوچ کی بلندی اور اس کا اظہار ان پر ختم تھا۔ اتنے خوبصورت جذبات کا اظہار اتنے دلکش طریقے سے کرنے کا عطیہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا ورنہ ہمارے خاندان میں تو کسی کا اتنا ادبی ذوق نہیں تھا۔ یہ سن کر گولڈی باجی کی خدا داد صلاحیت تھا اور وہ اس کی حقدار بھی تھیں۔ میں ان کے افسانے پڑھتی جاتی اور ان کی ادبی صلاحیتوں کی معترف ہوتی جاتی۔ میں رسالے پڑھتے پڑھتے ہی بستر پر سو گئی۔ شام کو میری آنکھ کھلی تو وہ نہا کر اپنے بال کسکا رہی تھیں۔

”گولڈی باجی آپ کے بال اور زیادہ لمبے ہو گئے ہیں، آپ کی نازک گردن ان کا بوجھ کیسے

صرف لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کو اردو ادب سے اتنی محبت تھی اور کہانیاں اور افسانے لکھنے کا شوق تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ سکول سے جب بھی مجھے گرمیوں کی چٹیاں ہوتیں تو مجھے ایک ہی نشئی ہوتی کہ یا تو گولڈی باجی ہمارے پاس فیصل آباد آجائیں یا پھر امی ابو مجھے ان کے پاس لاہور بھیج دیں۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ میں پیار کے اس سمندر میں مکمل ڈوب جاتی۔ جب میں سکول کھلنے پر واپس فیصل آباد آتی تو ان کی خوبصورت باتیں میرے ذہن پر سوار ہوتیں۔ میں نے کتنی بار ابو سے کہا کہ مجھے پڑھنے کے لیے لاہور بھیج دیں۔ وہ ہر بار وعدہ کرتے کہ امی کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔

جب میں نے میٹرک میں ٹاپ کیا تو ابو نے مجھے ایف ایس سی کرنے کے لیے لاہور بھیجنے کا وعدہ نبھا دیا اور مجھے تایا ابو کے پاس لاہور بھیج دیا کہ وہاں گولڈی باجی پڑھائی میں میری مدد کریں گی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا میری تو برسوں کی مراد پوری ہو گئی۔ گولڈی باجی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر بہت پیار کیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ”امی یعنی میرے ساتھ میرے کمرے میں رہے گی۔ بچی ہی تو ہے چھوٹے کمرے میں اکیلی کیسے رہے گی۔ میں تو اس کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔“ انہوں نے تائی امی کو اپنا فیصلہ سنا دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے اپنی الماری کا ایک حصہ میرے لیے خالی کر دیا بلکہ میری سائینڈ ٹیبل پر میری سہولت کے لیے سنڈی لیپ بھی رکھ دیا۔ میرا سامان کھول کر انہوں نے سلیپے سے رکھ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لان میں لے آئیں۔

کرنے میں جت گئیں۔ ساتھ ساتھ ان کا لکھنا لکھنا جاری رہا۔

گولڈی باجی کے اکلوتے بھائی یعنی تایا ابا کے لاڈلے بیٹے اور میرے کزن طاہر بھائی، ایل ایل بی کر کے لندن بیرسٹری کرنے کیا گئے تھے کہ وہاں سے آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ جب بھی تایا ابواں کو فون کر کے واپسی پر زور دیتے تو وہ مزید آگے پڑھنے کی آڈے لیتے اور لندن میں قیام بڑھانے کا کوئی جواز پیش کر دیتے۔ تایا ابوا کو مجبوراً ماننا پڑتا۔

گولڈی باجی اکثر میرے ساتھ ذکر کرتیں کہ طاہر وہاں اپنی کسی پاکستانی کلاس فیلو سے دل لگا بیٹھا ہے۔ جب وہ آنے دے گی تب ہی آئے گا۔ ”تو آپ اس لڑکی سے طاہر بھائی کی شادی کیوں نہیں کروادیتیں۔“ میں ان کو مشورہ دیتی۔ ”جب وہ واپس آکر ابو سے کھل کر بات کرے گا تبھی کچھ ہو سکے گا۔ فون پر تو یہ مسئلے حل نہیں ہوتے اور پھر لڑکی دیکھے اور خاندان جانے بغیر تو کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔“

میں اور گولڈی باجی اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف رہیں۔ دن اور سال منزل کی طرف رواں دواں مسافروں کی طرح آگے بڑھنے لگے۔ میرے ایف ایس سی کے فائنل ختم ہوئے تو گولڈی باجی نے ایم اے اردو کر لیا۔ ابھی ہم دونوں فارغ ہی ہوئی تھیں کہ اچانک خبر ملی طاہر بھائی واپس پاکستان آ رہے ہیں۔ مراد بھائی نے ایم بی بی ایس کر لیا تو وہ میو ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنے لگے۔ وہ بھی طاہر بھائی کی واپسی کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ہم سب طاہر بھائی کو لینے انیورسٹی پہنچے تو وہ سیاہ سوٹ میں باہر نکلے۔ پہلے سے زیادہ وجہ اور شاندار لگ رہے تھے۔ سب کو

مل لیا تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ”ارے تم کیسی ہو اور کتنی بڑی ہو گئی ہو اور لاہور میں کیا کر رہی ہو۔“ انہوں نے مجھے پیار سے چمکی دی۔

”طاہر بھائی میں تو دو سال سے یہیں ہوں۔ ابھی ایف ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ مارکس اچھے آ گئے تو فاطمہ جناح کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے۔“

”تو کیا تمہیں مراد کو دیکھ کر ڈاکٹر بننے کا شوق چڑیا ہے؟“

اپنا نام سن کر کوٹنے میں ستون کے ساتھ کھڑے مراد بھائی سامنے آکر طاہر بھائی کے گلے لگ گئے۔ ”پتہ ہے طاہر بھائی کہ مراد بھائی نے مجھے ایف ایس سی میں ٹیوشن پڑھائی ہے۔ اتنا اچھا پڑھاتے ہیں کہ ان کو تو میڈیکل کالج میں پروفیسر ہونا چاہیے۔“ مجھ سے اپنی تعریف سن کر مراد بھائی جھینپ گئے۔

انیورسٹی سے گھر پہنچنے ہی گولڈی باجی نے طاہر بھائی کی اچھی طرح کلاس لی۔

”اچھا تو بیرسٹر صاحب اب آپ اس لڑکی سے مجھے ملوائیں تاکہ میں ای ایو کو قائل کر سکوں۔“

”فی الحال تو تم تصویر دیکھو ملاقات کل کرواؤں گا۔“ ساتھ ہی انہوں نے اپنے بٹوے سے تصویر نکال کر سامنے رکھ دی۔ ”نام مہرین ہے مگر پیار سے میری کہلاتی ہے۔“

کئے ہوئے بال، بلیو جنز اور ہائی نیک سوئٹر میں وہ پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت پروگریسو اور ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہے۔ ہم تو معمولی سے مڈل کلاس لوگ ہیں۔ پتہ نہیں یہ شادی کیسے ہوگی۔ میں اور گولڈی باجی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یہی سوچ رہے تھے۔

دو تین دن بعد مہرین کے ممی پاپا ہمارے ہاں چلے آئے۔ تائی امی اور تایا ابو کے ساتھ بند کمرے میں میٹنگ ہوئی۔ مہرین کے گھر والوں کے جانے کے بعد تائی امی کچھ پریشان اور اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھیں۔ میرے دل میں پھانس سی چھ گئی۔ لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ تایا ابو کی طاہر بھائی سے علیحدگی میں کچھ رازدارانہ باتیں ہوئیں مگر مکمل کر کچھ سامنے نہ آیا اور پھر شام کو میں فریج سے پانی کی بوتل نکال رہی تھی کہ میں نے تائی امی کو تایا ابو سے بات کرتے سنا تو میں ٹھک گئی۔

”خدیجہ بیگم میری مانو تو تم گولڈی کو منالو۔ مراد تو ڈاکٹر بن چکا ہے اس کو خاندان کے کتنے لوگ اپنی بیٹی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس کو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے مگر رضا صاحب نے مجھے آج پھر فون کر کے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے پر زور دیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ہمیں ایک ہی صورت میں دینے کو تیار ہیں کہ ہم گولڈی کا رشتہ انہیں دے دیں۔ ان کا بیٹا تو تم نے دیکھا ہے۔ لندن سے سی اے کر کے آیا ہے۔ وہ شادی کے بعد لندن میں ہی سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ خاندانی ریمس لوگ ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ہاں کر دیں طاہر کی خوشی کی خاطر گولڈی مان ہی جائے گی۔“ تایا ابو کی رضامندی پر میں حیرت سے ساکت ہو گئی۔

میں پانی کی بوتل دہیں رکھ کر گولڈی باجی کے کمرے میں بھاگی۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں ان کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھن تھی۔ جیسے ہی انہوں نے نماز ختم کر کے دعا مانگی اور جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھی تو میں نے تایا ابو اور تائی امی کی گفتگو لفظ بہ لفظ ان کو سنا دی۔ ”نہیں یعنی تم پریشان نہ ہو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ابو اپنی زبان سے

اگلے پورے ہفتے تک گھر بھر میں یہی موضوع زیر بحث رہا کہ بات کیسے شروع کی جائے کہ مہرین کے گھر والوں نے خود ہی ہم سب کو اپنے گھر کھانے پر بلالیا۔ جب ہم سب ان کے گھر پہنچے تو وہ ایم ایم عالم روڈ کی سب سے الگ اور منفرد سی بہت شاندار کوٹھی تھی۔ پورچ میں دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر چیز سے امارت فیک رہی تھی۔ تائی امی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تایا ابو سے بہت کچھ کہہ ڈالا۔ وہ خواخواہ ہی ان لوگوں کی امارت سے متاثر ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھیں۔ گولڈی باجی اور میں منتظر تھے کہ طاہر بھائی کی پسند پر نظر پڑے تو کچھ پتہ چلے۔ تھوڑی دیر میں مہرین آ گئی۔ وہ تصویروں سے زیادہ خوبصورت اور ماڈرن تھی مگر اتنی محبت اور گرجوشی سے ملی کہ ہم سب کو پسند آ گئی۔ پھر ابھی اس کے ممی ڈیڈی تایا ابو کو اپنے یورپ اور امریکہ کے بزنس سے متاثر کر رہے تھے کہ اچانک ایک بے حد خوبصورت لڑکا اندر آ گیا۔ وہ غالباً مہرین کا بھائی تھا۔ گولڈی باجی میرے بالوں میں اسکو پی لگا رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھکا اور پھر بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ رشتے کی بات کچھ چلی مگر کیا طے ہوا کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رات گئے ہم واپس آئے تو طاہر بھائی ہماری رائے پوچھنے چلے آئے۔

”یعنی تمہیں مہرین پسند آ گئی گی اور گولڈی تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”طاہر بھائی مجھے اور گولڈی باجی کو مہرین بہت پسند آتی ہے بس اب جلدی سے پہلے منگی اور پھر شادی ہو جانی چاہیے۔ آپ کی شادی ہو گی تو گولڈی باجی کی باری آئے گی۔ آپ نے ان کا راستہ ہلاک کر رکھا ہے۔“ طاہر بھائی میرے ساتھ قہقہے لگاتے رہے۔

پھرنے والے نہیں اور پھر دیکھو نا وہ تو اتنے امیر لوگ ہیں، ہم ٹڈل کلاس لوگ ان لوگوں میں کہاں فٹ ہو سکتے ہیں۔ طاہر کی بات الگ ہے اسے تو ہمیشہ ہی اونچی آڑ ان کا شوق رہا ہے وہ تو اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ان امیر لوگوں میں فٹ بھی ہو جائے گا مگر میں تو پرانی روایات اور پرانی قدروں کے ساتھ چلی بڑھی ہوں۔ میری سوچ بہت مختلف ہے۔“ بڑے سکون اور محل سے بات کر کے انہوں نے مجھے مطمئن کر دیا۔

دو تین دن بعد میں اور گولڈی باجی درزی سے کپڑے لے کر انارکلی سے نکل رہی تھیں کہ میو ہسپتال سے نکلتے ہوئے اچانک مراد بھائی مل گئے۔ ”یعنی بڑی شاپنگ ہو رہی ہے لگتا ہے طاہر کی منگنی کی تیاری ہو رہی ہے اور ہاں ستارہ مجھے آپ سے بھی ایک ضروری بات کرنی تھی۔ میں کل شام کو چکر لگاؤں گا۔“ اور وہ یلکھت خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ شام کو تایا ابو اور تائی امی کہیں چلے گئے۔ میں اور گولڈی باجی لان میں بیٹھے کپ شپ لگا رہے تھے کہ مراد بھائی آگئے۔ میں چائے بنانے اندر آگئی۔ چائے کی ٹرے لے کر میں باہر پہنچی تو مراد بھائی غائب تھے۔

میں نے چائے گولڈی باجی کو دے کر پوچھا ”مراد بھائی کہاں گئے ہیں۔ ان کی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”یعنی مراد چلا گیا ہے۔ بات وہی ہے، مہرین کے گھر والوں نے طاہر کے رشتے کے ساتھ میرے رشتے کی شرط عائد کر دی ہے۔ ابو نے مراد سے بات کر لی ہے۔ اس نے ابو سے کہہ دیا ہے کہ وہ میرا رشتہ مہرین کے بھائی سے کر دیں۔“

”مراد بھائی اتنی آسانی سے کیسے مان گئے ہیں۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز تو اٹھاتے، احتجاج تو

کرتے۔“

”ہم ٹڈل کلاس گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں اپنے والدین کے ہر فیصلے کے پابند رہتے ہیں۔ یہی ہم لوگوں کی قدریں ہیں۔“ گولڈی باجی بات کرتے ہوئے چائے یوں پی رہی تھیں جیسے کھونٹ کھونٹ صبر گلے سے اُتار رہی ہوں اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ تباہاوت نے امیر اور بڑے لوگوں کے آگے انکار نہ کر کے اور انہوں نے طاہر بھائی کی خوشی کی خاطر ان کا رشتہ مہرین سے اور گولڈی باجی کا رشتہ مہرین کے بھائی جیل سے کر دیا۔

منگنی کی شاندار رسمیں ہوئیں۔ ہیروں کے سیٹ سے شروعات ہوئی اور گھر میں قیمتی زیورات اور ملبومات کے ڈھیر لگ گئے۔ گولڈی باجی خاموش کھڑی بی رہیں۔ انہوں نے زیور پکڑوں کے معاملے میں نہ اپنی پسند کا اظہار کیا نہ اپنے لیے شوق سے کچھ خریدا۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ تائی امی ان کو ہر روز بازار کے چکر لگواتیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھتیں اور میں نے نوٹس کیا تھا وہ سب کچھ تائی امی کی پسند پر چھوڑ دیتیں۔

”امی آپ کو جو کچھ اچھا لگتا ہے اپنی مرضی سے خرید لیں مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔“

”گولڈی باجی یہ سب آپ نے استعمال کرنا ہے کل کر اپنی پسند ناپسند تو بتایا کریں۔“ میرے اصرار پر وہ بھی بھی سی ہنسی دیں۔

”میں تو ان کی ہر خوشی پر خوش ہونے والی ہوں۔“ ان کے لہجے میں دکھ سے زیادہ تھی تھی۔

مہرین تو اپنی می کے ساتھ اپنی شادی کی شاپنگ کرنے سٹاپور اور ہانگ کا ٹنگ چلی گئی۔ شادی کی تیاریاں زور پکڑ گئیں۔ اس دوران مراد بھائی تصویر سے بالکل غائب رہے البتہ شادی کے دن قریب آئے تو مراد بھائی تایا ابو کا ہاتھ بٹانے چلے آئے۔

”وجہ تسمیہ“

ایک مسافر ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے ایک خوش پوشاک لڑکے کو دیکھتے ہوئے خوشی سے پوچھا:

تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکا: اشرفی لال۔

مسافر: باپ کا نام؟

لڑکا: گنی لال۔

مسافر: رہتے کہاں ہو؟

لڑکا: دولت پور میں۔

مسافر: خوشی اور حیرت سے، کیا کام کرتے ہو؟

لڑکا: دھیرے سے: بھیک مانگتا ہوں۔

خون کے آنسو بوند بوند بن کر دل میں جذب ہوئے چلے گئے۔ میں فاطمہ جناح کالج سے ایم بی بی ایس فائنل دے کر فارغ ہو گئی۔ ایک روز اچانک ہی مراد بھائی ملنے چلے آئے۔

”یعنی میں نے یو ایس ایم ایل ای (USMLE) پاس کر لیا ہے۔ اگلے ماہ میں سپیشلائزیشن کے لیے امریکہ جا رہا ہوں تم سناؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔“

”میں تو رزلٹ آنے پر گنگرام میں ہاؤس جاب کروں گی۔ تائی امی کے پاس لاہور ہی میں رہوں گی اور ہاں مراد بھائی آپ کی شادی کا کیا ہوا۔ وہ تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ آپ کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر شادی کر لیں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ آپ کا خیال بھی رکھے گی اور کمپنی بھی دے گی۔ آپ کا دل بھی لگا رہے گا۔“ وہ میرے مشورے پر بولے کچھ نہیں صرف ہنس دئے۔ پھر ایک ہی وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔

اگر کچھ پہننا ہے تو ڈائمنڈ جیولری پہنا کرو۔ انہوں نے کالج کی چوڑیاں کچرے میں ڈال دیں۔ پھر جمیل بھائی کو ان کی پوری آستینوں پر اعتراض ہوا۔ ”ستارہ مجھے بار بار یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں نے مڈل کلاس لڑکی سے شادی کر کے بہت غلطی کی ہے۔ تم خوبصورت ہو سیلیو لیس شرٹس پہنا کرو۔ ماڈرن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے تو اعلیٰ سوسائٹی کے آداب بھی سیکھو۔ یہ سر پر دوپٹہ، پوری آستینیں، کالج کی چوڑیاں اور مٹی چوٹی اور اردو ادب سے دلچسپی یہ سب مڈل کلاس کے شوق ہیں اور ہمارے ہاں ان چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں۔“ پھر جمیل بھائی نے گولڈی باجی کو اپنے رستے پر ڈال دیا۔ اپنے شوہر کی خوشی کی خاطر گولڈی باجی نے اسے سارے ارمان اور شوق پھیل دیئے۔ اپنا گھر بسانے کی خاطر وہ دیے ہی بنی چلی گئیں جیسے جمیل بھائی ان کو دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اردو افسانے لکھنے چھوڑ دیئے۔

اپنے بال کٹوا دیئے۔ کاجل لگانا چھوڑ دیا۔ کالج کی چوڑیاں اتار دیں۔ انہوں نے سیلیو لیس بلاؤز اور کپڑی پہننی شروع کر دی۔ ڈرائیونگ سیکھ لی۔ انگلش کی کلاسز لے کر بولنے اور لکھنے پڑھنے کی جھجک دور ہو گئی۔ انہوں نے خود کو شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ اس بار جو، ان کا مختصر سلاخا آقا تو میرا دل ڈکھ سے بھٹ گیا۔ انہوں نے صرف دو لائینیں ہی لکھی ہوئی تھیں۔

”یعنی میں وہ عورت نہ بن سکی جو میں بننا چاہتی تھی۔ اب میں وہ عورت بن گئی ہوں جو جمیل مجھے بنانا چاہتا تھا۔“

کاغذ کے سینے پر لکھی ہوئی دو لائینیں مجھے سارے اردو ادب پر بھاری لگیں۔

میرا دل گولڈی باجی کے لیے توڑ پڑھا۔ ان کے ساتھ ساتھ اپنی بے بسی کا بھی احساس ہونے لگا۔

چلی گئیں۔ مجھے رزلٹ اچھا آنے پر فاطمہ جناح کالج میں داخلہ مل گیا اور میں میڈیکل کے راستے پر چل نکلی۔ وقت دے باؤں گزرتا گیا۔ تایا ابوا اور تائی امی بہت خوش تھے کہ دونوں بچے اچھی طرح سیکھ رہے ہیں۔

اور پھر گولڈی باجی کے لیے لیے خط آنے شروع ہو گئے۔ گولڈی باجی لندن کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے خطوط میں مجھے بین السطور کچھ اُداسی اور دکھ کا تاثر ملتا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے دکھ شکھ میرے ساتھ شیئر کرنا شروع کر دیئے۔

جب گولڈی باجی نے کچھ وقت نکال کر اپنا اپنی شوق جاری رکھنا چاہا تو جمیل بھائی نے انہیں منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کچھ لکھنا چاہتی ہو تو انگلش میں لکھو۔ معاشرے کے جس طبقے سے میرا تعلق ہے وہاں اردو کوئی نہیں پڑھتا صرف انگلش ہی چلتی ہے۔ پھر جب انہوں نے اپنے لیے بالوں کی چوٹی گوندھ کر اس میں رنگ برنگا چوٹیل ڈالا تو جمیل بھائی بھڑک اٹھے۔

”ستارہ میرا اپنا ایک سوشل سرکل ہے۔ میرے تمام دوستوں کی بیویاں بہت پڑھے لکھے ماڈرن گھرانوں کی ہیں۔ ان سب کے بال کٹے ہوئے ہیں۔ تم بھی اپنے بال کٹاؤ اور ہر ہفتے بیوٹی پارلر چلا کر سٹینٹ کروا لیا کرو۔“ گولڈی باجی نے بال کٹوا دیئے۔ پھر باری کالج کی چوڑیوں کی آئی۔ وہ بچپن سے ہی اپنے کپڑوں سے بچ کر کے رنگ برنگی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ ان کی نازک کلائیوں پر وہ بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی تو میں نے بھی چوڑیاں پہننی شروع کی تھیں مگر جمیل بھائی کو اس پر بھی اعتراض ہوا۔ انہوں نے سختی سے منع کر دیا کہ یہ تمہارے مڈل کلاس شوق یہاں نہیں چلیں گے۔

تایا ابوا نے سارے انتظامات مراد بھائی کے سپرد کر دیے کیونکہ طاہر بھائی تو اپنی اور مہرین کی شاپنگ میں مصروف تھے۔

اس روز میں گولڈی باجی کے جوڑے ٹانگ رہی تھی کہ مراد بھائی چلے آئے۔

”یعنی تم ستارہ کی کمپنی میں رہ کر بہت کچھ سیکھ گئی ہو۔“ انہوں نے میری ترتیب پسندی کو بہت سراہا۔

”بس آگے آگے دیکھیں میں کیا کچھ کر دکھاتی ہوں۔“ میں شرارت سے ہنس دی۔

”یعنی بہت دنوں سے تم نے اچھی سی چائے نہیں پلائی۔“ مراد بھائی نے التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں ان کی بات سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ گولڈی باجی سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں چائے بنا کر کمرے میں لائی تو مراد بھائی کھڑکی کے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے۔ پیہ نہیں میری غیر موجودگی میں ان کی آپس میں کیا بات ہوئی۔ گولڈی باجی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

مراد بھائی چائے پی کر چلے گئے تو میں گولڈی باجی کے سر پر سوار ہو گئی۔

”بتائیے نا مراد بھائی کا آپ سے رشتہ ٹوٹنے پر کیا رد عمل تھا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”بس وہ یہی کہہ گئے ہیں کہ وہ ستارہ جسے میں اپنا سمجھ بیٹھا تھا وہ کسی اور آسمان کا تھا۔“

”تو مراد بھائی نے ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی شروع کر دی ہے۔“ گولڈی باجی میرے ساتھ ہنس دیں۔ دونوں شادیاں بہت دھوم دھام سے ہوئیں۔ طاہر بھائی اور مہرین سوئٹزر لینڈ چلے گئے اور گولڈی باجی جمیل بھائی کے ساتھ لندن

”یعنی جب تم بولتی ہو تو ہونٹ تو تمہارے ہلتے ہیں مگر مجھے پیچھے سے آواز ستارہ کی سنائی دیتی ہے۔ تم سوچتی بھی بالکل اسی طرح ہو اور بولتی بھی ویسے ہی ہو۔“

”اتنے سال ان کی صحبت میں رہی ہوں اور پھر آپ کو تو پتہ ہے وہ اپنی ڈھیر ساری خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ میرا آئینہ دل رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ میری صحیح رہنمائی کی ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔“ میں نے پوری سچائی سے اعتراف کر لیا۔

اگلے ہفتے کو صبح ہی پچھو گو برا نوالہ سے اور امی ابو فیصل آباد سے لاہور چلے آئے۔ میں سخت کنفیوژن میں تھی۔ نہ کوئی پہلے سے پردگرم تھا نہ آنے کی اطلاع تھی۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔

شام کو تاپا ابوبی واپسی پر مجھے ڈرائنگ روم میں بلا کر بٹھایا اور پچھو نے بات شروع کی۔ ”یعنی تم جانتی ہو میں کیوں آئی ہوں۔ دراصل مراد امریکہ جا رہا ہے اس کے لیے رشتے تو بہت اچھے اور امیر گھرانوں سے آئے تھے مگر ہم تو مڈل کلاس لوگ ہیں ہمیں اتنی اونچی پرواز کی خواہش نہیں۔ انسان جتنی اونچائی سے گرے اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے۔ ہم مڈل کلاس لوگ قسمت بھی مڈل کلاس ہی لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ویسے بھی انسان اپنے برابر کے لوگوں میں ہی اٹھتا بیٹھتا اچھٹا لگتا ہے۔ ہمیں اپنے مڈل کلاس ہونے پر کوئی ندامت، شرمندگی یا احساس کمتری نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ مڈل میں ہی رہتے ہیں اور یہی سب سے اچھی راہ ہے۔ اسلام نے بھی ہمیں میانہ روی اور اعتدال پسندی سے چلنے کا درس دیا ہے۔“ پچھو بولتی رہیں۔ میں سرزدہ سی ہو کر سنتی رہی۔

”تو بولو یعنی تمہیں مراد سے شادی کر کے اس کے ساتھ امریکہ جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں۔“ امی نے مجھے اچھی طرح جھنجھوڑ دیا۔

”امی جیسے کہ پچھو نے کہا ہے ہم مڈل کلاس لڑکیاں خواں کشتی ہی پڑھ لکھ جائیں پھر بھی وہ والدین کے فیصلوں کی پابند ہی رہتی ہیں، اطاعت اور فرمانبرداری کا دامن بھی نہیں چھوڑتیں اور پھر اللہ تعالیٰ بھی انسان کے لیے وہی کچھ کرتا ہے جس میں اس کی بہتری ہوتی ہے۔“ پچھو نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر بہت سادگی سے میری شادی ڈاکٹر مراد سے ہو گئی۔ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے اپنی پینٹنگ کر رہی تھی کہ مراد نے اپنا ہینڈ بیگ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔

”یعنی تم اپنی کالج کی چوڑیاں، مہندی، کاہل اور اپنی پسند کی ساری چیزیں میرے ہینڈ بیگ میں ڈال دو۔ یہ سفر کے دوران میرے ہاتھ میں رہے گا تو تمہاری چیزیں بحفاظت رہیں گی۔ اچھی کیس میں تو اکثر چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں۔“

”آپ کو میری چیزوں کا اتنا خیال کیسے آیا؟“

”امی صحیح کہتی ہیں ہم مڈل کلاس لوگ ہیں ہمیں اپنی معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کو سینے سے لگا کر وطن سے باہر جانا چاہیے تاکہ جب ہم واپس لوٹیں تو اپنی قدروں کے ساتھ واپسی ہو۔“

کلائیوں میں کالج کی چوڑیاں، آنکھوں میں کاہل، ہاتھوں میں مہندی، پوری آستینیں اور سر پر دوپٹہ، یہ ہم مڈل کلاس لوگوں کی پہچان ہے اور مجھے اس پر فخر ہے اور اس کے ساتھ ہی میں نے مراد کے ساتھ مل کر سب چیزیں پیک کر لیں۔



حقیقت کہانی

جاوید راہی

میں موٹر سائیکل سوار کے پیچھے بیٹھی خدا سے مدد کی دعائیں کرتی اپنے پیچھے دیکھتی جاتی۔ قریب سے گزرتے خالی رکشہ کو موٹر سائیکل والے نے ہاتھ دے کر روکا اور میں جھٹ سے اس میں سوار ہو گئی۔ گورنمنٹ کالونی تیار کر میں رکشہ کی پشت پر یوں لگ گئی جیسے اپنی ماں کی گود میں پہنچ گئی ہوں۔

درندہ صفت گروہ کے ہتھے چڑھ جائیدادی ایک بد نصیب لڑکی کی بچی کہانی

کرسی کو آگے کھینچتے ہوئے میرے بھرپور اصرار پر بتانا شروع کیا۔

میرا تعلق ملتان کے قریبی اور بڑے شہر سے ہے۔ میں سینڈن ایئر کی طالبہ ہوں۔ پیر ختم ہونے کے بعد گھر پر رہ کر اپنی والدہ کے ساتھ کام کاج میں مدد کرتی یا چھوٹے بہن بھائیوں کو ہوم ورک میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ والد صاحب سرکاری ملازم ہونے کے

سوچتی ہوں کہ اپنی بربادی کی تاریکیوں کو روشن الفاظوں میں کس طرح ترتیب دوں۔ اگر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو حرف حرف بیان کروں تو بہت سی باتوں پر شاید آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر بخدا میں جو بتانے جا رہی ہوں اس میں شاید بہت سی میرے جیسمی عقل اور نا سمجھ لڑکیوں کی بھلائی کا پہلو نکل آئے۔ ٹوبیہ نے میرے سامنے والی

باعث دوسرے شہر میں تھے اور ویک اینڈ پر گھر آتے۔ کالج فیلو دوست لڑکیاں زیادہ سٹی ایریا کی تھیں جبکہ میرا گھر شہر سے ہٹ کر نواحی آبادی میں تھا۔ میری فیلو کے بڑے بزرگ مکمل سیاسی لوگ تھے اور ہر دور میں کسی نہ کسی حوالے سے وہ حکومت وقت کے دست راست ہی رہتے۔ میری اپنی دنیا تھی جو گھر کی دلیز کے اندر تک ہی محدود تھی یا پھر پاس پڑوس میں ایک آدھ گھرایا تھا جن سے واجبی سارشتہ چلا آ رہا تھا۔

سکول سے کالج تک کا سفر بچے تلے قدموں سے ایک ہی ڈگر پر رواں چلا آ رہا تھا۔ جب چھٹی یا زیادہ چھٹیاں ہوتیں تو گھر کے اندر ہی رہ کر دن اور رات کا رشتہ نبھاتا پڑتا۔ میرا گاؤں مثالی گاؤں ہونے کے ناطے بہت سی ترقی پذیر سکیموں مثلاً شادی ہال، سوشل ویلفیئر ہال، بنیادی مرکز صحت، ہائی سکول، دستکاری سکول، بینک، ڈاک خانہ، جنرل سنور، پولیس چوکی وغیرہ سے مزین تھا۔

میری بربادی کا آغاز ایک ملبوسات کی نمائش سے شروع ہوا جو سوشل ویلفیئر ہال میں مختلف دستکاری سکولز کی جانب سے منعقد کی گئی تھی۔ چونکہ نمائش کی جگہ گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر تھی میں والدہ کی اجازت سے کپڑوں کے ڈیزائن دیکھنے گھر سے نکل کر مختلف گلیاں گراں کرتے ویلفیئر ہال کے نزدیک پہنچی تھی کہ ایک سفید کار میرے عین قریب آ کر ڈکی۔ میں نے گردن گھما کر گاڑی کا جائزہ لیا۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک آدمی اور پچھلی سیٹ پر دو عورتیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک عورت جو میری سائیز پر تھی، اس نے باہر منہ کر کے مجھے روکا اور بڑی محبت سے مخاطب کرتے ہوئے ایک نام لیا کہ ان کا گھر کس طرف ہے۔ میں اسی گاؤں میں پلی بڑھی تھی اس لیے میرے ذہن نے اس نام کو ٹھٹھا

مگر کوئی بھی ایسا نام میرے ذہن میں نہ گونجا جو اس عورت کے بتائے ہوئے نام سے میل کھاتا۔ میں سوچ میں اپنے گاؤں کے تمام گھروں کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ باہر نکل کر میرے قریب آ گئی۔ اسی اثناء میں آگے بیٹھا لمبا سا کرخت صورت آدمی بھی گاڑی سے اترا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پہلے رومال نکالا اور پھر ایک کاغذ کا ٹکڑا جس پر ناسمجھ میں آنے والی انگلیش میں اوٹ پٹانگ کچھ لکھا ہوا تھا۔ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ مخاطب ہوا، یہ دیکھیں مکمل ایڈریس ہے۔ رومال اس کے ہاتھ میں تھا اور کاغذ کا ٹکڑا اس نے میری آنکھوں کے سامنے کیا اور ساتھ ہی رومال اس نے میرے منہ پر رکھ دیا۔ کوئی تیز قسم کا بھبھوکا میری سانس کے ساتھ میرے پیچھڑوں میں سرایت کر گیا۔ بس اتنا یاد رہا کہ اس آدمی نے تیزی سے مجھے گاڑی کی سیٹ پر دھکیل دیا اور میں اندر بیٹھی عورت کی گود میں ڈھیر ہو گئی۔ پھر مجھے کوئی خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں۔

جب مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش آیا تو میں گھب اندھیرے میں کسی کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔ میرا پورا وجود خوف اور گھبراہٹ کے مارے تھر تھر کاپٹنے لگا۔ میں نے پورے وجود کی طاقت صرف کرتے خود کو اندھیرے میں پڑے اس انسانی جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی شاید سویا ہوا تھا۔ پھرتی سے اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سخت اور مضبوط ہاتھ میری گردن پر جم گیا اور اس نے غرا کر مجھے وارننگ دی، اگر آواز نکالی تو ادھر ہی ختم کر دوں گا۔

فوراً مجھے احساس ہو گیا کہ یہ اسی آدمی کی آواز ہے جس نے میرے منہ پر رومال رکھا تھا۔ میں سہم کر ڈھیلے انداز میں دوبارہ گر گئی۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں ذلیل درسا ہو چکی ہوں۔ یہی

آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے روتے ہوئے اس سفاک انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کون لوگ ہو اور مجھے کیوں اس ذلت و رسوائی سے درکنار کیا ہے۔ جواباً وہ آدمی تھوڑا سا کھانسا اور آہستگی سے بولا، تمہارا نام کیا ہے؟

میں نے روتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس نے دہرے سوالات شروع کر دیے۔ تمہارے باپ کا نام، تمہاری والدہ کا نام، بہن بھائیوں کی تعداد، والد کا کاروبار وغیرہ وغیرہ۔ میری تمام معلومات کے بعد وہ گویا ہوا۔

دیکھو ڈیہ تمہاری تقدیر نے تمہیں میرے سپرد کر دیا ہے اور یہ تم جان چکی ہو کہ ہم کیسے لوگ ہیں۔ تم اس وقت اپنے گھر سے سینکڑوں کوس دور میرے رحم و کرم پر بیٹھی ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں ہمیشہ کی نیند سلا کر یہاں گڑھا کھود کر زمین یوں کر دوں۔ کسی کو کوئی علم نہیں ہو گا کہ تمہیں کون لے گیا اور تمہارا کیا انجام ہوا۔ اس کی باتیں سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو چکا تھا کہ اتنے میں باہر سے دروازہ کھٹکٹایا گیا۔ میں نے فوراً ادھر ادھر ہاتھ چلاتے اپنا لباس ٹٹولنے کی کوشش کی مگر مجھے آس پاس اپنے کپڑے نہیں ملے۔ اتنے میں اس آدمی نے اٹھ کر اپنا آپ درست کرتے ہوئے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔

ہاں مومکیا بات ہے۔ اس آدمی نے اندر کھڑے کھڑے پوچھا۔ ہوش میں آ گئی؟ اس نے باہر سے کہا جس کا نام مومتھا۔ ہاں، آدمی نے اسے کچھ کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے کو کہا اور دروازہ تھوڑا سا کھولا تو میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی جو نیچے بے ترتیب پڑے تھے۔ میں نے فوراً اٹھ کر اپنا لباس سنبھالا اور خود کو اس میں چھپا کر آنے والے حالات کا جائزہ لینے

گئی۔ میں اپنے ذہن میں بیک وقت اپنی بربادی اور اپنے گھر والوں کی برادری میں رسوائی کی بازگشت محسوس کرنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد وہ آدمی پھر اندر آیا اور اس نے لائٹ آن کر دی۔ لمحہ بھر کو میری آنکھیں بالکل اندھوں جیسی ہو گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ گندہ سا کمرہ تھا۔ ایک بڑی سی آگنی پٹی اوپر ٹوٹے پھوٹے ٹرک اور کاٹھ کباڑے کا انکراہ اور چار پائی، پہلی بار میں نے اس شخص کو دیکھا جو مجھے دو عورتوں اور ایک آدمی کے ہمراہ چالاکی سے بے ہوش کر کے اغوا کر لایا تھا۔

اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ اور عیاری نمایاں تھی۔ وہ بے تکلفی سے میری گود میں سر رکھتے لیٹ گیا۔ میں شرم اور خوف سے لرز رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ خود کو اس کی بے حیائی سے دور رکھوں مگر ساتھ میں خوفزدہ بھی تھی کہ کہیں یہ ظالم انسان مجھے جان نسنے نہ مار دے۔ اسی اثناء میں دروازہ دھم سے کھلا اور ایک دہلی تیلی تیز طرار عورت دندناتی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی اس آدمی سے مخاطب ہوئی۔

اوتے جانی اب اس کو چھوڑ بھی دے کہ ابھی تک تیرا دل نہیں بھرا۔

بالی بہت زوروں کی بھوک لگی ہے فضول باتیں چھوڑو اور ممو سے کہو کہ پہلے کھانا لائے۔ وہ آدمی جس کا نام بالی نامی نووارد عورت نے جانی لیا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بالی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تو جانی نامی آدمی مجھ سے مخاطب ہوا۔ یار اس کا غصہ نہ کرنا لپگی ہے۔ تمہیں سوتن کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔ میں شرم سے دہری ہوئی جا رہی تھی کہ یا خدایا یہ میرے کس جرم کی سزا ہے۔ تقدیر اور

حالات نے مجھے کیا سے کیا بنا ڈالا۔

دن رات میری بھرپور انداز میں رکھوالی کی جاتی۔ میں اس شخص کے ظلم و ستم کا شکار تو بنتی تھی اسی دوران میرے ساتھ اس کے دوست احباب بھی دست درازی کرنے سے گریزاں نہ ہوتے۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے نشہ کا بھی عادی بنا دیا۔ اب میں اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہو کر اس گھناؤنے انسان کے رنگ میں رنگ گئی۔ مجھے اس کے ساتھ رہتے چار مہینے ہو چکے تھے۔ میں اپنے لوگوں کو بالکل بھول گئی۔ مجھے صرف اتنا ہی علم تھا کہ رمضان عرف جانی میری زندگی کا مالک اس کی بہن امام بی بی عرف ممو، بالالا عرف بالی جانی کی پہلی محبوبہ اور اس کی والدہ و زبیراں یہی میرا خاندان ہے۔

جانی نے مکمل طور پر مجھے اپنے بس میں کر لیا تھا۔ اب وہ مجھے جرائم کی طرف راغب کرنے لگا اور اس حوالے سے میری باقاعدہ ٹریننگ کرتا۔ یہاں تک کہ میں بھی ان لوگوں کے نوسر بازی گینگ کی ورکر بن گئی اور باقاعدہ ان کے ہمراہ نوسر بازی میں بھی حصہ لینے لگی۔ یہ لوگ میرا سودا کسی بھی عمر کے آدمی سے شادی کے نام پر کرتے۔ میں منصوبے کے مطابق موقع پا کر واپس ان کے پاس پہنچ جاتی۔ میری زندگی مکمل طور پر جہنم کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ ہمارا گینگ مختلف شہروں میں سادہ لوح عورتوں اور آدمیوں کو نقلی سونے کی ڈلی پھینک کر اپنے جال میں پھنسا لیتا اور اسے لوٹ کر کرایہ کی گاڑی میں فرار ہو جاتے۔ جانی نے مجھے بہت جلد اس کام میں ماہر کر دیا تھا۔ زیادہ وقت جانی گھر پر میرے ساتھ رہتا۔ جب لوٹا مال ختم ہونے لگتا تو ہمارا گینگ پروگرام بنا کر چل پڑتا اور کبھی زیادہ کبھی تھوڑا لے کر اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جاتا۔

اس دوران ہمارے زیادہ دن لاہور کے آس

پاس گزرے پھر جانی کا جھگڑا اپنے گروہ کے لوگوں سے ہو گیا تو وہ مجھے اسد اللہ پور نیا دیپالپور ضلع اوکاڑہ اپنے بڑے بھائی کے گھر لے آیا۔ بات بات پر مار پیٹ اور گالی گلوچ اس کی عادت تھی۔ میں بھی اس کی عادی ہو چکی تھی۔ میری زبان بھی لچر لوگوں کی طرح چلنے لگی تھی۔ جانی کا بھائی اور اس کے گھر والے ذات کے تو مراٹھی تھے مگر جانی اور اس کی بہن امام بی بی اور ماں و زبیراں اور بالالا وغیرہ سے بہت بہتر تھے۔ وہ میرے ساتھ ناروا سلوک کی بھرپور مخالفت کرتا۔ ایک دو بار مجھے مار پیٹ کی بنا پر اس کے بھائی کا جھگڑا اپنے بھائی سے ہوا تو اس نے مجھے اغوا کرنے اور مذموم کاروبار کی اطلاع پولیس کو کرنے کی دھمکی دی۔

اس پر ایک روز جانی اس کی غیر موجودگی میں مجھے اوکاڑہ لے آیا۔ یہاں اپنی بہن امام بی بی، اپنی والدہ اور اپنے باپ کے ہمراہ ایک عزیز گلزار کے گھر آدھا حصہ کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ گلزار اوکاڑہ میں دال چنے کی ریڑھی لگاتا تھا۔ یہاں آکر جانی نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ گلزار کی بیوی سکھی اپنی بہن کی طرح میرا خیال رکھتی مگر اس دوران ممو ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی۔ سکھی نے اپنی محبت اور اچھی سہیلی کا کردار نبھاتے ہوئے مجھے نشہ کی لعنت کو ترک کرنے کا حوصلہ دینا شروع کر دیا۔ اس کی باتوں نے میرے اندر میرے گھروالوں کا خیال پھر سے جگا دیا۔ آہستہ آہستہ میں نشہ کی عادت کو کم سے کم کرتی جا رہی تھی مگر اس بات کو میں نے جانی سے مخفی رکھا اور اسے اپنی ایکٹنگ کے ذریعہ یہی ثابت کرتی کہ میں اپنے آپ میں کم پڑی رہتی ہوں۔ اسی دوران سکھی کا ماموں یاسین اور اس کی بھابھی سکینہ بی بی اس کے گھر پر کھانے کے لیے آئے۔ مجھے دیکھ کر سکینہ نے میرے بارے میں پوچھا تو ممو

نے کہا کہ جانی کی بیوی ہے مگر سیکھنے اور یاسین اس کے جھوٹ سے مطمئن نہ ہوئے۔ دوسرے روز سکھی نے مجھے موقع پا کر کرایا کہ تم کب تک ان لوگوں کے لیے کمائی کا ذریعہ بنی رہو گی۔ تم کیوں نہیں اس شخص کے چنگل سے آزاد ہوتی۔ میں نے بھرائی آواز میں کہا کہ میرے گھر والوں کو تو اس بات کا علم نہیں کہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں وہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ آئی ہوں۔ خدا معلوم میرے پیچھے کس کس پر مصیبت ٹوٹی یا ابھی تک ٹوٹ رہی ہو گی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان جاری تھا۔

سکھی نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ماموں یاسین سے بات کروں گی وہ سکھائی گاڑ کا کام کرتا ہے اور جس کی کمپنی میں وہ ملازم ہے وہ سابقہ فوجی آفیسر ہے۔ وہ ضرور کوئی حل نکال لے گا۔ کم از کم تم اس بدکار کے چنگل سے تو آزاد ہو جاؤ گی۔ رہا تمہارے گھر والوں کا معاملہ تو وقت آنے پر اس کا بھی کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔

میری اجازت سے اس نے یاسین سے بات کی تو اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

ادھر جانی نو مہینے کی من مانیاں اور بے حیائی کا گراف روز افزوں اور اونٹھ رہا تھا۔ اس نے لاہور کے قریبی شہر میں ایک شخص سے میری شادی کی بات چلا رکھی تھی اور اس سے بیس ہزار روپے بھی ٹھگ لیے تھے۔ مجھے حسب سابق موقع ملنے زبورات اور جو بھی ہاتھ لگ جائے لے کر وہاں سے رو پکھڑا ہونا تھا مگر جب سے میں منشیات کی لعنت سے آزاد ہوئی تھی میرے اندر کی حیا اور بے بسی مجھے ہر پہل اس بے غیرت کے چنگل سے نکل بھاگنے کی تدابیر پر ہی اکسائے رکھتی۔

یہاں آپ کے آفس کا ایڈریس سکھی نے

مجھے دے رکھا تھا اور میں اس تاک میں تھی کہ جانی اور اس کی بہن امام بی بی اور داشتہ بالان کی نظر ادھر ادھر ہو اور میں بھاگ نکلوں شاید یہ کام میں شروع میں کر لیتی مگر حالات اور بے در نہ غلاقت کے حلوں نے مجھ سے میری تعلیم اور سمجھ بکسر چھین لی تھی۔

اوٹوبیہ پانی لانا۔ اس روز جانی نے ناشتہ کرتے مجھے آواز دی۔

میں برتن پکڑ کر ساتھ والے گھر پانی لینے نکلی کیونکہ پینے کا پانی اسی گھر سے لایا جاتا تھا۔ میں نے باہر نکل کر ساتھ والے گھر کی طرف دیکھا دروازہ بند تھا اور گلی سنسان پڑی تھی۔ نہ جانے میری ناگوں میں اتنی طاقت کدھر سے اتر آئی۔ میں برتن وہیں پھینک کر تیزی سے بھاگتی گلی کر اس کر کے مڑ کر پر آ گئی۔ میرے نصیب میں رہائی لکھی جا چکی تھی اور خدا کے کرم سے ایک موٹر سائیکل سوار بھی مل گیا جو پیچھے سے آ رہا تھا۔ میں نے تیز تیز چلتے اس کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں ادھر ادھر جائزہ بھی لے رہی تھی کہ جانی کے جان بچان کے لوگ نہ آجائیں۔ وہ رُکا۔ میں نے کہا بھائی مجھے شہر جانا ہے کسی رکشہ تک مجھے پہنچا دیں۔ آدمی شریف تھا اس نے کہا کہ آجائیں۔

میں موٹر سائیکل سوار کے پیچھے بیٹھی دھڑکتے دل سے شہر کی جانب جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے خدا سے مدد کی دعائیں بھی کرتی اپنے پیچھے دیکھتی جاتی۔ قریب سے گزرتے خالی رکشہ کو موٹر سائیکل والے نے ہاتھ دے کر روکا اور میں جھٹ سے اس میں سوار ہو گئی۔ گورنمنٹ کالونی تیار کر میں رکشہ کی پشت پر یوں لگ گئی جیسے اپنی ماں کی گود میں پہنچ گئی ہوں۔ رکشہ والا مجھ سے ایڈریس پوچھ کر خود ہی آپ کے آفس لے آیا۔

پہلے پہلے

مالک نوکر سے: یہ لو چار آنے اور دوڑ کر بازار سے ایک ماچس لاؤ اور سناو اچھی طرح دیکھ بھال کر لینا۔ ماچس کہیں نفی نہ ہو۔ نوکر نے فوراً بازار سے ایک لاکر مالک کو دیتے ہوئے کہا: حضور ہم نے ایک ایک کر کے پوری ماچس کی تیلیاں جلا کر دیکھ لی ہیں ایک بھی نفی نہیں ہے۔

منقطع کر دیا۔ اس بات کی تو تصدیق ہو گئی کہ ٹوبیہ نے اپنا ایڈریس وغیرہ صحیح بتایا ہے۔ میں پریس کلب میں تھا جب ہسپتال سے کال آئی کہ جانی، ممو، بالی اور دوسرے اس کے ساتھی آکر دھینگا مٹھتی کر رہے ہیں کہ ٹوبیہ کو باہر نکالو ورنہ اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ میں جب پولیس فورس کے ہمراہ ہسپتال پہنچا تو وہ لوگ جا چکے تھے۔ ادھر ٹوبیہ اس بات پر بعد تھی کہ وہ واپس گھر نہیں جائے گی۔ اس کے گھر والے اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میرے لیے ٹوبیہ کو ہسپتال رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کر کے ٹوبیہ کے والد کو ایک بار پھر فون کیا اور اسے آفس کا ایڈریس سمجھا کر فوراً ملنے کا کہا۔ وہ لاہور میں اپنے حکمران میٹنگ میں تھا۔ میری باتوں کو اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی بیٹی کا پتہ چل چکا ہے۔ وہ شام سے پہلے اوکاڑہ پہنچ گیا۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنے بھتیجے کے ہمراہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی بے چینی اور اس کے بھتیجے کی غصہ بھری شکل محسوس کرتے ہی میں جان گیا کہ یہ لوگ براہ راست مجھے اپنے فریم میں فٹ کئے بیٹھے ہیں۔ میں وقت کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے خود پر

یہ سب بتا کر ٹوبیہ ٹھنڈی سانس بھرتے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں ٹوبیہ کی داستان غم سن کر پریشانی کے عالم میں اس معصوم کی بد نصیبی پر غور کرتے اگلے اقدام کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی ملازمہ سیکینہ شریف کو بلوایا جو میرے ویلفیئر سر جیکل ہسپتال میں کام کرتی تھی اور ٹوبیہ کو ہسپتال بھیج دیا اور اپنے ہیڈ آفس اطلاع کر دی۔ میں ٹوبیہ کا فچر بنانے کے بارے میں غور کر رہا تھا مگر میرے پاس ماسوائے ٹوبیہ کے کسی اور کی کوئی تصویر نہیں تھی اور میری کوشش سے ٹوبیہ نے اپنا صحیح ایڈریس اور اپنے والد کا موبائل نمبر مجھے دے دیا۔

میں نے سیکینہ بی بی سے کہا کہ جانی اور اس کے ساتھیوں کو آپ پر شک تو نہیں کہ ٹوبیہ آپ کی ہی وساطت سے اخبار کے دفتر پہنچی ہے۔ جس پر اس نے کہا کہ ابھی تک تو کوئی اطلاع نہیں ملی مگر میں شام کو اپنی بھانجی کو ملنے جاؤں گی تو ساری صورتحال کا علم ہوگا۔ میں نے جانی کی تصویر کے بارے میں بھی اس کو کہا تو ٹوبیہ نے بتایا کہ چند روز پہلے ایک پھیری والے پٹھان سے میرے سمیت سب نے تصویریں بنوائی تھیں۔ ہو سکتا ہے اس کی کاپیاں سکھی کے پاس بھی ہوں کیونکہ وہ بھی تصویر میں ہمارے ساتھ کھڑی تھی۔ سیکینہ بی بی نے حسب وعدہ شام کو نا صرف تصویریں لا کر دیں بلکہ جانی کی بھاگ دوڑ کے بارے میں بھی کچھ باتیں میرے سامنے آئیں اور میں اسی کی روشنی میں آگے چل پڑا۔

میرا پہلا اقدام ٹوبیہ کے والد سے رابطہ کرنا تھا لہذا میں نے اللہ کا نام لے کر نمبر ڈائل کیا جو لگ گیا اور ٹوبیہ کی صداقت کا پہلا پتہ صحیح مقام پر لگا۔ میں نے یونہی رات نمبر بتا کر اپنا تعارف ٹوبیہ کے والد سے کرایا اور اس کے بارے میں معلومات میں جو صحیح نکلیں جیسا کہ ٹوبیہ نے بتایا تھا۔ پھر میں نے سلسلہ

کے گھر سے باہر رہنے کی ہوا پورے گاؤں تک پھیل چکی تھی جبکہ پولیس تک میں کوئی رپورٹ درج نہیں تھی۔

میں نے بھی ان کو یہی مشورہ دیا کہ ٹوبیہ کی آنے والی زندگی کو اس حادثہ کا نشانہ نہ بنائیں اور خاموشی سے اس بات کو برداشت کر لیں۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں وہ یوارجیم وکریم ہے، انصاف کرے گا۔ میں نے ٹوبیہ کی باضابطہ واپسی کے لیے تحریری طور پر اہل علاقہ کے معزز لوگوں کی موجودگی میں اسے اس کے والد اور دوسرے رشتہ داروں کے سپرد کیا جو آنسوؤں بھری آنکھوں سے اپنی بد نصیب بیٹی کو لے کر جدائی میں تڑپتی ماں، بہن اور بھائیوں کی طرف چل پڑے۔

ٹوبیہ کئی ماہ تک جانی جیسے درندے اور ایسے ہی قماش کے لوگوں کی ہوس کی بھیٹ چڑھتی رہی مگر بد نصیب باپ صرف اپنی عزت اور غیرت کا جنازہ نکلنے کے خوف سے کسی بھی ایسی کارروائی سے گریزاں رہا جس کی بنیادی ضرورت وہ سچائی سامنے لانا ضروری ہوتا ہے جس کا شکار ٹوبیہ ہوئی۔ جانی اب بھی سیکھ نہ بی، یاسین، گلزار، سکھاں کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ والدین رسوائی کے خوف سے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروا سکے مگر اس طرح کی وارداتوں میں ملوث رمضان عرف جانی جیسے لوگ پھر کی بد نصیب ٹوبیہ کا انتخاب کرنے نکل پڑیں گے اور نہ جانے اس طرح کتنی بے بس، کمزور اور مجبور لڑکیاں، عورتیں اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی کی صلیب پر لٹکتی رہیں گی۔ قانون کے محافظوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس نظر رکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جانی کسی اور معصوم ٹوبیہ کی عزت پامال کر رہا ہو۔

کٹرول کرتا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ان کے لیے پانی وغیرہ منگوا یا اور باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ وہ دونوں ٹوبیہ کو ملنے کے لیے بے چین تھے۔ جب ساری صورتحال کا ان کو علم ہوا تو دونوں کافی حد تک سنبھل چکے تھے۔ میں اس بات کا یقین کر لینے کے بعد کہ اب ان کے دل میں ٹوبیہ کے لیے کوئی بدگمانی نہیں رہی ان کو لے کر ہسپتال آ گیا۔ ٹوبیہ کے علم میں میری کوئی بھی کارروائی نہیں تھی۔ وہ اچانک اپنے والد اور بھائی کو دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ ڈر کے مارے اس کا سارا وجود شاخ بید کی طرح لرز رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی اس کے والد نے بے اختیار ہو کر کئی ماہ آنکھوں سے دور رہنے والی بیٹی کو اپنے سینے میں چسپا لیا۔ پورے ہسپتال میں موجود عملہ اور مریضوں کی آنکھیں بھی جھجک گئیں۔ اس کے بعد ٹوبیہ اپنے بھائی کو ملی۔ میں ان کو الگ چھوڑ کر باہر لان میں آ گیا۔ کافی دیر تک وہ تینوں مختلف حوالوں سے باتیں کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ٹوبیہ کو کسی نے ورغلا کر گھر سے بھگایا تھا مگر اس نے اپنے والد کو سارے حالات اسی طرح بیان کئے جس طرح گزرے تھے۔ بعد میں ٹوبیہ کے والد نے فون پر کسی سے بات کی اور اسے بلایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا کوئی بھائی تھا جو ان کی برادری کا سردار مانا جاتا تھا۔ رات وہ لوگ میرے مہمان رہے۔ دوسرے روز وہ صاحب بھی پہنچ گئے اور مجھ سے جانی اور اس کے گروہ کی بابت دریافت کیا۔ میں نے وہ جگہ ان کو بتائی جہاں ٹوبیہ رہ رہی تھی۔ ٹوبیہ کا بھائی اپنے سے باہر ہو رہا تھا کیونکہ غیرت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ اس فوسر باز کو اس کے کئے کی سزا ملتی مگر ٹوبیہ کے بارے میں سوچ بچار اور یہاں تک کہ اس



انجم انصار

آؤ لڑیں

”چلو اب بنوا لومودی۔“ وہ فراخ دلی سے بولے۔ ”کیا مطلب؟“ میں نے تیوری چڑھا کر انہیں دیکھا۔ ”دوبارہ دلہن بن جاؤ۔“ وہ مسکرائے۔ ”میں دلہن بن جاؤں!“ بھونچکی ہو کر، میں نے اپنے آدھے درجن بچوں کو دیکھا جو ہماری باتوں سے بے نیاز ایک دوسرے کی دل لگا کر مرمت کر رہے تھے۔

میاں بیوی کا قصہ جو اپنا ماضی، حال سے تبدیل کرنا چاہتے تھے

”کیوں کر لی آپ نے اتنی جلدی شادی..... کیا تھا کہ اگر منگنی کا بیڑہ کچھ طویل ہو جاتا، ایمان سے شادی کا اہم قطعی اس قابل نہیں ہے کہ کسی کو بھی دکھایا جاسکے۔“ میں ٹھنک کر بولی۔ ”ہمیں تو اتنی جلدی نہیں تھی تمہاری اماں کو ہی جلدی تھی کہ جیسے تم ان کے ہاتھوں سے نگلی جا رہی

”اللہ ہماری شادی کی نہ مودی بنی اور نہ ہی کلرڈ تصویریں کھینچی گئیں۔“ مختلے دیور کی مودی دیکھتے ہوئے میں نے میاں جانی کو شہوکا دے کر کہا۔ ”پندرہ سال پہلے مودی بنتی ہی نہیں تھی اور کلرڈ تصویریں بھی اتنی عام نہیں تھیں۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

لوں گی۔ اگر اس دوران آپ کو معقول نوکری مل گئی تو بھی پڑھ لکھ کر گھر بیٹھ رہوں گی۔ نہیں کروں گی نوکری۔“ فرزانہ نے دلیل دی۔

اس دلیل کا خاموش صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آخر کار فرزانہ نے داخلہ لے لیا اور خاموش صاحب نے تلاش معاش جاری رکھی۔ فرزانہ کا ڈپلومہ مکمل ہو گیا لیکن خاموش صاحب کو نوکری ملنا تھی نہ لی۔

ادھر فرزانہ کا ڈپلومہ مکمل ہوتے ہی اس پر نوکریوں کی بھرمار ہو گئی۔ ایک تو بالکل نیا مضمون تھا جس کی مارکیٹ میں خاصی مانگ تھی اوپر سے عورتوں میں اس مضمون کی طرف آنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا اور پھر نئے دور کی بین الاقوامی کمپنیاں اپنا دفتری ماحول خوشگوار بنانے اور جدید تقاضوں کے مطابق خواتین کی معقول تعداد کو ملازمت میں رکھ رہی تھیں۔ ویسے فرزانہ نے ڈپلومہ پاس بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ کیا تھا۔ حسین تو وہ بھی ہی اوپر سے ذہن بھی بہت تھی۔ اس کا بھی حسن خاموش صاحب کو کھٹکتا تھا، انہیں احساس عدم تحفظ کا شکار کرتا تھا۔

ایک روز رات کو خاموش صاحب کے بالوں میں اگلیاں پھیرتے ہوئے فرزانہ نے ڈرتے ڈرتے، کہ وہ جانتی تھی کہ جو بات شوہر سے کھانے کی میز پر نہ منوائی جاسکتی ہو بستر میں منوائی جاسکتی ہے۔ التجا یہ لہجے میں کہا ”سنئے“ پھر لہجہ بھڑک کر دنیا جہان کا پیار اپنی آواز میں سموتے ہوئے بولی ”آپ کو وہ رات یاد ہے، ہماری پہلی رات، جب آپ نے مجھ سے تعاون مانگا تھا۔ میں تو آپ سے تعاون کرنا چاہتی ہوں مگر آپ مانتے ہی نہیں اگر میں نوکری کر لوں گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ آخر میری بہت سی سہیلیاں بھی تو نوکری کر رہی ہیں۔ پھر میں آپ سے نوکری کی اجازت کا تقاضا نہ کرتی اگر ضرورت نہ ہوتی۔ آپ ماشاء اللہ چالیس برس سے اوپر کے ہو چکے ہیں۔ اب

ہاں کر دی۔

اتنی پرانی نوکری اور گئی بندھی تنخواہ چھوڑ کر ایک نئے کاروبار کے ساتھ مشکل ہونا ایک مشکل فیصلہ ہو سکتا تھا مگر خاموش صاحب نے چند لمحوں میں یہ فیصلہ کر ڈالا اور اپنا ساز و سامان لے کر نئے دفتر میں آجما جمان ہوئے۔ خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ پہلے ہی کاروباری منصوبے میں ان کے پرانے ساتھی اور نئے پاس کو خسارہ ہو گیا۔ سو ایک برس میں یہ کاروبار بند کرنا پڑا۔

خاموش صاحب پھر سڑک پر تھے۔ اوپر آسمان تھا اور سامنے سنگناخ راستہ جانا بھی دور تھا۔ ایسے میں ان کی بیوی ان کی مدد کو نہ آتی تو شاید وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ اس خدا کی بندی نے ان کا حوصلہ خوب بڑھایا اور پھر ایک روز ڈرتے ڈرتے ایک تجویز ان کے سامنے رکھی۔ تجویز سن کر وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بول پڑے ”فرزانہ لوگ کیا کہیں گے کہ خود تو زندگی میں ناکام ہو گیا اور پھر اپنی بیوی کو پڑھا لکھا کر اس کی روزی کترنے لگا۔ نہ بھئی نہ“ انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ فرزانہ پھٹ پڑی ”آپ بھی زمانہ جاہلیت کی باتیں کرتے ہیں۔ آج جب آپ سڑکوں پر جوتیاں چمختے پھر رہے ہیں تو ان سب لوگوں کو آپ کا خیال کیوں نہیں آتا۔ کیا کوئی آیا آپ کی مدد کو؟ پھر اور لوگوں کو تو چھوڑیے، ابھی کل جب آپ اپنے پرانے دفتر، ملازمت کی تلاش میں گئے تھے تو کیا کسی نے آپ کی پرانی خدمات کا لحاظ کیا؟ کس بے مردتی سے ٹکسا جواب دے دیا۔“

”ابھی تو چھ ماہ ہی ہوئے ہیں۔ اللہ کا ساز ہے۔ کوئی راستہ نکال دے گا۔ دنیا بے مروت ہو گئی ہے تو اس کے ساتھ مجھے تو بے لحاظ نہیں ہو جانا چاہیے۔“ خاموش صاحب کھلائے۔

”میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ شام کے ڈپلومے میں داخلہ لے لیتی ہوں۔ کچھ پڑھ لکھ ہی

شروع ہو گئی۔ ہر ماں کی طرح ان کی والدہ بھی خوبصورت، خوب سیرت، بہو جاتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی کم عمری الہز باجی دو شیزہ ان کے گھر میں رونق لگائے مگر خود خاموش صاحب سنجیدہ عمر کی سمجھدار لڑکی چاہتے تھے کہ آخر کو وہ اپنی عمر کی اڑتیسویں بھار دیکھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ان کی والدہ کو ایک بائیس تیس برس کی لڑکی پسند آ گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شادی کی رات خاموش صاحب نے اپنی بیوی کو اپنی بھرپور محبت کا یقین دلایا اور باور کرایا کہ ان کی زندگی میں وہی ان کی پہلی اور آخری محبت ہے۔ اس بے لوث محبت کے اظہار پر بیوی نے سر جھکا دیا۔ ہاں خاموش صاحب نے دہن کو ذاتی مکان کی اپنی شدید خواہش کا بھی بتایا اور اس سے تعاون بھی مانگا۔ دہن نے دھیمے سروں میں ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا تو خاموش صاحب نے بے اختیار ہو کر اس کے گل مہندی لگے گورے ہاتھوں کو گرجوٹی سے تھام لیا۔ پھر یہ فیصلہ بھی ہوا کہ جب تک اپنا ذاتی مکان نہ لیا جائے خاندان کو بڑھایا نہ جائے۔

شادی کے ابتدائی چند دنوں شادی میں گزرے۔ پھر سب زندگی کی مصروفیات میں مگن ہو گئے۔ خاموش صاحب کی جمع پونجی تو بیابان کی رسومات کی نذر ہو گئی تھی لہذا پیسوں کو جمع کرنے کی ہم کو از سر نو ترتیب دینا پڑا۔

جس دفتر میں خاموش صاحب ملازم تھے وہاں کی آمدنی میں سے قابل ذکر رقم پس انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ قرض لینے کو ان کا جی ویسے بھی آمادہ نہ تھا۔ سو کسی اور نوکری کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کے دفتر کے ایک ساتھی نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اسے کسی ایسے معاون کی ضرورت تھی۔ وہ خاموش صاحب کی محنت اور دیانت سے شناسا تھا، سو انہیں معقول مشاہرے پر کام کرنے کی دعوت دے دی۔ اندھے کو نظر کے سوا اور کیا چاہیے، سو انہوں نے فوراً

ادھر تنخواہ ملتی ادھر مالک مکان کے تقاضے شروع ہو جاتے تھے اور پھر ہر سال کرائے اتنے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ بسا اوقات انتہائی اہم ضروریات زندگی کو نظر انداز کر کے کرایہ چکانا پڑتا تھا۔ اب وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے فرزند بھی ساری زندگی اسی مشکل میں کاٹیں۔

دوسری نصیحت کے پس منظر میں بھی کچھ ایسے ہی عوامل کارفرما تھے۔ یہ نصیحتیں کرنے کے بعد قبلہ والد تو اس دنیا سے پردہ کر گئے مگر خاموش صاحب کی آنکھیں کھول گئے۔ اب خاموش صاحب نے ان دو مقاصد کے حصول کو زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

دوسری نصیحت تو سمجھی پوری ہو گئی جب انہوں نے اپنے دفتر کے ایک ساتھی کا استعمال شدہ سکوتر بھلے داموں میں اس سے خرید لیا لیکن پہلی نصیحت پر عمل بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ ایک تو رہائی زمین کی قیمت بڑھتے بڑھتے آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ دوسرے یہ کہ تعمیرات کے اخراجات بھی ان کی بساط سے کہیں بڑھ کر تھے لیکن وہ پھر بھی ہمت نہ ہارے اور پائی پائی اکٹھی کر کے اسے معقول رقم میں تبدیل کرنے میں مصروف رہے۔

اسی دوران ان کی والدہ کا بھی دم آخر قریب آ پہنچا۔ ایک تو ضعیفی دوسرے آئے دن کی بیماریوں نے انہیں ہلکان کر دیا تھا۔ پچھلے چند برس سے وہ خاموش صاحب سے اصرار جاری رکھے ہوئے تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں بیٹے کو سہرے میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے بہت پس و پیش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے اپنے مکان کی تعمیر کی حسرت کو پورا کر لیں پھر شادی کا بھی سوچ لیں گے۔ پر جب ماں نے واسطے ڈالے اور اپنی موت کی منظر کشی کی تو ان کا دل پہنچ گیا اور بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ادھر انہوں نے ہتھیار ڈالے ادھر لڑکی کی تلاش

آخر کو خاموش صاحب دھیمی آواز میں واسطوں اور منتوں کے بعد خوشامد پر اتر آئے لیکن دروازہ بند رہا۔ سویرے جب صبح کی اذان کے بعد دروازہ کھلا تو فرزانہ سوچی آنکھوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ خاموش صاحب کے سینے سے آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خاموش صاحب نے فرزانہ کو سہلانا شروع کر دیا۔ ”چلو معاف کر دو۔ جیسی تمہاری مرضی، کل ہی سے نوکری شروع کر دو مگر وعدہ کرو کہ اگر گھر جتنے پیسے اکٹھے ہو گئے تو پھر نوکری چھوڑ دو گی اور دوبارہ یہ ضد نہیں کرو گی۔“

فرزانہ روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور تائید میں سر ہلانے لگی۔

جب فرزانہ کی پہلے ماہ کی تنخواہ گھر آئی تو جیسے خشک بھیر زمین پر سبزے کی بہار آگئی ہو۔ خاموش صاحب نے جو پچھلے دو ایک ماہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی مانگ تا بنگ کر گزارا کر رہے تھے، غرض چکایا۔

پھر بقیہ رقم سے گھر کا ضروری سامان خریدا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اس لیے ضروری واجبات کی ادائیگی ہو گئی۔ ادائیگی تو ہو گئی مگر خاموش صاحب کے سینے پر جیسے

ایک بوجھ سا پڑ گیا۔ وہ اسم بامسکئی ہو گئے۔ کچھ زیادہ ہی خاموش ہو گئے جیسے بجھ سے گئے ہوں۔ دوسری طرف فرزانہ کھل اٹھی تھی۔ اپنی تنخواہ اور کمائی کا نشہ ہی اور تھا۔ اوپر سے اس کے دفتر میں اس سے خصوصی سلوک کیا جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنی محنت کا ثمر سمجھتی تھی۔

اپنے حسن اور قدرتی اداؤں کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں گیا۔ اس کا ہینڈم جوان باس تو گویا اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باس کی پرسنل گفتگو کا خاموش صاحب کو بتایا تو ان کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا اور چہرہ متغیر ہو گیا۔ ان کا بدلتا موڈ دیکھ کر فرزانہ نے زنانہ دانشمندی سے موضوع بدل لیا لیکن پھر دوبارہ کبھی اپنے دفتر کے کسی ساتھی یا اپنے باس کی اپنے لیے تعریف کا

سننے سے تو زندگی شروع نہیں کی جاسکتی نا۔ پھر اگر خدا کرے آپ کو جلد نوکری مل بھی جائے تو بھی گھر بنانے کے لیے جتنے پیسے چاہئیں ان کو آپ اکیلے کی تنخواہ سے تو اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔“

خاموش صاحب پھٹ پڑے ”ہاں ہاں صرف تعاون مانگا تھا۔ نہیں چاہیے مجھے ایسا گھر جس میں میری عورت کی کمائی شامل ہو۔“

فرزانہ بھی تو نثار کے موڈ میں تھی ”تو پہلے ہی مجھے یہ بات بتادی ہوتی۔ اتنی اُمیدیں تو نہ لگانی اور نہیں تو ایک بچہ ہی ہو گیا ہوتا۔ کل کو کیا میرے بچے بھی اپنے گھر کے بغیر ملیں گے؟ کیا ہم ساری زندگی اپنی محنت کو ترسیں گے؟“ فرزانہ کے لہجے میں غصے کے ساتھ بناوٹ کا رنگ بھی کھلا ہوا تھا۔

”میں نے انکار کر دیا ہے۔ بیوی کی کمائی مجھ پر حرام ہے۔“ خاموش صاحب نے سپاٹ لہجے میں گویا بات ختم کر دی۔

فرزانہ یہ سن کر تلخ لہجے میں گرجی ”میں کون سا جا کر کوٹھے پر بیٹھ رہی ہوں باعزت نوکری کا ہی کہہ رہی ہوں۔ خدایا، اتنا احساس کمتری۔ اتنی کمزوری۔“

کوٹھے کا لفظ سن کر خاموش صاحب اپنے اپنے قابو نہ رکھ سکے اور ایک زوردار ٹھٹھرا اپنی بیوی کو رسید کر دیا۔ ازدواجی زندگی کا پہلا طمانچہ کھا کر فرزانہ کچھ دیر تو ہکا بکا رہ گئی، پھر سسکیاں لیتی ملحقہ کر کے کو دوڑی، دروازے کی چنجی اندر سے لگا کر پلنگ پر جا گری اور تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔

کچھ دیر کے لیے تو خاموش صاحب سن ہو کر رہ گئے، پھر غنامت غالب آگئی۔ کافی شرمندگی محسوس کرتے رہے۔ آخر کار بوجھل دل سے اٹھے اور اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے مگر فرزانہ نے دروازہ نہ کھولا۔

رات ڈھلنے لگی۔ باہر پودے پتوں پر اوس

ذکر نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

چوتھے ماہ کی تنخواہ آئی تو اس میں انکریمینٹ بھی شامل تھا۔ ضروری سامان کی خریداری اور باقاعدہ بلوں کی ادائیگی کے بعد بھی مناسب رقم بچ رہی۔ اب فرزانہ کے روپے میں اعتماد آ گیا تھا۔ گھریلو ماحول کی کٹھن سے نکل کر جب اسے باہر کی کھلی فضا میسر آئی تو اس کا رنگ روپ نکھرنے لگا۔ اس کا چنچل پن، جو اب تک ازدواجی زندگی کی راکھ میں چنگاری بن کر چھپا ہوا تھا، بھڑک اٹھا۔ اس کے دفتر کے وہ ساتھی جو کبھی دفتر وقت پر نہ آتے تھے اور اگر بھی تنگنا وقت پر آ بھی جاتے تھے تو اس حالت میں ہوتے جیسے بستر سے سیدھے نکل کر آ رہے ہوں، یوں سوئڈ بوئڈ دفتر آنے لگے جیسے روزانہ دفتر میں کوئی ضروری رہی تقریب ہو۔ اس کے سامنے بیٹھنے والے ادھیڑ عمر شیخ صاحب نے جن کے سامنے کے دودانت غائب تھے اور جب وہ بولتے تھے تو جیسے سیٹی سی بجتی تھی، مصنوعی دانت لگوا لیے۔ ادھر ٹیلی فون پر بیٹھنے والی شائستہ تو جیسے جل کر کباب ہو گئی۔ اب اس کو ملنے والی توجہ بھی فرزانہ کو مل رہی تھی۔ باس کے اطوار بھی بدل گئے تھے۔ وہ پہلے ہی ایک خوش پوش جوان تھا مگر اب تو اس کے چہرے پر باقاعدہ رعنائی آ گئی تھی اور اطوار میں بائکنگ عود کر آیا تھا۔

آخر کار چند ماہ بعد خاموش صاحب کو بھی اپنے دفتر میں نوکری مل گئی مگر ان کی تنخواہ معقول نہ تھی۔ ویسے بھی فرزانہ کی تنخواہ سے اتنی رقم پس انداز ہو رہی تھی کہ اگر اس کی ساری تنخواہ پس انداز ہوتی رہتی اور خاموش صاحب کی تنخواہ سے گھریلو اخراجات پورے کیے جاتے تو دو ایک برس میں وہ ایک چھوٹے سے پلاٹ کی ابتدائی ادائیگی کرنے کے قابل ہو جاتے۔ یہ خوشگوار صورتحال دیکھتے ہوئے خاموش صاحب نے فرزانہ سے اپنی شرط کہ ان کو نوکری ملنے ہی وہ نوکری

چھوڑ دے گی، زیادہ شدد سے نہ دہرائی۔

فرزانہ کی فرم بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور فرم کے مالکان نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی ایک شاخ دہلی میں کھول دی جائے۔ اس نئی شاخ کے لیے قریہ قافل جن لوگوں کے نام لکھا ان میں فرزانہ کے باس کے علاوہ اس کا نام بھی شامل تھا۔ یقیناً وہ فرم کی انتظامیہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کو مذمہ داری سونپی گئی کہ اگلے تین ماہ میں دہلی میں نیا دفتر سیٹ کر کے کام شروع کر دیا جائے۔ فرزانہ نے ابتدا یہ خبر خاموش صاحب سے مصطفیٰ چھپائی۔ ویسے بھی گھر کا تصور کر کے خاموش صاحب کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ جب فرزانہ کے پاس کوئی اور چارہ نہ رہا تو ایک رات سونے سے ذرا پہلے اس نے خاموش صاحب کے گلے میں ہاتھیں مائل کرتے ہوئے انہیں خوشخبری سنائی کہ اس کی تنخواہ اصل سے کئی گنا بڑھائی جا رہی ہے۔ جب انہوں نے خوشگوار حیرت سے وجہ پوچھی تو فرزانہ نے انہیں خوشی سے سرشار لہجے میں بتایا کہ اسے دہلی بھیجا جا رہا ہے۔ اس خاص پراجیکٹ کے لیے اسے تین ماہ دہلی میں رہنا ہو گا اور اس کی تنخواہ درہمیں میں ادا کی جائے گی۔ واپسی پر اس کی بیرونی تنخواہ برقرار رکھی جائے گی۔

یہ خبر سن کر خاموش صاحب چپ ہو گئے۔ اس نے بہت لاڈ سے پوچھا ”جان! آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا میری ترقی سے جل گئے؟“ اس کے لہجے میں بناوٹ اور پیار بھرا طرز تھا۔ ”نہیں جلنا کیا ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ میری عمر اب بڑھتی جا رہی ہے، گھر بھی بنتا نظر آ رہا ہے، تم تو ابھی جوان ہو لیکن۔۔۔“ انہوں نے لمبا سانس لیا۔

”لیکن کیا؟“ اس کا لہجہ استغناء پر تھا۔

”دیکھیں یہ کہ ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ اپنے خاندان کو بڑھالیا جائے۔“ انہوں نے بات مکمل کی۔
 ”خاندان تو بعد میں بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔
 ابھی تو گھر بھی بنانا ہے، خود ہی سوچیں کہ اگر میں نے اس آفر کا فائدہ اٹھالیا تو بہت جلد اپنی توقع سے بھی پہلے، ہم اپنا گھر مکمل کر لیں گے۔ بعد میں خاندان بھی بڑھاتے رہیں گے۔“ اس کے لہجے میں خوشامد اور منت تھی۔ ”پلیز جان، پلیز، ہاں کر دیں۔“
 ”ہاں“ خاموش صاحب کے منہ سے یہ ہاں ایک لمبی آہ کی صورت میں نکلی۔

جب تین ماہ بعد فرزانہ دہلی سے واپس آئی تو خاموش صاحب کو گھر میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ پہلے بھی وہ گھر پر ہوتے ہوئے زیادہ تر دفتر سے متعلقہ خیالات میں کھوئی رہتی تھی۔ خاموش صاحب اور فرزانہ کے بیچ عجیب لائقیت سی در آئی تھی، شیشے کی ایک دیواری آگئی تھی۔ پھر وہ پلاٹ کی تلاش اور خریداری میں بھی کچھ مصروف ہو گئے۔ آخر خدا خدا کر کے پلاٹ کی ادائیگی بھی کر دی گئی۔ اس روز خاموش صاحب بہت خوش تھے۔ پلاٹ ایک اچھی جگہ پر بہت اچھے واموں میں آسان اقساط پر مل گیا تھا۔ بہت جلد وہاں بنیادیں کھودی جانے لگیں۔ برسات ابھی دور تھی لیکن خاموش صاحب چاہتے تھے کہ برسات آنے سے پہلے دیواریں کھڑی کر دی جائیں کہ برسات میں پانی بنیادوں میں بھر جاتا ہے۔

اس دوران وہ میسر میں اتنے منہمک ہوئے کہ دفتری کام پر پوری توجہ نہ دے پائے۔ اس کے نتیجے میں ان کی کئی مرتبہ سرزنش کی گئی مگر وہ تو تعمیر کے نشے میں اس طرح چور تھے کہ کسی کی بھی سرزنش کو خاطر میں لانے کا مطلق کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ایک روز یہ حادثہ بھی ہو گیا کہ ان کو اس نوکری سے جو خدا خدا کر کے ٹٹی تھی، فارغ کر دیا گیا۔ یہ حادثہ وہ ایک کڑوے گھونٹ کی طرح پی

گئے مگر اس کو دل سے نہ لگایا اور نہ ہی اعصاب پر سوار کیا۔ بھٹان کی نوکری چلی گئی تھی مگر فرزانہ کی نوکری تو برقرار تھی بلکہ دن دینی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔

ان کی نوکری سے برطرفی کی خبر سن کر فرزانہ نے ان کو بہت حوصلہ دیا اور ان کا دل بڑھایا اور ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ اب وہ اپنی تمام تر توانائیاں گھر کی تعمیر پر صرف کریں۔ اب تک اس کا لب و لہجہ معذرت خواہانہ اور مودبانہ ہونے کی بجائے تحکمانہ ہو گیا تھا۔ اس روز صبح سویرے ہی ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ ابھی ٹھیکیدار اور مزدور کام پر نہ آئے تھے۔ خاموش صاحب کچھ دیر ان کا انتظار کرتے رہے مگر پھر مایوس ہو کر گاڑی میں گھر کی طرف چل دیئے۔ یہ گاڑی فرزانہ نے ان کو قسطوں پر تحفہ لے کر دی تھی جو اس روز کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے دوسرے شہر کا تیار کر گئی ہوئی تھی۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ انہیں خیال آیا کہ گھر جا کر بور ہونے کی بجائے کیوں نہ وہ قریب ہی واقع فانیو شہر ہوٹل میں چائے پی لیں۔ ویسے بھی ان کے اعصاب کو سکون کی ضرورت تھی۔

ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ان کی ایک سرسری نظر اوپر واقع رہائشی کمروں سے نیچے آتی شیشے کی کپسول لفٹ پر جا پڑی۔

کچھ دیر کے لیے ان کی نظر لفٹ پر جم کر رہ گئی۔ اُترتی لفٹ کی جھلک میں فرزانہ اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ میں ایک جوان مرد بھی تھا۔

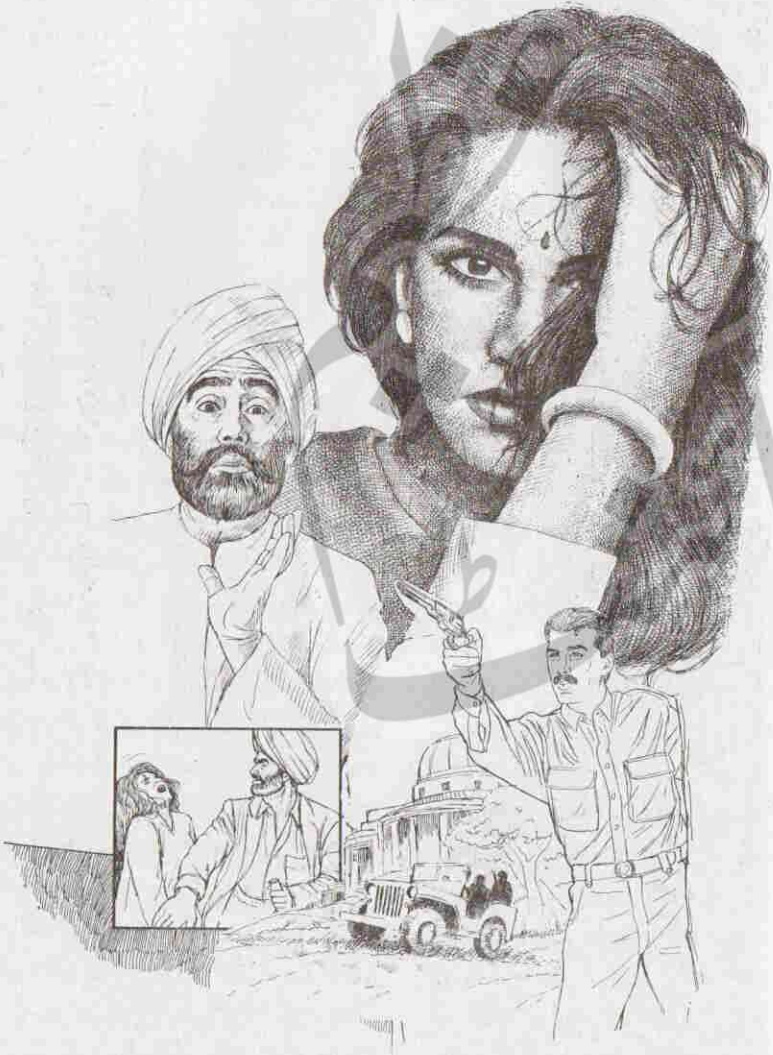
خاموش صاحب نے گھبرا کر اپنی نگاہ دوسری جانب کر لی اور سوچا ”نظریں بھی کیسا دھوکہ دیتی ہیں۔“ باہر بارش ٹک چکی تھی۔

مزدور اب پلاٹ پر آ چکے تھے اور بیڑاری سے خاموش صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔



بھگور

نواز خان



نوا زخان

بھگوڑا

درمیانی عمر کی اس عورت نے شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ قدرت کی نافرمانی کر کے زندگی کی رعنائیوں کو حاصل کرنے کی عادی تھی!

آج جو میں واقعہ آپ کو سنانے لگا ہوں وہ ایک ایسے آدمی کا ہے جو لوگوں کی نظروں میں بھگوڑا تھا لیکن میرے نزدیک..... خیر چھوڑیں یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں جسوت کے قتل کی تفتیش سے فارغ ہوا تھا اور کئی دنوں کے بعد مجھے آرام کا موقع ملا تھا۔ میں تھانے میں فارغ بیٹھا ہوا تھا کہ تین فوجی آ گئے۔ ان کا جو سینئر تھا اس نے تعارف کرایا اور ایک آدمی کا نام لے کر پوچھا کہ وہ اس گاؤں میں رہتا ہے یا نہیں۔ وہ ایک چھاؤنی سے آئے تھے اور دریام سنگھ نام کے جس جوان کا پوچھ رہے تھے وہ چھٹی پر اسی گاؤں آیا تھا لیکن چھٹی ختم ہونے پر جب اپنی چھاؤنی میں واپس نہ گیا تو اس کی تلاش شروع ہو گئی۔ فوج سے بھاگنے والوں کو پہلے تو فوجی خود تلاش کرتے تھے اور پھر مقامی پولیس سے کہہ دیا جاتا

تھا کہ یہ آدمی ملے تو اسے پکڑ کر فلاں جگہ بھیج دیا جائے۔ میرے پاس بھی وہ اسی مقصد سے آئے تھے۔ میں نے انہیں بٹھایا اپنے محرر کو بلایا اور اسے کہا کہ گاؤں کے نمبردار اور دریام کے گھر سے اس کے کسی بھائی وغیرہ کو لے آؤ۔ میں خود ان سے پوچھوں گا۔ فوجیوں نے کچھ دیر تک بیٹھ کر واپسی کی راہ لی اور جاتے ہوئے مجھے پھر تاکید کر گئے کہ میں انہیں اپنی تفتیش بے باخبر رکھوں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے محرر کو دریام کے گھر بھیجا۔ وہ دریام سنگھ کے بھائی اجیت سنگھ کو لے آیا۔ دریام کا گھر انہ کسان گھرانہ تھا۔ باپ بوڑھا تھا لیکن اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مل کر کھیتوں پر محنت مشقت کرتا تھا۔ بھلے مانس اور شریف آدمی کی طرح ہی مجھے یہ اجیت بھی نظر آیا۔ وہ شاید کھیتوں سے واپس آیا

نے ضرور اپنی بیوی کو بتایا ہو گا کہ وہ کہاں جا رہا ہے یا اس کی بیوی بھی بے خبر ہے تو دریام گاؤں اور چھاؤنی کے درمیان کہیں غائب ہو گیا ہے یا مار دیا گیا ہے۔

میرا اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کرنا ضروری ہو گیا۔ میں نے اجیت سے کہا کہ وہ اپنی بھر جانی کو لے کر آئے۔

اجیت گھر جا کر بھر جانی کو لے کر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ یہ گاؤں کی عورتوں سے ذرا مختلف نظر آ رہی تھی۔ دیہاتی عورتیں دیکھنے میں ہوشیار نہیں لگتیں۔ یہ عورت شکل سے ہی ہوشیار چالاک لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا اور سیدھا سوال کیا کہ دریام اور تم شیش تک گئے تھے۔ وہ وہاں تک تمہارے ساتھ تھا اس کے بعد غائب ہو گیا ہے وہ جہاں کہیں گیا ہے تمہیں بتا کر گیا ہے؟ وہ میرا سوال سن کر میری طرف دیکھتی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ کیا جواب دے۔ پھر کہنے لگی ”ہم دونوں شیش تک گئے تھے وہاں ہم گاڑی کے انتظار میں بیٹھے رہے جب گاڑی آ گئی تو دریام اس میں بیٹھ گیا اور میں اس کے چلنے کا انتظار کرتی رہی پھر گاڑی گئی تو گاؤں واپس آ گئی تھی۔ وہ مجھے تو نوکری پر جانے کا ہی بتا کر گیا ہے۔“

مجھے نظر آ رہا تھا کہ یہ عورت یا تو بچی ہے۔ اس لیے بڑے یقین کے ساتھ بات کر رہی ہے اور اگر معاملہ خراب ہے تو بڑی پکی ہے۔ اس طرح کی عورتوں کو توڑنا اتنا ہی اور ایسے ہی مشکل ہوتا ہے جس طرح پیشہ ور مجرموں کو توڑنا مشکل ہوتا ہے اور پھر عورت اپنے عورت ہونے کا فائدہ بھی اٹھاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر

ہی تھا جب محرر اسے تھانے لے آیا تھا کیونکہ اس کے کپڑوں پر مٹی لگی ہوئی تھی اور حلیہ ایسا تھا جیسے سخت محنت کر کے آیا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ دریام چھٹی آیا تھا ابھی تک واپس اپنی چھاؤنی نہیں پہنچا۔ وہ کہاں گیا ہے۔ تم لوگوں کو پتہ ہے کہ دریام کا اس طرح واپس نوکری پر نہ جانا جرم ہے اور اس کی سزا ملتی ہے؟ اگر تمہارا بھائی کسی رشتہ دار کے گھر چھپا ہوا ہے یا اپنا اتار دیتا کر گیا ہے تو مجھے بتا دو ورنہ جب وہ مل گیا تو گرفتار ہو جائے گا۔ اجیت یہ باتیں سن کر پریشان ہو گیا۔ پہلے تو اس نے پاؤں سے جوتی اُتاری۔ زمین پر آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا ”بھائی دریام چھٹی آیا تھا لیکن وہ تو واپس چلا گیا ہے اپنی نوکری پر وہ کہیں نہیں بھاگا۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ چھاؤنی سے اسے فوجی تلاش کرنے آئے تھے وہ چھاؤنی نہیں گیا۔ میری اس بات سے اجیت زیادہ پریشان ہوا۔

”مہرگار آپ میری بات مان جائیں۔ دریام گھر سے واپس نوکری پر ہی گیا تھا۔ جس دن وہ گیا ہے اس دن باپو اور میں نے اسے شیش تک چھوڑنے جانا تھا لیکن اس کی گھر والی اور وہ کہنے لگے کہ وہ اکیلے ہی جائیں گے۔ باپو نے مجھے کہا ٹھیک ہے ان دونوں کو ہی جانے دو۔ دریام اور اس کی گھر والی اور میری بھر جانی سندھیا پیدل ہی شیش گئے تھے۔ سندھیا سے پوچھ لیں۔ وہ خود شیش پر جا کر ریل گڈی پر چڑھا کر آئی تھی۔“ بڑا عجیب معاملہ تھا میرے لیے۔ فوجی کہہ گئے تھے کہ دریام آیا نہیں اس کا بھائی کہہ رہا ہے کہ وہ گھر سے نوکری پر گیا ہے۔ اس کی بیوی اسے خود شیش چھوڑنے لگی تھی۔ اب وہی صورتیں تھیں۔ اگر دریام بھاگا ہے تو اس

گئی لیکن جب سورج کافی چڑھ آیا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ باپو اور ماما بھی پریشان ہو گئے۔ میں اسے تلاش کرنے باہر نکل گیا۔ گاؤں کے سارے ہی گھروں میں پتہ کیا۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ میں اسی پریشانی میں آپ کے پاس نہیں آیا۔ بھر جانی کو ہی تلاش کرتا رہا ہوں۔“

اجیت نے جوابات بتائی تھی مجھے تو پہلے ہی اس عورت پر شک تھا۔ اگر وہ کسی غلط کام میں ملوث نہیں تھی تو اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب میرے پہلے والے شک کے ہو گئے کہ اگر وریام خود غائب ہوا ہے تو اس عورت کو پتہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور اب یہ بھی اس کے پاس چلی گئی ہے اور اگر وریام خود غائب نہیں ہوا تو بھی اس عورت کو معلوم ہے اور کیا پتہ کہ اس کے غائب ہو جانے میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔ میں نے اجیت سے کہا کہ تم نے اپنی بھر جانی کو تو تلاش کرنا ہی ہے لیکن یہ اب بہت ضروری ہو گیا ہے جب تک وہ نہیں ملتی مجھے آکر بتاتے رہنا کہ تم کہاں کہاں گئے ہو۔

اجیت چلا گیا۔ وہ کب بھر جانی کو تلاش کر لاتا۔ اسے ملتی بھی یا نہیں لیکن یہ بات میرے دماغ پر سوار ہو گئی تھی کہ وریام کہاں چلا گیا۔ میرا ذہن بار بار بھٹک کر اس طرف چلا جاتا کہ اسے قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ جب میں یہ بات سوچتا تو اسے تلاش کرنے کی دھن اور میرے ذہن پر سوار ہو جاتی۔ اجیت کو گئے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا ہو گا جب مجھے سخت بے چینی ہو گئی کہ اس طرح تو بات کھوہ کھاتے چلی گئی ہے۔ اگر اجیت واپس ہی نہیں آتا تو کیا یہ معاملہ ختم ہو گیا؟ اسی بے چینی میں میں نے خود اجیت کو بلوایا۔ وہ آکر کہنے لگا کہ سندھیا کہیں نہیں ملی۔ کسی رشتہ دار کو معلوم نہیں۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ وہ مزید تلاش نہیں کر سکتا اس کے

آج میں نے سختی نہ کی تو شاید یہ اصل بات نہ بتائے اس لیے میں نے سخت لہجے میں اسے کہا کہ وہ گھر جائے اور کل اجیت کے ساتھ آکر مجھے بتانا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ میاں بیوی واقعی سٹیشن گئے تھے یا نہیں۔ وریام گاؤں سے ہی غائب ہو گیا ہو اور تم نے کہانی گھڑی ہو کہ تم خود اسے گاڑی پر چڑھا کر آئی تھی۔ اجیت اسے بازو سے پکڑ کر گھر لے گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ کسی بھاگنے والے فوجی کا عام معاملہ نہیں بلکہ مجھے اس میں کسی جرم کی بو آ رہی تھی۔ سندھیا کو دیکھ کر میرا یہ احساس کیوں زیادہ ہو جاتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے جس میں یہ عورت بھی ملوث ہو سکتی ہے۔

دوسرے دن میں تھانے آیا سارا دن کاموں میں گزر گیا۔ شام کے وقت مجھے یاد آیا کہ اجیت اور سندھیا نے میرے پاس آنا تھا وہ نہیں آئے۔ میں نے محرو کو بلوایا اور کہا کہ اس فوجی کے گھر آدمی بھیجو اور اس کے بھائی کو بلاؤ وہ آیا نہیں۔ محرو نے آدمی بھیج دیا۔ میں انتظار کرتا رہا اور گھر جانے ہی والا تھا کہ سپاہی اجیت کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے اجیت سے پوچھا وہ اکیلا کیوں آیا ہے۔ اپنی بھر جانی کو ساتھ کیوں نہیں لایا۔ اس سے جو باتیں میں نے پوچھی تھیں ان کا جواب اس نے مجھے دینا تھا۔ اجیت نے آنکھیں پٹی کی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے۔ پوچھنے پر کہنے لگا ”کل جب یہاں سے ہم گھر واپس گئے تو بھر جانی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے رات روٹی بھی نہیں کھائی۔ کہنے لگی اس کی طبیعت خراب ہے۔ پھر میں ایسا سو گیا کہ در سے اٹھا۔ میں نے بھر جانی کی چار پائی خالی دیکھی۔ میں نے سمجھا کہ باہر گئی ہے اچھی آجائے

کھیتوں کے کام میں حرج ہو رہا ہے۔ میں نے محروم سے پوچھا کہ اس کا کیا خیال ہے۔ ادھیڑ عمر کا یہ آدمی بہت سمجھدار تھا کہنے لگا اگر کسی بدمعاش کا معاملہ ہوتا تو میں کوئی خبر لے آتا چونکہ یہ معاملہ عورت کا ہے اور ہمیں معلوم بھی نہیں کہ وہ کس طرح کی عورت ہے۔ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا کردار اچھا نہیں کیونکہ اس کے خاوند کے گم ہو جانے کے بعد جس طرح واقعات ہوئے ہیں ان سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اس عورت کا بھی کوئی تعلق ہے۔ میرے نزدیک اس کا کردار مشکوک ہے۔ اس لیے میں وہ عورت آپ کے پاس یہاں لاؤں گا جسے گاؤں کی عورتیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں اور وہ ان کے گھروں میں لڑائیاں ہونے کی وجہ بن چکی ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کسی عورت ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اسے لے آؤ اور میری اس سے بات کرا دو۔ وہ اسی وقت چلا گیا۔

ایک دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ درمیانی عمر کی اس عورت نے اپنا نام رکنی بتایا تھا۔ اسی گاؤں میں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ محروم کے بقول اچھے کردار کی نہیں تھی شاید شادی نہ ہونے کی بھی یہی وجہ ہو۔ بہر حال مجھے اس کے کردار سے کیا لینا تھا مجھے تو سندھیا کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں۔ یہی بات میں نے اس سے پوچھی بھی۔ وہ کہنے لگی کہ وہ پتہ کر کے بتائے گی۔ بڑی باتونی عورت تھی۔ ایک بار شروع ہو جاتی تو چپ نہیں کرتی تھی۔ وہ مجھے گاؤں کی ایسی باتیں سنائے لگ گئی جو میں نے اس سے نہیں پوچھی تھیں۔ میں نے کہا کہ مجھے صرف سندھیا کے بارے میں جانا ہے وہ کہاں نکل گئی ہے اور کیسی ہے؟

اس بات کو دو تین دن گزر گئے تھے کہ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ یہ تو پتہ نہیں کہ سندھیا کہاں ہے لیکن جو بات مجھے معلوم ہے وہ بتانے آئی ہوں۔ جس آدمی کے ساتھ سندھیا کے تعلقات ہیں اسے جانتی ہوں۔ جس دن میں پہلے آپ کے پاس آئی تھی اسی دن بتانا چاہتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ہمت نہیں پڑی۔ گھر جا کر سوچا ہے تو مجھے کوئی ڈر نہیں لگا۔ ہمارے اسی گاؤں کا آدمی ہے جاکر۔ سندھیا اس سے ملتی ہے۔ میں نے خود دیکھا بھی ہے اور جانتی بھی ہوں۔ جاکر بڑا خراب آدمی ہے وہ جس عورت سے ملتا ہے سمجھ لیں کہ وہ خراب عورت.....“ وہ بولتے بولتے رُک گئی شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ خود بھی جاکر کو جانتی ہے۔ ”آپ کو پتہ ہے کہ سندھیا نے اپنے گھر والے کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے جاکر کے ساتھ دوستی بنالی۔ وریام تو مہینوں کے بعد چھٹی پر آتا تھا اور سندھیا جاکر کے ساتھ پھرتی تھی۔“

”وریام جانتا ہے کہ جاکر اور سندھیا کے تعلقات ہیں؟“

”اس کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن جن دنوں وریام چھٹی آیا ہوتا سندھیا زیادہ عرصہ گھر میں ہی رہتی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعلقات وریام نہیں جانتا ہوگا۔“

”تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ تعلقات ہیں؟“

”جس آدمی نے جرم کیا ہوتا ہے آپ اسے کس طرح پکڑ لیتے ہیں؟ آپ کو یہ کام آتا ہے۔ اسی طرح یہ باتیں ایک عورت کی نظروں سے کیسے چھپ سکتی ہیں؟“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ایسی باتیں تو چھپ نہیں سکتیں اور وہ بھی ایک ایسی عورت کی نگاہوں سے

جو چلتی پھرتی رہتی ہو۔ ایسی عورتوں کی نگاہیں گھروں کی دیواریں نہیں روک سکتیں۔ میں نے محروم کو بلا کر کہا کہ کوئی آدمی اس عورت کے ساتھ بھیج دو یہ اسے ایک آدمی کا گھر دکھا دے گی۔ وہ سپاہی صرف جا کر گھر دیکھ آئے۔ مجھے بعد میں اس کی ضرورت پڑے گی۔ محروم سمجھ گیا کہنے لگا میں آدمی بھیج دیتا ہوں اس نے اس عورت کو میرے پاس سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

رکنی نے مجھے ایک نئی راہ پر لگا دیا تھا۔ میرا تجربہ کہتا تھا کہ رکنی کی دکھائی ہوئی یہ راہ بالکل ٹھیک جگہ جائے گی۔ جو آدمی غائب ہوا تھا وہ خبر نہیں تھا نہ ہی اسے کوئی جیب میں ڈال کر لے گیا۔ وہ فوجی جوان تھا۔ اسے کوئی ورغلا کر تو غائب کر سکتا ہے مگر دوسری کوئی صورت نہیں اور اگر سندھیا کسی سے تعلقات تھے تو یہ ورغلانا ہی ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ورغلانے والا کون تھا؟ میں غور کرنے لگا۔ جاکر کو میں چاہتا تو سیدھے سیدھے جا کر پکڑ کر تھانے لے آتا یا سپاہی بھیج کر منگوا لیتا لیکن اس طریقے کی بجائے چھپ کر دیکھنا اور رکنے ہاتھوں پکڑنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح کروں گا۔ شام ہوئی تو میں نے سر پر پگڑی باندھی۔ حلیہ بدلا اور دیہاتیوں جیسے لباس میں گاؤں کی اس دکان پر چلا گیا جہاں سودا بھی بکتا تھا اور جس طرح آج کل ہوٹل ہوتے ہیں اسی طرح وہاں چوری چھپے دارو (شراب) بھی ملتی تھی۔ جاکر کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا اس قماش کا آدمی ضرور ایسے اڈے پر جاتا ہوگا۔ میں دکان پر جا کر اس کے سامنے بڑے درخت کے نیچے چھپی بہت سی چار پائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد دکان پر بیٹھے ہوئے لالے سے رازدارانہ انداز

سے پوچھا کہ دارو مل جائے گی؟

”پروہی ہو۔ میرا مطلب ہے مسافر ہو؟“ اس لالے نے اپنی پگڑی کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک رومال سا اپنی نڈ پر پگڑی کی طرح باندھ رکھا تھا۔

میں نے اس کے سوال کے جواب میں سر ہلایا۔ لالے نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کسی کو آواز دی۔ ایک سوکھا سڑا لڑکا اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ لالے نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگا۔ ”جاکر آیا ہے؟“ اس لڑکے نے انکار میں سر ہلایا۔ دکاندار لالے نے آہستہ سے ایک گالی دی۔ پھر مجھے دیکھنے لگا۔ ”میرے پاس جل پانی ختم ہو گیا ہے وہ آدمی نہیں ہے جس سے یہ ملتا ہے۔“ میں نے لالے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے کوئی بات نہیں۔ میں جاتا ہوں اور میں وہاں سے چل پڑا۔ سیدھا تھانے واپس آیا۔ محروم سے کہا کہ وہ سپاہی میرے ساتھ کرو جو جاکر کا گھر دیکھ کر آتا تھا۔ اس سپاہی کو ساتھ لے کر میں جاکر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں خود گھر کے باہر کھڑا رہا اور سپاہی سے کہا کہ اندر کو جاؤ اور دروازہ کھول دو۔ اگر کوئی اندر ہو تو اسے باہر لے آؤ۔ وہ دیوار سے اندر کود گیا اور دروازہ کھول دیا۔ اچھا خاصہ کھلا کھن نظر آ رہا تھا جس میں ایک طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ شاید تین چار درخت ایک ہی جگہ اگے ہوئے تھے۔ باہر والے دروازے کے اندر کی طرف تین چار کچے کمرے تھے جن کے لکڑی کے دروازے بند تھے۔ یہ بہت بڑا مکان تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ جاکر صاحب حیثیت آدمی تھا اور اس کے پیٹے کا مجھے پتہ چل چکا تھا کہ شراب کا دھندا کرتا ہے۔ خبر میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھڑکایا۔ کسی کے

کھانسنے کی آواز آئی اور وہ دروازے کی طرف آیا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ اتنا بڑا گھر لیکن خاموشی تھی یا جاگھر کے اس گھر میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ کھانسی کی آواز دروازے تک آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ یہ کوئی دیہاتی آدمی تھا جس نے ہاتھ میں بتی پکڑ رکھی تھی۔ میں نے جاگھر کو دیکھا نہیں تھا لیکن یہ جو کوئی بھی تھا جاگھر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بابا ہونے کے قریب تھا۔ سندھیا جیسی جوان عورت کے ساتھ اس کے تعلقات نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھچھا بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے آرام سے ایک طرف کیا اور اندر چلا گیا۔ سپاہی میرے پیچھے تھا۔ اندر جیسا کہ دیہات کے گھروں میں ہوتا ہے چار پائیاں تھیں میں ایک پر بیٹھ گیا۔ بابا بھی مڑ کر میرے سامنے آکھڑا ہوا اس نے بتی ایک طرف رکھ دی وہ ابھی تک چپ تھا۔ شاید اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ میں نے ہی اس سے بات کی ”جاگھر کہاں ہے؟“

”دو دن پہلے کہیں گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہیں جا رہا ہوں۔“

”تم کون ہو؟“

”مرہڑا۔ جاگھر کا زمینوں کا حساب کتاب رکھتا ہوں۔ اس نے مجھے چاہنا یا ہوا ہے۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ سندھیا بھی غائب ہو گئی اور اب یہ جاگھر بھی۔ اگر انہوں نے کچھ نہیں کیا ہے گناہ ہیں اور ان کا دریا م کے کم ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو غائب کیوں ہو گئے ہیں؟ مجھے رکنی کی بات کا یقین ہو گیا۔ سندھیا اور جاگھر میں تعلق تھا۔ مجھے یاد نہیں کتنے دن گزرے تھے لیکن کافی دنوں کے بعد مجھے محسوس ہونے ہی بتایا تھا کہ جاگھر گھر آ گیا ہے۔ اسے یہ بات گاؤں میں اپنے خجروں

سے میرا کیا تعلق ہے۔“

”تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی لیکن مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تمہارا دریا م کی بیوی سندھیا سے کیا تعلق ہے اور اس کے گھر والے بھی شک کر رہے ہیں کہ تم نے اسے کہیں غائب کر دیا ہے۔“ میں نے اس کے ساتھ دریا م کی بات کرنے کی بجائے یہ پتہ چھینکا کہ اس نے سندھیا غائب کر دی ہے۔

اس نے انکار میں سر ہلایا اور چپ کر کے بیٹھ گیا۔ گویا اس طرح ظاہر کرنے لگا کہ اسے کوئی پرواہ نہیں میں جو مرضی کہتا رہوں۔ اس کے اس انداز سے مجھے گری چڑھ گئی اور میں نے اسے کمرے میں لے جا کر اچھی طرح دھنک دیا۔ جس طرح کا خود سر وہ آدمی تھا ایسے لوگ اسی طریقے سے قابو آتے ہیں۔ دھلائی کے بعد اسے عقل آئی کہ وہ تھانے میں ہے اپنی حویلی میں نہیں۔ اب اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ ”دریا م کی گھر والی سندھیا کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس کا گھر والا فوجی ہے، چھٹی پر آتا رہتا ہے، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اس کی میرے ساتھ دشمنی ہو گئی ہوتی لیکن آپ پورے گاؤں سے پوچھ لیں میرا اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ نہ میں کبھی دریا م کے ہوتے ہوئے اس کے گھر گیا ہوں۔ میرا سندھیا سے کوئی تعلق نہیں اگر وہ کہیں غائب ہوئی ہے تو مجھے نہیں پتہ۔ اس گاؤں سے اگر کوئی عورت غائب ہوئی ہے تو میرا اس سے کیا تعلق۔ رہی یہ بات کہ اس کے گھر والے کہتے ہیں کہ میں نے اسے کہیں غائب کر دیا ہے تو بکواس کرتے ہیں۔ ابھی شاید وہ مجھ پر کرم کر رہے ہیں کہ صرف سندھیا کے ساتھ میرا نام لیا ہے کل کو کہیں گے کہ شاید دریا م کو میں نے غائب کر دیا ہے۔ اس چھاؤنی سے اٹھا کر لے گیا ہوں۔ دریا م

اور سندھیا گڈی گڈی گڈی نہیں کہ میں انہیں اٹھا کر لے گیا ہوں۔ جناب دریا م کے گھر والے بڑے ڈھونگی ہیں ذرا دریا م کے بھائی کو چھتر لگائیں وہ بتا دے گا کہ سندھیا کہاں گئی ہے۔ مجھ غریب کو آپ نے خواہ مخواہ پکڑ لیا ہے۔“

جاگھر نے جس طرح بات کی اس سے میں بھی ڈول گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی بے گناہ ہو۔ میں نے اسے صرف اس عورت کے کہنے پر پکڑا تھا جس کا اپنا کردار بہت مشکوک تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جاگھر کے ساتھ اپنی کوئی دشمنی رکھتی ہو اور اس نے یہ موقع غنیمت جانا ہو بدلہ لینے کا۔ خیر میں نے جاگھر کو دو دن اپنے پاس رکھا اور مسلسل پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن اس سے کچھ نہیں نکلا۔ یا تو وہ بے گناہ تھا یا بڑا سخت آدمی تھا۔ میں نے اس پر وہ حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا جو اسی طرح کے سخت جان لوگوں پر آزماتا رہا ہوں اور یہ حربہ کامیاب ثابت ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اسے چھوڑ دوں جب وہ خود کو آزاد سمجھنے لگے گا اور غلط حرکت کرے گا تو اسے رگے ہاتھوں پکڑ لوں گا۔ اسی خیال سے میں نے جاگھر کو آزاد کر دیا۔

جاگھر کو چھوڑ کر میں نے دریا م کے بھائی اجیت کو سامنے رکھا۔ کیا یہ شخص دریا م کی گمشدگی کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ جائیداد وجہ ہو سکتی ہے یا گھریلو جھگڑا۔ اجیت غیر شادی شدہ تھا اسے دولت کی طلب بھی ہو سکتی تھی ایسے غیر شادی شدہ آدمی شراب جوئے کی لت میں پڑ جائیں تو جائیدادیں بیچ دیتے ہیں۔ ایسی ہی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی دریا م نے مخالفت کی ہوگی اور اس نے دریا م کو غائب ہی کر دیا ہو یا پھر سندھیا..... کے ساتھ تعلقات.....؟ میں نے ایسے سکھ گھرانے دیکھے تھے جہاں بھائی کو اس کے دیور وہ احترام نہیں دیتے تھے جو دوسرے

آگئی۔ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھے ہی وقت ضائع نہیں کیا کہنے لگی ”سندھیا جا کر کے گھر آئی ہے۔“ میرا دوران خون تیز ہو گیا۔ میں نے اسے ٹوکا نہیں بولنے دیا۔ ”اس نے کالی چادر سے جسم ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ اپنی چال کسی طرح نہیں چھپا سکتی تھی۔ کم از کم مجھ سے نہیں۔ میں جا کر کے گھر سے دو گھر آگے تھی۔ میں جھٹ اس گھر کی ڈیوڑھی میں گھس گئی۔ سندھیا مجھے نہیں دیکھ سکی۔ وہ جا کر کے گھر میں گئی اور میں بھی اس کے پیچھے ہوئی۔ پہلے تو خیال آیا کہ اندر جاؤں لیکن پھر آپ کی طرف چلی آئی۔ میرا خیال ہے اس وقت موقع ہے چل کر دونوں کو پکڑ لیں۔“

میرا جو شک تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی میرے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ جا کر کو چھوڑ کر میں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ جا کر نے مجھ سے آزاد ہوتے ہی کام شروع کر دیا تھا اور وریام کی لاش ملنے کے بعد سندھیا بھی جہاں کہیں تھی نکل آئی تھی۔ اسے لاش ملنے کی اطلاع کس نے دی؟ جا کر نے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جا کر کا اس دوران سندھیا سے پورا رابطہ تھا۔ یہاں تھانے بیٹھ کر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے رکنی سے کہا کہ وہ یہیں تھانے میں بیٹھے میں آتا ہوں۔ میں نے جلدی سے دو سپاہی ساتھ لیے اور جا کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار ہم میں سے کسی کو دیوار کے راستے اندر نہیں جانا پڑا بلکہ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دروازہ کھڑکائے بغیر ہی سپاہیوں کے ساتھ اندر گھس گیا۔ صحن میں ہی جہاں درخت اکٹھے آگے ہوئے تھے وہاں مجھے چار پائی پر مرحدار بیٹھا نظر آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف آ گیا۔ قریب آتے ہی میں نے اس سے پوچھا کہ جا کر کہاں ہے؟ ”وہ جی

سے بڑا کام شروع ہو گیا۔ وریام خود تو اس کنویں میں جا کر نہیں سو گیا تھا۔ اسے کسی نے کنویں میں پہنچایا تھا۔ وہ قتل ہوا تھا اور اب مجھے اس کے قاتل کو بھی پکڑنا تھا۔ اگلے دو دن بڑے مصروف گزرے۔ فوجی بھی آگئے تھے۔ وہ اجیت سے مل کر میرے پاس آئے۔ کاغذی کارروائی ہوئی۔ اجیت بھی کریا کرم سے فارغ ہو کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پرچہ درج کروائے۔ اس کے بعد آگے چلتے ہیں۔ اس نے پرچے میں سندھیا کو اپنے بھائی کی قاتل نامزد کر دیا۔

وریام کے قتل میں نامزد ملزمہ سندھیا غائب تھی اور اس کا عاشق جو میرے نزدیک ابھی تک مشتبہ تھا وہ بھی غائب ہو جاتا تو میرے پاس کیا بچتا۔ اس لیے میں نے جا کر کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ وریام کے قتل میں ملوث تھا تو اب وریام کی لاش مل جانے کے بعد وہ ضرور کوئی حرکت کرے گا۔ اسی خیال سے میں نے رکنی کو بلا کر ہوشیار کر دیا اور اسے خاص تاکید کی کہ وہ جا کر پر نظر رکھے۔ وہ جا کر جیسے شوٹین مزاج آدمی کے گھر بلا روک ٹوک جا نکلتی تھی اس لیے دوسری طرح کی نگرانی کے مقابلے میں اس کی نگرانی زیادہ موثر ہو سکتی تھی تاہم میں نے صرف رکنی پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ جا کر کے گھر کے باہر اپنے سپاہیوں کا پہرہ بھی لگا دیا۔ چلتے پھرتے یہ سپاہی عام طور پر نظر میں نہیں آتے۔ وہ چونکہ پیشہ ور ہوتے ہیں اس لیے اپنا کام بہتر طریقے پر کرتے ہیں لیکن کبھی وہ ناکام بھی ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ عام آدمی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وریام کے معاملے میں وہ ناکام رہے اور رکنی کامیاب ہو گئی۔

دوپہر کا وقت تھا جب رکنی میرے پاس تھانے

کھڑے تھے جو فوج کی وید کو سنائی ہوئی کہانی سن کر اس کے پیچھے تھانے چلے آئے تھے۔ میں نے وہی آدمی ساتھ لے کر فوج کو آگے لگایا اور ویران کھوہ پر پہنچ گئے۔ یہ کھوہ کسی زمانے میں کسی عمارت کا حصہ رہا ہو گا کیونکہ اس عمارت کے کھنڈر ابھی تک موجود تھے۔

گاؤں کے آدمی بڑے ہوشیار تھے وہ شیٹن سے جا کر قلیوں سے رسیوں کا بندوبست کر لائے۔ اس طریقے سے انہوں نے لاش کنویں سے نکال لی کہ میں حیران رہ گیا۔ دیہات میں اکثر جانور کنوؤں میں جا گرتے ہیں اور دیہاتی انہیں نکالنے کے ماہر ہوتے ہیں انہوں نے لاش بھی اس طریقے سے باہر نکال لی۔ اس سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔ چہرہ بگڑ کر عجیب طرح کا ہو گیا تھا۔ میں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ شناخت کریں لیکن وہ نہیں کر سکے۔ پھر میں نے ان میں سے دو آدمی گاؤں بھجوا دیے کہ وہ وہاں جا کر بتائیں کہ لاش ملی ہے جو چاہتا ہے آکر شناخت کرے۔ اجیت بھی آ گیا۔ وہ لاش کو ادھر ادھر سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی گئی اور پھر یکایک وہ رونے لگ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے تم نے پہچان لیا ہے یہ کون ہے؟ اس نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھا ہوا تھا دوسرے سے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ”یہ بھڑیا ہے جی۔“

گویا یہ مرنے والا وریام سنگھ تھا۔ جس آدمی کی مجھے فورجیوں کو تلاش تھی وہ مل گیا تھا لیکن مردہ حالت میں اور حالت بھی ایسی کہ میں نے اجیت سے کہا کہ میں جاتا ہوں تم نے اس کا جو کرنا ہے کر کے فارغ ہو کر میرے پاس آنا۔ تھانے جا کر میں نے کاغذات بنائے۔ فوجی جو پتہ مجھے دے گئے تھے اس پر اطلاع کی۔ تلاش کا کام تو ختم ہو گیا لیکن اس

مذہب میں اور معاشرے میں دیا جاتا ہے۔ سکھوں کی ایک الگ ہی معاشرت اور رواج ہیں۔ اپنے شک مٹانے کے لیے میں نے اجیت کے باپ بشن سنگھ کو بلایا اور پورے دو دن اس سے جرح کرتا رہا۔ مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی کہ اجیت اور وریام میں کوئی جھگڑا دشمنی رہی ہو۔ سندھیا کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق ضرور تھا لیکن اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ وریام سنگھ کو میں نہ جانے کب تک تلاش کرتا رہتا لیکن اسی گاؤں کے موچی فوجا سنگھ نے میری مشکل دور کر دی۔ میں صبح تھانے آیا ہی تھا کہ یہ آدمی میرا انتظار کر رہا تھا۔ محرر مجھے دیکھتے ہی آگیا کہنے لگا یہ آدمی ایک لاش ملنے کی اطلاع لے کر آیا ہے۔ میں نے اس کی بات سنی۔ فوجا سنگھ نام کا یہ آدمی اپنے ایک رشتہ دار کو گاڑی پر سوار کرانے شیٹن گیا۔ راستے میں واپسی پر وہ شیٹن کے پاس ویران جگہ کنویں کے پاس ٹھک کر آرام کرنے بیٹھ گیا لیکن اسے بدبو سی محسوس ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید قریب ہی کوئی مرا ہوا جانور ہو گا لیکن انجانے احساس کے تحت اس نے کنویں میں جھانکا۔ بدبو اس جگہ سے آرہی تھی اور یہ کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی لاش سے اٹھ رہی تھی۔ فوجے موچی کو مرے ہوئے آدمی کی ٹانگیں صاف نظر آرہی تھیں کیونکہ یہ ٹانگیں کنویں کی دیوار کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ فوجے نے دوبارہ وہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں سمجھا تھا اور بھاگ بھاگ گاؤں واپس آ گیا۔

ویدکسی رام نے اسے تھانے جانے کا کہا اور فوجا سنگھ میرے پاس آ گیا۔ میں نے فوجا سنگھ سے کہا کہ جاؤ بندے لے کر آؤ۔ اسے گاؤں نہیں جانا پڑا۔ تھانے سے باہر ہی گاؤں کے آٹھ دن آدمی

ہے۔ تم اس کے قتل کا اقرار کر لو۔ میری مار کے باوجود جا کھر مان نہیں رہا تھا کہ اس نے اور سندھیا نے مل کر وریام کو مارا ہے۔ جب اس نے حد سے زیادہ مار کھالی اور اسے خود بھی معلوم ہو گیا کہ اب اس میں سکت نہیں رہ گئی تو کہنے لگا کہ واقعی جب آپ آئے اس سے تھوڑی دیر پہلے تک سندھیا اس کے پاس تھی لیکن وہ زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں آئی تھی اس نے میرے ساتھ صرف یہ بات کرنی تھی کہ میں اسے چھپنے کا کوئی اچھا ٹھکانہ دے دوں۔ گاؤں سے چھ سات میل پرے میری زمین ہے اور وہاں میرا چھوٹا سا ڈیرہ ہے جہاں میرے تین آدمی رہتے ہیں۔ سندھیا چاہتی تھی کہ میں اسے وہاں رہنے دوں لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ آپ سے چھپتی پھر رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ اس لیے میں اب اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ اس وقت تک وہ میرے یار کے گھر چھپی رہی ہے اور اس اجیت حرامی کو سب پتہ ہے کہ سندھیا کہاں تھی۔ میں نے سندھیا کو بتا دیا ہے کہ پولیس مجھے بھی پکڑ کر تھانے لے جا چکی ہے۔ اس لیے میرا اس سے تعلق ختم۔ میرے انکار کے بعد وہ فوراً ہی میرے گھر سے چلی گئی۔

”تمہارا اور سندھیا کا آخر تعلق کیا ہے؟“

میرے اس سوال پر وہ کہنے لگا کہ اصل میں سندھیا اجیت کے ساتھ خراب ہے اور مجھے اس کا پتہ چل گیا کیونکہ وہ فوجی تو بہت دیر سے گاؤں چھٹی پر آتا ہے اور میں نے کئی بار اجیت اور سندھیا کو زمینوں پر پکڑا ہے۔ اس لیے سندھیا اور اجیت میرے سامنے بول نہیں سکتے اور سندھیا مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے پاس بھی آتی رہتی ہے..... بس میں نے آپ کو سچی بات بتا دی ہے۔ اب آپ چاہیں تو مجھے

کوٹھے کے اندر ہے۔“ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور کچے کروں کی طرف بڑھا۔ ایک چارپائی پر گاؤں تک لگائے جا کھر نیم دراز تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً چارپائی سے ٹانگیں پیچے کیں، جوتی پہنی اور کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ میں اسے اسی طرح حیران چھوڑ کر باہر کی طرف آیا اور سپاہیوں کو آواز دی کہ باہر والا دروازہ بند کر کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لو اگر کوئی عورت ہو تو اسے باہر نہیں جانے دینا پکڑ کر اسے میرے پاس لے آؤ۔ جا کھر والا یہ کہہ کر وہ خالی تھا۔ جا کھر کہنے لگا ”جناب کے تلاش کر رہے ہیں؟“

”سندھیا کو جو ابھی یہاں آئی تھی۔ تم نے اسے کہاں چھپا دیا ہے؟“

”آپ کو کسی نے غلط کہا ہو گا۔ سندھیا یہاں نہیں ہے اور نہ ہی میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔“

میرا خون کھول گیا۔ یہ رکنی مجھے بیوقوف بنا رہی ہے یا جا کھر بنا رہا ہے۔ مجھے تماشہ بنا رکھا ہے انہوں نے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جا کھر کو گلے سے پکڑ لیا اور شروع ہو گیا۔ اتنی دیر میں سپاہی میرے پاس آ گئے، کہنے لگے سارا گھر چھان مارا ہے کوئی عورت نہیں ہے یہاں۔ میں سوچنے لگا اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھیا تو یہاں آئی ہی نہیں یا پھر آ کر نکل گئی ہے۔ اب یہ جا کھر ہی بتا سکتا ہے کہ کیا ہوا اور اس سے پوچھنے کے لیے میں ایک بار پھر اسے تھانے لے گیا۔ جا کھر کو تھانے لا کر میں نے خود اس کا بھرکس نکالا۔ میں اس سے پوچھتا کہ اس نے سندھیا کو کہاں غائب کیا ہے۔ میرے تمہارے گھر جانے سے پہلے وہ تمہارے گھر میں موجود تھی۔ تم نے اسے غائب کیا ہے۔ تم اور سندھیا ملے ہوئے ہو اور تم لوگوں نے وریام کو مارا

جان سے مار دیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“
رکنی نے جاکر اور سندھیا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ سچ ہوتے ہوئے بھی سچ نہیں تھا اور اجیت کے بارے میں میرا جو شک تھا وہ سچ نکلا تھا۔ میں نے جاکر سے کہا کہ سندھیا ابھی تمہارے یار کے گھر ہوئی مجھے وہاں لے چلو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محرم سے کہا کہ اجیت کو پکڑ کر یہاں لے آؤ اور میرے آنے تک کہیں جانے نہ دینا۔

محرم کے نکلنے سے پہلے ہی میں اور جاکر اس کے دوست کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سندھیا چھپی ہوئی تھی۔ جاکر پہلے مجھے اپنے گھر لے گیا وہاں اس کے گھن کے درختوں کے پیچھے بنے ہوئے کمرے میں سے اس کا ملازم دو گھوڑے نکال لایا۔ یہ کمرہ اس کا اصطبل تھا۔ بڑے خوبصورت گھوڑے تھے۔ بالکل ہوا کی طرح دوڑتے تھے۔ جاکر کہنے لگا کہ کافی وقت لگے گا۔ پر مجھے وقت کا احساس نہیں ہوا۔ اپنے علاقے میں ایسی ایسی خوبصورت جگہیں تھیں جہاں میں پہلے بھی آیا ہی نہیں تھا۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے اس پر ہریالی بہت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے گہری گہری گھٹی گھاس میں راستہ بنا دیا گیا ہو۔ پیہ نہیں یہاں کسی زمانے میں کھدائی ہوئی رہی ہوگی۔ اس لیے کافی دور تک دونوں طرف مٹی کے ٹیلوں کی شکل میں ڈھیر تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جم کر پہاڑیوں جیسی شکل اختیار کر گئے تھے اور ان پر جنگلی پھول اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ یہ راستہ زیادہ دور نہیں چلا۔ اس کے بعد ایک دم ایسے لگا جیسے ہم کسی پہاڑے علاقے سے نکل کر میدانی علاقے میں آ گئے ہوں کیونکہ میرے سامنے اب بھوری مٹی والی خشک زمین تھی جس میں کہیں کہیں کیکر اور ناٹکی کے درخت نظر آتے تھے۔ کسی جگہ کوئی کھال ہمارے راستے میں

آ جاتا۔ ادھر ادھر فصل بھی کہیں نظر آ جاتی تھی۔ بستی ابھی تک کوئی نظر نہیں آئی تھی۔ جاکر کا کہنا سچ تھا کہ کافی وقت لگے گا۔ جہاں تک ہم نے جانا تھا وہ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میں راستے کی خوبصورتی کی وجہ سے وقت کا احساس نہیں کر رہا تھا لیکن پھر مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ ہم کب کے چلے ہوئے ہیں۔ جاکر میرے تھوڑا سا آگے تھا۔ میں نے اس سے وریام کی بات چھیڑ دی کہ اسے قتل کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ جاکر کہنے لگا۔ میری وریام سے کیا دشمنی؟ اگر اس کی دشمنی ہوگی تو اجیت سے کیونکہ دونوں زمین کے مسئلے پر جھگڑ پڑے ہیں۔ میں نے جاکر سے کہا کہ چلو میں مان لیتا ہوں کہ یہ دونوں بھائیوں کا جھگڑا ہے لیکن یہ سندھیا تمہارے پاس کیوں آتی ہے۔ اس کا جواب تم نہیں دے رہے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر جاکر کے خلاف شک ابھرنے لگا اور پھر ایک دم میرے اعصاب ٹھنڈے ہو گئے۔

کہیں اس حرامی نے مجھے کسی جال میں تو نہیں پھنسا لیا۔ مجھے یہ اسی جال میں نہ لے جا رہا ہو۔ مجھے وہ ایک دم بڑا شاطر آدمی لگنے لگا۔ میری چھٹی حس ایک دم بیدار ہو گئی اور اتنی دور آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کوئی غلطی کر دی ہے لیکن کیا غلطی کی ہے۔ ذہن اس کا اندازہ نہیں کر رہا تھا۔ اسی وقت میری حیوانی حس بیدار ہو گئی۔ جب کوئی جنگلی جانور کسی خطرے میں گھر جاتا ہے تو وہ زیادہ چوکس ہو جاتا ہے اور اس کی مزاحمت ایک دم سخت ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح یکا یک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں اس کے ساتھ جا کر غلط تو نہیں کر رہا اور میری حس کہہ رہی تھی کہ مجھے کوئی خطرہ ہے۔ ایسے حالات میں فوری فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کچھ دور کسی بستی کے

کمرے زیادہ نظر آ رہے تھے۔ جاکر آگے آگے چل رہا تھا اور کانا میرے ایک طرف۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر جاکر دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ ایک برآمدہ تھا جو کمروں کے باہر چل رہا تھا۔ موڑ مڑتے ہی مجھے ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوا۔ یہاں برآمدے کے آگے بہت کھلا مین تھا جس میں گھاس تھی اور پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی تھیں۔ گھن درختوں سے بھرا پڑا تھا جس طرف سے ہم مکان کے اندر آئے تھے ادھر سے یہ نظر نہیں آتے تھے۔ جاکر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں اس کی چال ڈھال بالکل ہی بدل گئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے اسے میری کوئی پرواہ نہیں اور میں اس کے گھر میں ہوں۔ میں اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ کانا میرے پیچھے تھا۔ کمرے میں موٹے موٹے پائپوں والا تخت پوش پڑا تھا جس کی شکل مسہری جیسی تھی اور پاس لکڑی کی تین کرسیاں پڑی تھیں۔ اینٹوں کا پکا فرش تھا۔ یہ مکان کسی نے کافی پیسے خرچ کر کے بنایا ہوگا۔ جاکر کی کمر میری طرف تھی اور منہ سامنے دیوار کی طرف۔ اسی حالت میں وہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور کسی نے چٹخی چڑھا دی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ راستے میں مجھے جو وحشت ہوئی تھی اور جس چیز سے چھٹی حس نے خبردار کیا تھا وہ سامنے آنے ہی والی تھی۔ جاکر نے اپنا دایاں ہاتھ ایسے جھکا جیسے اس نے کسی کو کوئی اشارہ کیا ہو اور ساتھ ہی تیزی سے میری طرف لپکا جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ خطرے کی حالت میں انسان کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹنے کے لیے حرکت کی لیکن شاید مجھے دیر ہو گئی تھی اس کا نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور اس کی بھینے جیسی نگر سے میرے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ میں

گھر نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے دل کو تھوڑی ڈھارس بندھی اور مجھے خیال آیا کہ میں بزدل تو نہیں ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے میرے جو احساسات تھے مجھے ان پر شرمندگی سی ہونے لگی۔ وہی جاکر اب مجھے کمزور نظر آنے لگا۔ بہر حال بستی قریب آ گئی اور اس سے بہت پہلے ہی وہ مکان بھی آ گیا جہاں مجھے جاکر لے جا رہا تھا۔

عام دیہاتی گھروں کی نسبت یہ لپکا مکان تھا۔ میرا مطلب ہے گارے کی بجائے اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ جن کے اوپر ٹوٹے ہوئے شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہ شیشے اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ کوئی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ ڈٹی ہو جائیں۔ مجھے احساس ہوا کہ ایسی دیوار کسی خاص مقصد سے تیار کی گئی ہے۔ اونچا ٹھوس لکڑی کا دروازہ جس کے سامنے جاکر نے گھوڑا روک لیا۔ ہم گھوڑوں سے اترے۔ جاکر نے زور زور سے دستک دی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

میری نظر اس پر پڑی تو مجھے پھر بے نام ٹپی بے چینی ہونے لگی۔ پہلوان نما آدمی تھا یہ۔ ایک آنکھ سے کانا۔ سر پر بالوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا دوسرا کالا۔ وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بد معاش لگتا تھا۔ میں اندازہ کرنے لگا کہ اس کے ساتھ بھڑنے کی مجھ میں طاقت ہے یا نہیں۔ خیر اس نے جاکر کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ جاکر کہہ رہا تھا کہ یہ اس کے دوست کا گھر ہے لیکن وہ اس بے تکلفی سے اندر جا رہا تھا جیسے یہ خود اس کا گھر ہو اور اس کا نے اسے اس طرح اندر جانے دیا جیسے وہ اس کا ملازم ہو۔ میں اندر سے بالکل تیار ہو گیا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مکان کا مین کم تھا اور

سے میں نے اس کے بازو پیچھے کر کے باندھے اور باہر نکل کر کمرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور عمارت کے دوسرے کمرے میں اس دوسرے آدمی کو تلاش کرتا رہا لیکن اس پورے گھر میں کوئی زندہ چیز نظر نہیں آ رہی تھی سوائے اس گھوڑے کے جو جاگھر کا ہی تھا لیکن جس پر سوار ہو کر میں یہاں آیا تھا اور وہ اس گھر کے پچھلی طرف بنے ہوئے تھانوں پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اسی کمرے کے دروازے پر لے آیا جہاں کانا بندھا تھا۔ میں نے بڑی کوشش اور ہمت کر کے اسے گھوڑے پر لادا اس طرح کہ اس کا سر گھوڑے کی کمر کے ایک طرف اور ٹانگیں دوسری طرف تھیں۔ پھر گھوڑے کی باگ پکڑی اور اسی قریبی بستی میں چلا گیا جو میں نے آتے وقت دیکھی تھی۔

وہاں نمبردار کو میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے گاؤں کے دو تین بندے میرے ساتھ گھوڑیوں پر روانہ کر دیئے اور وہ مجھے تھانے پہنچا کر واپس گئے۔ میں نے کانے کو حوالات میں ڈال دیا۔ اب اسی نے مجھے جاگھر تک پہنچانا تھا۔

کانے نے جس طرح کمر مار کر مجھے بے بس کیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر رات کمرے میں باندھ رکھا اسے یاد کر کے میرا خون کھول اٹھتا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اتنی زبردست دھلائی کی کہ وہاں بھی نہیں کی تھی جہاں اس نے مجھے قید رکھا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس سے جاگھر کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگا ”جاگھر نے یہاں ایک عورت رکھی ہوئی تھی جسے اس نے اپنے اسی مکان میں رکھ لیا جہاں وہ آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ دن پہلے یہ عورت مجھے یہ کہہ کر گئی کہ وہ جاگھر کے پاس گاؤں جا رہی ہے اور جلد ہی واپس آ جائے گی۔ میں نے اسے اس نوکر کے ساتھ بھیج دیا جو مجھے مار کھاتا دیکھ کر بھاگ

چکی تھی اور میرے سوچنے کی صلاحیت بہتر تھی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح تو جاگھر مجھے جب تک چاہے گا یہاں قید رکھے گا۔

مجھے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے اور پھر سورج طلوع ہونے تک میرے دانت دکنے لگے کیونکہ میں دانتوں سے ہاتھوں کے گرد بندھی رہی کھولتا رہا۔ میری کلانیاں رگڑ سے چھل گئیں اور ہونٹوں پر خراش آ گئی لیکن جب رسی سے میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تو پھر پاؤں کھولتے دیر نہیں لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میں اس کانے کے ساتھ منٹ سکتا تھا۔ پہلے تو آزاد ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ اس عمارت میں کانے کو تلاش کر کے اس کا قیمہ بنا دوں لیکن پھر ضبط کر لیا کہ انجان جگہ ہے کانا میرے باہر نکلنے سے ہوشیار ہو جائے گا۔ دن چڑھ آیا ہے وہ مجھے دیکھنے آئے گا پھر.....

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز آئی۔ میں اسی طرح پاؤں جوڑ کر لیٹ گیا۔ دروازہ کھلا اور پھر کانا اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ وہی رات والا آدمی تھا۔ کانا میرے بستر کے پاس آ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں سپرنگ کی طرح اچھلا اور میری نگر سے اس دیو کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ دھب کی آواز کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گیا اس کے ساتھ جو آدمی اندر آیا تھا وہ بجلی کی طرح باہر نکل گیا۔ اسے روکنا ضروری تھا کہ وہ باہر جا کر اور لوگوں کو خبردار نہ کر دے لیکن کانے کو دیکھ کر میرا ضبط ختم ہو گیا اور میں کانے پر پل پڑا۔ پتہ نہیں میں اسے کب تک مارتا رہا کہ میرے دونوں بازو شل ہو گئے اور کانے کا منہ خون میں تھمر گیا تھا۔ میں بے دم ہو کر کافی دیر تک مسہری پر بیٹھا رہا۔ میرے حواس بحال ہوئے تو بھی کانا بیہوش تھا۔ جس رسی سے میرے ہاتھ پاؤں اس نے باندھے تھے اسی رسی

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا جس سے میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جو کوئی ہے جلدی اندر آئے اور پھر اس نے کنڈی کھولی اور اندر آ گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا یہ کانا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لائین تھی اور اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا جس نے ایک بڑی سی تھالی میں روٹیاں اور کوئی ساکن رکھا ہوا تھا۔ اب آدمی نے تھالی میرے سامنے رکھ دی اور کانے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مجھے کانے کی آواز پہلی بار سنائی دی۔ اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی پھٹی ہوئی تھی۔

”میں اس کے ہاتھ نہیں کھول سکتا تم ہی اسے روٹی کھلا دو۔“ وہ اپنے ساتھ آنے والے آدمی سے کہہ رہا تھا۔ میں نے یہ سن کر اسے سختی سے روک دیا اور کانے سے کہا کہ وہ دو آدمی ہیں اور میں کمرے میں بند ہوں میرے پاؤں بندھے ہوئے ہیں وہ کیسے مرد ہیں کہ مجھ سے ڈر رہے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کانے کو اشتعال دلانا چاہا تھا کیونکہ اس طرح وہ میرے ہاتھ کھولنے پر آمادہ ہو جاتا لیکن شاید میرا حربہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے گالیاں بھی دیں کہ وہ مشتعل ہو جائے لیکن کمال کا تھا اس کا ضبط۔ اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس نے ساتھ آنے والے کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے اور کانا اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئے جہاں پھر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے خود کو ٹھنڈا رکھنے اور سونے کی کوشش کی کہ اس طرح جسمانی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں لیکن مجھے بار بار غصہ آ جاتا کبھی خود پر کبھی جاگھر پر اور کبھی کانے پر۔ رات گئے تک میں اسی کشمکش میں رہا پھر پتہ نہیں مجھے کب نیند آ گئی اور میں بے خبر سو گیا۔ میں چونک کر فجر کے وقت اٹھنے کا عادی تھا اس لیے فجر سے پہلے ہی جاگ گیا۔ اب میری طبیعت قدرے بحال ہو

اڑتا ہوا مسہری پر جاگرا۔ ابھی کھڑا ہوتا ہی چاہتا تھا کہ چھاننے کی ہوا کو کانے کی آواز آئی اور چھانٹا شراپ کی آواز کے ساتھ میرے منہ پر لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے استرا میرے منہ پر پھیر دیا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ درد کی لہر میرے اوپر والے سارے دھڑ میں پھیل گئی اور پھر مجھ پر چھاننے برسے لگے۔ پتہ نہیں چھانٹا کس کے پاس تھا۔ کانے نے یا پھر جاگھر نے رسی سے میرے ہاتھ باندھ دیئے۔ میرے کانوں میں سنسنی ہو رہی تھی لیکن میں صاف طور پر آوازیں سن رہا تھا۔ جاگھر کمرے سے باہر جا رہا تھا اور اس نے کانے سے کہا کہ اسے وہیں بند رکھو میں ”اسے“ لے جا رہا ہوں دھیان سے رہنا باہر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں یہ کون ہے۔ کانا اور وہ باہر نکل گئے اور انہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ان کے قدموں کی آوازیں آہستہ ہوتی ہوئی بند ہو گئیں اور گہری خاموشی چھا گئی۔ میں اس کمرے میں ایک چوہے کی طرح بند ہو چکا تھا اور میرے تھانے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں۔ جاگھر مجھے چکر دے گیا تھا اور اب میرا ذہن صاف ہو چکا تھا کہ جاگھر کیا چیز ہے۔ مجھے اب یہاں سے باہر نکلنا تھا۔ قید کی حالت سے فرار کے لیے ضروری تھا کہ میرا دماغ ٹھنڈا رہے تاکہ میں ٹھیک طرح سے سوچوں۔ کانے اور جاگھر کی شکل سامنے آتی تو خون کھول جاتا۔ جی چاہتا ان کے کٹڑے کٹڑے کر دوں۔ بڑی مشکل سے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ باہر محسوس میں لگے درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ مجھے اپنے قیدی ہونے کا احساس شدت سے ہوا۔ پرندوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید باہر شام ہوتی جا رہی ہے۔ کافی دیر بعد میرے دروازے کے باہر کوئی آیا۔ اس وقت

گیا تھا۔ یہ گاؤں میں جا کر سے مل کر آگئی اور پھر جا کر بھی آپ کے ساتھ آگیا۔ جس وقت میں نے دروازہ کھولا تھا اس وقت جا کر نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کر دیا تھا کہ آپ کو قابو کرنا ہے۔ جا کر مجھ سے ایسے ہی کام لیتا ہے اور ہم اپنے ”مہمانوں“ کو اس کمرے میں رکھتے ہیں۔ اس لیے جب وہ آپ کو لے کر اس کمرے کی طرف چلا تو مجھے کوئی شک نہ رہا کہ آپ جا کر کا شکار ہیں۔ کمرے میں اس نے مجھے آپ پر حملے کا اشارہ دے دیا اور پھر میں نے اپنا کام کر دیا۔“

میں نے کانٹے سے کہا کہ تم اپنا کام کر چکے ہو اب میرا کام یہ کرو کہ مجھے جا کر کے پاس لے کر جاؤ ورنہ جا کر پر قتل کا مقدمہ ہے۔ اگر تم مجھے اس تک نہیں لے جاؤ گے تو تم بھی اس میں پھنسو گے۔ تمہیں لازمی طور پر بتانا ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ مجھے یقین دلانے لگا کہ اسے پتہ نہیں جا کر کہاں گیا ہے لیکن وہ دو دن بعد آنے کا کہہ کر گیا ہے اور وہ جو کہہ کر جاتا ہے اس پر عمل ضرور کرتا ہے۔ اس لیے اسے پکڑنا ہے تو آپ اسی جگہ چلے جائیں جہاں سے آئے ہیں۔ کانا گھبرا گیا کہ میں اسے قتل کے مقدمے میں پھنسان دوں۔ مجھے خیال آیا کہ یہ دوبارہ مجھ سے دھوکہ ہونے لگا ہے لیکن میں اس بار صحیح انتظام کروں گا۔ میں نے تھانے سے تین آدمی ساتھ لیے اور کانٹے کو لے کر واپس اسی مکان میں چلا گیا۔ کانا اور میں اندر چلے گئے اور میں نے تین سپاہیوں میں سے دو باہر نگرانی پر لگا دیئے اور ایک اس نارت کے اندر چھپا دیا جو اندر آنے والوں پر نظر رکھتا۔

پورا دن ہم انتظار میں رہے۔ کانٹے اور اس نوکر کو جو بھاگ گیا تھا میں نے بڑے دروازے کے پاس ہی چار پانی پر بٹھا دیا۔ باہر نگرانی والے سپاہی

ادھر ادھر چپے ہوئے تھے۔ دوپہر ڈھل گئی تو باہر کا دروازہ کھڑکا۔ میں برآمدے میں ہی اوٹ میں ہو گیا اور کانٹے کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھول دے۔ اندر آنے والے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا اور اس کے انتظار میں تھا۔ جا کر گھوڑے سمیت اندر آگیا۔ اس نے باگ کانٹے کو پکڑا دی اور خود برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں اوٹ سے نکلا اور جا کر کو چھاپ لیا۔ کانا غدار کی کرچکا تھا۔

تھانے لا کر میں نے جا کر کا جو حال کیا اس پر میرے سپاہی بھی تو یہ توپ کر اٹھے۔ ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ جا کر جیسے سخت جان مار کے بغیر نہیں مانتے۔ اس نے مجھے مکمل پتہ دیا کہ سندھیا کہاں ہے جسے میں نے تھانے سے سپاہی بھیج کر منکولایا۔ یہ سادے کپڑوں میں گئے اور سندھیا سے کہا کہ جا کر نے انہیں بھیجا ہے۔ وہ ان کے ساتھ آگئی اور وہ اسے تھانے لے آئے۔ سندھیا کو جب پتہ چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے تو وہ شینا گئی۔ میں اسے جا کر کے پاس لے گیا اور کہا کہ اس کا حال دیکھ لو اگر تم زبان نہیں کھولو گی تو تمہارا بھی ایسا ہی حال ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ اب وریام کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بتا دو۔ اسے شین چھوڑنے تم گئی تھیں اسے گاڑی تو نہیں نکل گئی نہ ہی وہ راستے میں اتر کر کہیں بھاگ گیا ہو گا۔ تم ہی جانتی ہو کہ وہ کہاں گیا۔ جا کر کی حالت دیکھ کر واقعی سندھیا کو عقل آگئی۔

میں نے جا کر کو حوالات سے نکالا اور اسے اور سندھیا کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ محرر کو میں نے وہیں بلا لیا کہ وہ ان کا بیان لکھ لے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب لازمی بک دیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سندھیا سے کہا کہ وہ بتائے کیا ہوا تھا!



ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

پولیس مقابلہ

ایک دن صبح کو چپکے سے شن پولیس چوکی پہنچ گئی، بوٹا سنگھ اس وقت ایک سپاہی کی نگرانی میں واش روم سے نکل کر آیا تھا۔ شن دوڑ کر محمد بوٹا سے پٹ گئی۔ پھر سپاہی کو ایک طرف بلایا اور اپنے سونے کے دونوں کنگن اتار کر اسے دے دیئے۔ پھر بولی ”آبونیان کی دنیا سے بھاگ نکلیں!“

پاکستان کا پہلا پولیس مقابلہ جس میں ایک بیوی نے شوہر کو بھگانے کی کوشش کی تھی

معصوم بچے کا باپ بھی ہے۔ اس نے میری خاطر بہت سے خطرات کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مجھے آپ لوگ اس کے ساتھ بھیج دیں۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ وہ تو ہم لوگوں کے ساتھ رہنے کے لیے بھی تیار ہے۔ کم سے کم یہی گوارا کر لیں۔ مجھ پر

”یہ وہ انسان ہے جس نے مجھے موت اور رسوائی کے خوفناک چنگل سے چھڑایا، اس نے میری عزت بھی بچائی اور رسوائی کی موت سے بھی مجھے بچا لیا۔ وہ صرف میری خاطر اپنا مذہب ترک کر کے مسلمان بھی ہو چکا ہے! یہ مت بھولو کہ وہ میرے اس

پر بھی شک ہو رہا ہے۔ اب ہم دونوں آپ کے پاس ہیں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری کرنی کی سزا مجھے ملے گی۔

سندھیا کی کرنی کی سزا تو اسے عدالت سے نہ مل سکی کہ یہ اعتراف جرم جو انہوں نے میرے سامنے کیا تھا وہ عدالت میں اس سے مکر گئے۔ سندھیا یہاں تک کہنے لگی کہ میں اسے خواستواہ بدنام کر رہا ہوں چونکہ کوئی موقع کا گواہ نہیں تھا اور کانے کو میں نے جو گواہ بنایا تھا وہ حرامی بھی مکر گیا اس لیے وہ تینوں بری ہو گئے۔ مجھے اپنی اس ناکامی کا بہت ہی افسوس ہوا کہ مارنے والے سامنے تھے اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن پھر وہ سزا مل گئی جو ملنی چاہیے تھی۔ فیصلے کے ایک مہینے بعد مجھے محرم نے بتایا کہ سندھیا نے جاکر سے شادی کر لی ہے اور وہ اس گاؤں میں جاکر کے گھر میں ہے۔ مجھے اور افسوس ہوا اس خبر کے ہفتے بعد یا کچھ دیر بعد میں اور محرم کی بارے میں تھانے میں بات چیت کر رہے تھے کہ یکا یک باہر شور مچا ہوا جیسے بہت سارے آدمی ایک ساتھ تھانے کے اندر آ گئے ہوں۔ میں نے محرم کو باہر بھیجا کہ دیکھ کر آؤ کیا ہوا ہے؟ وہ باہر نکل گیا اور چند لمحوں بعد واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو آدمی تھا اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اجیت سنگھ تم نے یہ کیسے؟

”جناب جاکر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سندھیا اگر خراب نہ ہوتی تو جاکر کیا کر سکتا تھا۔ میں نے جاکر کے گھر میں ہی اسے..... اس کی لاش وہیں ہے۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میری طرف کر دیئے جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے بھڑکی لگا دو۔ میں نے اس کی طرف سے منہ موڑ کر محرم سے کہا کہ بندے بھیج کر جاکر کے گھر سے سندھیا کی لاش اٹھا کر لے آؤ۔

وریام چھاؤنی سے بہت کم چھٹی پر آتا تھا۔ جاکر نے مجھے درغلایا اور پھر جب وریام کو چھوڑ کر میں اور جاکر ایک ہو گئے تو میں نے کئی بار اسے کہا تھا کہ اس گاؤں سے ہی بھاگ جاتے ہیں لیکن یہ مجھے نہیں رکھنا چاہتا تھا اور میں اس طرح اس کے ساتھ چوری ملاقاتوں سے تنگ آ گئی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اگر مجھے بھگا نہیں سکتے تو وریام کا کھانا صاف کر دو۔ وہ کہنے لگا کہ سوچیں گے۔ اس بار جب وریام چھٹی پر آیا تو میں نے جاکر سے جھگڑا کیا کہ یہ بچ کر نہ جائے۔ جاکر سے میں نے کہا کہ کوئی طریقہ سوچو۔ اس نے سوچ کر مجھے کہا کہ جب یہ واپس نشین پر جائے تو صرف تم اس کے ساتھ جانا۔ اجیت یا اس کا باپ ساتھ نہ ہوں۔ میں اس ویران کھوہ کے قریب ہوں گا اور وہاں اس کا کام تمام کر دیں گے۔ وریام جب گھر سے واپس جانے کے لیے تیار ہوا تو اجیت اور چاچا بھی ساتھ جانے لگے لیکن میں نے دل چھل کر کے انہیں روک دیا۔

جب ہم پرانے کھوہ کے پاس پہنچے تو جاکر اور کانا وہاں موجود تھے۔ دونوں نے وریام کو گھیر لیا۔ وریام آخری وقت پر سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے اسے جانے نہ دیا۔ جاکر نے اسے گردن سے قابو کیا اور کانے نے ٹانگیں پکڑ لیں۔ جاکر نے اسے گلا دبا کر مار دیا اور لاش کنویں میں پھینک دی۔ ہم وہاں ریل گاڑی کے آنے کا انتظار کرتے رہے اور اس کے آنے کے بعد میں گاؤں چلی گئی اور چاچے سے آکر کہا کہ وریام کو گاڑی پر سوار کر آئی ہوں۔ ہم بہت خوش تھے کہ وریام سے چھٹکارا مل گیا ہے لیکن اس کے پیچھے فوجی آنے شروع ہو گئے اور پھر آپ میرے پیچھے لگ گئے۔ جاکر کہنے لگا کہ اس

کو جلتے سے بچانا چاہتا ہوں۔“

بوٹا سنگھ نے بچی کی سی تیزی سے شمن کو اپنی حویلی پہنچا کر اس کے باپ کی لاش کو بھی اٹھا لیا۔ اپنے مرحوم باپ کی لاش پر شمن بہت روتی، پھر شکر آمیز نظروں سے بوٹا سنگھ کو دیکھا اور کہا: ”بوٹا سنگھ!“

”نہیں شمن! مجھے اب محمد بوٹا کہو! مولانا دہلوی نے میرے لیے بچی نام پسند کیا ہے اور آخری وقت میں میں نے تیرے باپ کو بھی بتایا تھا، اس نے بھی مسکرا کر مجھے دیکھا اور کہا تھا کہ جلد سے جلد شمن کی خبر لو۔۔۔۔۔ اب ہم ابائی کو دفن کر کے مولانا صاحب کے پاس نکاح کے لیے دلی جائیں گے۔“

دو اڑھائی سال تک محمد بوٹا اور کلثوم نے خوشی خوشی زندگی گزاری۔ ان کا بیٹا بھی کافی بڑا ہو گیا تھا۔ وکرم سنگھ کے باپ پر یہ راز کی طرح کھل گیا تھا کہ وکرم کی گردن کسی مسلمان کی تلوار نے نہیں بلکہ بوٹے نے شمن کی وجہ سے کاٹی ہے۔ وہ بوٹا کی عدم موجودگی میں ریڈ کر اس کے نمائندوں کو لے آیا کہ یہ ایک مسلمان لڑکی ہے جسے بوٹا سنگھ نے اپنی حویلی میں قید کر رکھا ہے اور اس سے اس کا ایک بچہ بھی ہے، وہ وکرم سنگھ کے باپ کی مدد سے کلثوم اور اس کے بچے کو جیپ میں ڈال کر لے گئے اور بازیاب یافتہ خواتین کے کیمپ میں پہنچا دیا جہاں سے اسے کچھ دیکر بدھیب عورتوں کے ساتھ پاکستان پہنچا دیا گیا۔ گاؤں میں وکرم سنگھ کے باپ نے شہور کر دیا کہ شمن کو پاکستان سے اپنے بھائیوں کا خط مل گیا تھا جو اپنے بھائی باپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور بچہ بچا کر نکل گئے تھے۔ اس لیے شمن نے خود ریڈ کر اس والوں سے اپنی رہائی کے لیے درخواست کی تھی اور وہ آ کر اسے لے گئے ہیں۔

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے لیکن یہ کہاوت کسی دشمن محبت کی معلوم ہوتی ہے۔ محبت کی تو اپنی ہی آنکھ ہوتی ہے اور اس کے کان اور زبان بھی اپنی ہوتی ہے۔

کر آیا ہوں مگر یہ کیا ہو گیا ہے؟

”پتر بوٹا سنگھ! یہ باتوں کا وقت نہیں ہے میرا بچتا حال ہے، بلوائیوں کے ساتھ قریب والے گاؤں کے زمیندار چندر سنگھ کا بیٹا وکرم سنگھ تیری امانت کو گھینٹا ہوا لے گیا ہے۔“ یہ کہہ کر شمن کے باپ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

بوٹا سنگھ بھی کڑیل پنجابی جوان اور جوشیلا ہونے کے ساتھ ساتھ بھرتیلا بھی تھا۔ آنکھ جھکنے کی دیر میں شہسوار بوٹا سنگھ نے وکرم سنگھ کو چالیا اور گرج کر کہا: ”او کو بے غیرت! شمن میری امانت ہے اسے تو میری لاش پر سے گزر کر ہی لے جائے گا۔“

وکرم سنگھ نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑتے ہوئے چھلانگ لگا دی اور گرج دار آواز میں کہا: ”تو پھر آ جا میں تیری لاش کو روند کر ہی اپنے اس خوبصورت شکار سے دل بہلاؤں گا اور پھر اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر پاکستان کے لیے تحفہ بھیجوں گا۔!“

بوٹا سنگھ نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی اور اس سے پہلے کہ وہ گھوڑے سے اتر کر تلوار سنہاں وکرم سنگھ کی گردن دھڑ سے الگ ہو چکی تھی، بوٹا سنگھ نے کلثوم کے منہ میں سے کپڑا نکالا اور رسیاں کھول کر اسے گھوڑے سے اتارا اور کہا ”ٹوٹی! تیرے لیے ایک خوشی کی اور ایک غم کی خبر ہے۔!“

”غم کی خبر تو مجھے معلوم ہے کہ ہمارا گھر اب جل چکا ہو گا اور میرا زخمی باپ مر چکا ہو گا، تو مجھے اچھی خبر ہی سنا دے۔“

”اچھی خبر یہ ہے ٹوٹی کہ میں نے دلی کے مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا ہے اور اپنے مسلمان ہونے کی خبر تیرے جاں بلب زخمی باپ کو بھی سنا دی ہے۔ مجھے اسی نے بتایا کہ پتر بوٹا سنگھ! تیری امانت کو وکرم سنگھ بھاگ کر لے گیا ہے پر ہمارے پاس وقت تھوڑا ہے۔ میں تجھے اپنی حویلی پہنچا کر انکل کی لاش

گاؤں تھا۔ آبادی کی اکثریت مسلمان تھی، شمن کے باپ کی زرعی زمین گاؤں میں سب سے زیادہ تھی۔ گاؤں کی نمبرداری بھی شمن کے ایک چچا کے پاس تھی، شمن کے صرف دو بھائی تھے، ایک اس سے بڑا تھا۔ شمن کا اصل نام کلثوم تھا مگر گھر والے اسے ٹوٹی اور شمن کہتے تھے۔ وہ بہت حسین تھی، قد و قامت اور حسن و جمال کے لحاظ سے پورے گاؤں میں اس کا جواب نہ تھا۔ اسی لیے سب کی اس پر نظر تھی اور ہر نوجوان اسے اپنا چاہتا تھا مگر وہ مسلمان ہوتے ہوئے ایک سکھ نوجوان بوٹا سنگھ کو چاہتی تھی۔ اس کا باپ بھی گاؤں کا زمیندار اور شمن کے باپ کا دوست تھا۔ شمن کا باپ پکا مسلمان تھا اس لیے معاملہ سے آگاہ ہوتے ہی اس نے اپنی بیٹی کو سمجھایا کہ ایک سکھ سے تیری شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر شمن نے اسے بتایا کہ میں نے شروع میں ہی بونے کو بات بڑھانے سے منع کر دیا تھا لیکن وہ میری خاطر مسلمان ہونے کے لیے تیار ہے۔

جب اس کے باپ نے اس کی ایک خالہ اور پاس کے گاؤں کے ایک سکھ کا قصہ سنایا تو وہ ڈر گئی تھی۔ اسی اثناء میں بوٹا سنگھ دلی چلا گیا تھا اور ساتھ ہی تقسیم ہند کے اعلان کے بعد فسادات شروع ہو گئے۔ سکھ جتھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ جس شام بوٹا سنگھ دلی سے واپس آیا وہی شام گاؤں کے مسلمانوں کے لیے موت کا پیغام لے کر آئی۔ بوٹا سنگھ کے بچپن سے پہلے ہی قیامت برپا ہو چکی تھی۔ وہ جب شمن کے گھر پہنچا تو وہاں آگ کے شعلوں اور جاں بلب زخمیوں کی آہوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ شمن کے زخمی باپ کو دیکھ کر بوٹا رو دیا اور زخمی کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس کے کان میں کہا چچا جان میں دلی والے مولانا بشارت کے ہاتھ پر اسلام قبول

اور میرے بچے پر ظلم نہ کریں۔!“

یہ الفاظ شمن اپنی ماں کی موجودگی میں اپنے دونوں بھائیوں سے کہہ رہی تھی جو اسے اپنے شوہر کے ساتھ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے نہ اسے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہنے کی اجازت دینے پر آمادہ تھے۔ شمن کا بڑا بھائی بہت اونچی آواز میں غصہ سے کہہ رہا تھا!

”نہیں نہیں ہرگز نہیں! ہم اس کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔ ہم تو اس پر کبھی بھروسہ نہیں کریں گے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اپنی بہن کو ایک سکھ کے حوالے کر دیا۔ یہ ہماری عزت اور غیرت کا سوال ہے۔!“

”بھائی وہ اب سکھ نہیں ہے، وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ وہ بھی کا مسلمان ہو چکا ہے۔ اس نے ابائی کی شرط پوری کر دی تھی۔۔۔۔۔ مرتے دم انہوں نے اسے ہاں بھی کر دی تھی، وہ مجھے دلی والے مولانا کے پاس لے گیا تھا۔ مولانا صاحب نے تصدیق کی تھی کہ بوٹا میرے ہاتھ پر پہلے ہی اسلام قبول کر چکا ہے۔ ہمارا نکاح بھی انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔۔۔۔۔ اور ہم۔۔۔۔۔“

”بس بس رہنے دے۔ سکھ کا کیا اعتبار۔ وہ دلیر سنگھ کا بچہ بھی تو ہماری خالہ کی خاطر مسلمان ہو گیا تھا مگر بعد میں پھر گیا تھا اور برادری کے دباؤ میں آ کر اسے پسینے لے گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا کیا حشر کیا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس بچاری کو قتل کر دیا تھا۔ بعض کہتے تھے کہ اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر آیا تھا۔ پوچھ لے اپنی ماں سے؟“

بھائی نے یہ کہہ کر بہن کو بہت برا بھلا کہا۔ پٹائی بھی کی اور اسے کمرے میں دھکا دے کر باہر سے تالا لگا دیا۔

تقسیم ہند کے وقت شمن کے گھر والے مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، چھوٹا سا

بوٹے کو اپنے گاؤں کے سکھوں کا نمائندہ تصور کر کے اپنے گھر کے جلے اور گھر والوں کے قتل کی فضا میں بھٹنے ہوئے ہوں۔ ثمن نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی اور کسی صورت میں بھی اس کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا مگر سب کچھ بیکار تھا۔ جلد ہی بوٹا پولیس کے قبضے میں تھا۔ پولیس نے جملہ ساری اور دھوکہ دہی کا مقدمہ بنا دیا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ یہ تسلی بخش جواب دے سکا ہے نہ یہ اپنا صحیح نام بتا رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے محمد بوٹا ہوں کبھی کہتا ہے میرا نام بوٹا سنگھ ہے۔

ایک دن صبح کو چپکے سے ثمن پولیس چوکی پہنچ گئی، بوٹا سنگھ اس وقت ایک سپاہی کی نگرانی میں واش روم سے نکل کر آیا تھا۔ ثمن دوڑ کر محمد بوٹا سے لپٹ گئی۔ پھر سپاہی کو ایک طرف بلایا اور اپنے سونے کے دونوں انگلیں اتار کر اسے دے دیئے۔ پھر بولی ”آبو نیان کی دنیا سے بھاگ نکلیں!“ جو بھی دونوں میاں بیوی چوکی کے دروازے سے باہر آئے سپاہی نے واہلا شروع کر دیا ”دوڑو، بھاڑو، اس سکھ کے بچے نے اس عورت کی مدد سے پہلے مجھے درغلانے کی کوشش کی پھر مجھے دھکا دے کر گرا دیا اور زدوکوب کیا! جلدی آؤ یہ پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔“

سپاہی جب پولیس چوکی کے دروازے سے باہر آئے، کلثوم اور محمد بوٹا ریلوے پل کی میڑھیاں چڑھ رہے تھے مگر سپاہیوں نے پلیٹ فارم پر اترنے سے پہلے ہی انہیں جالیا۔ پہلے دو گولیاں چلیں، ایک مرد اور ایک عورت کی لاشیں پڑی پر گرتی ہوئی دیکھی گئیں۔ پھر گولیوں کی بوچھاڑ نے ایک قیامت برپا کر دی۔ شاید ملک میں یہ پہلا ”پولیس مقابلہ“ تھا جس میں ایک بیوی نے اپنے شوہر کو بھگانے کی کوشش کی تھی اور دونوں ریلوے پل سے بھاگتے ہوئے گرے اور مر گئے تھے۔

ثمن کے بھائیوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس کا بچہ کسی یتیم خانہ کے حوالے کر کے ثمن کو جلد سے جلد کسی مرد کے پلے باندھ دیا جائے۔ ماں سے مشورہ کے بعد انہوں نے دہلی زبان سے اپنی بہن سے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وہ تمام رات ثمن نے رو رو کر گزاری۔ کبھی اسے محمد بوٹا دیکھنے سے اصرار آتا ہوا نظر آتا تو دل خوشی سے اچھل کر سینے سے باہر آنے لگتا۔ پھر اچانک اسے اپنا بیٹا یتیم خانوں کی شوکریں کھاتا ہوا نظر آتا تو کانپ اٹھتی اور دم سے نڈھال ہو جاتی۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ شاید محمد بوٹا پھر سے بوٹا سنگھ بن جائے اور (محمد اقبال) کو (اقبال سنگھ) بنا کر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آجائے یا پھر.....“

ثمن انہی سوچوں میں مگن تھی کہ محلے کی ایک بچی دوڑتی ہوئی آئی اور اسے بتایا کہ ایک سکھ نو جوان آیا ہے جو اپنا نام محمد بوٹا بتاتا ہے۔ کبھی ٹوٹی کا گھر پوچھتا ہے کبھی (ٹوٹی کی ماں) کا گھر پوچھتا ہے۔

یہ سن کر ثمن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بے قراری سے اٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ دروازہ کھولا تو اس کا دور کا مسافر سامنے تھا۔ اس نے کانپتی آواز میں جھجکتے ہوئے انداز میں کہا ”آپ اندر کیوں نہیں آتے، آئیے میں تو آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک بی گئی ہوں۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی.....“

آنے والے نے اندر آتے ہی پہلا سوال اپنے بیٹے کے متعلق پوچھا، ثمن ابھی جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ ایک پانچ چھ سال کا بچہ سامنے آ گیا، ماں نے لرزتے ہونٹوں سے کہا ”اقبال! یہ تمہارے پاپا ہیں“ اور بچہ اپنے باپ سے چٹ گیا۔

کلثوم اور محمد بوٹا کی امید اور آرزوؤں کے برعکس دونوں بھائیوں اور ماں نے اس دور کے مہمان کی آمد پر خوش ہونے کے بجائے بہت برا منایا۔ جیسے یہ لوگ

چیز مانع نہ تھی مگر ”محمد بوٹا“ کے نام سے کاغذات تیار کہاں سے ہوں گے؟ ظاہر ہے سفری دستاویزات تو ”بوٹا سنگھ“ کے نام سے ہی تیار کروانا ممکن اور آسان تھا لیکن اب پاکستان میں اس نام سے داخل ہونے اور پھر یہاں ٹرک جانے کا کیا جواز ہوگا؟ شاید یہی کہ ”بوٹا سنگھ“ کے مسلمان ہو کر ”محمد بوٹا“ بننے کا اعلان ہو اور ثمن کے گھر والے اسے اپنا لیں؟ اس امید پر ثمن کا شوہر اور اس کے بچے کا باپ و امہ کی سرحد عبور کر کے لاہور پہنچ گیا۔ اتفاق سے ثمن کے بھائیوں کو جو مکان الاٹ ہوا وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا اور کسی سکھ کا متر و مکھن تھا جو تقسیم کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ مکان سے جو نکلا تو پھر کسی کو نظر نہ آیا اور نہ کسی کو اس کا انجام معلوم تھا۔

لاہور مہاجر کیمپ میں پہنچتے ہی ثمن کو اس کے بھائی جلد اور آسانی سے مل گئے تھے مگر اس کے ہمراہ ایک سکھ کا بچہ دیکھ کر بھائیوں کو بہت کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ نواسہ اپنی مانی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا مگر یہ سوچ کر کہ اسی گاؤں کے سکھوں نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا اور ان کا مکان لوٹ کر اسے آگ لگا دی تھی، مانی بھی سردہری کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔ ثمن نے بہت سمجھایا کہ بوٹا سنگھ مسلمان ہو کر محمد بوٹا بن گیا تھا اور دلی کے ایک عالم دین نے ان کا نکاح پڑھایا تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے کا نام محمد اقبال رکھا ہے مگر کوئی یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ماں کو اپنی بہن بھی یاد آتی تھی جس کی خاطر دلیر سنگھ اسلام قبول کرنے کے بعد دلیر خان تو بن گیا تھا مگر برادری کے دباؤ میں آ کر گاؤں ہی چھوڑ گیا اور بمبئی میں جا کر اس نادان مسکین عورت کا کیا حشر کیا تھا؟ کسی کو معلوم نہیں۔ مگر ایک روز وہی دلیر خان پھر دلیر سنگھ بن کر واپس گاؤں میں آ گیا اور ایک سسٹنی سے شادی کر کے دوبارہ سکھ برادری میں شامل ہو گیا تھا۔

محبت کی آنکھ وہ کچھ دیکھ لیتی ہے جسے محروم محبت کو دیکھنا نصیب نہیں ہوتا، محبت کے کان وہ آواز بھی سن لیتے ہیں جو لفظوں کی بھی محتاج نہیں ہوتی اور محبت کی زبان تو لفظوں کی محتاج ہوتی ہے نہ آواز کی۔ سچی محبت کی آنکھ، کان اور زبان صرف دل ہوتا ہے بلکہ یہ صرف اور صرف دل ہے جو محبت دیکھتا ہے، سنتا ہے، سناتا ہے اور محبت کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا بھی ہے! بوٹا سنگھ یعنی محمد بوٹا بھی سب کچھ جان گیا اور پہچان گیا۔ کلثوم ایسا نہیں کر سکتی، یہ ضرور کسی دشمن کی چال ہے لیکن یہ وقت دشمن و دوست کی پہچان کا یا دشمن سے سننے کا نہ تھا اس لیے محمد بوٹا برق رفتاری سے بازیاب یافتہ خواتین کے تمام کیمپوں میں گیا جو خالی ہو چکے تھے یا بند ہو رہے تھے۔ آخری کیمپ میں اسے ایک بچے والی بازیاب یافتہ خاتون کا سراغ ملا جو پاکستان جانے کے لیے بالکل آدھہ نہ تھی اور چلا چلا کر کہتی تھی کہ میرا سب کچھ یہیں ہے۔ مجھے چھوڑ دو مگر ریڈ کر اس والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ یہ عورت اپنا ذاتی توازن کھو چکی ہے۔ جب اپنے رشتہ داروں کو دیکھے گی تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ چنانچہ محمد بوٹا و امہ کی سرحد سے ہو کر واپس گاؤں پہنچا تو اسے تمام حقیقت بھی معلوم ہو گئی لیکن اب اسے وکرم سنگھ کے باپ کی دشمنی کا جواب دینے سے کہیں زیادہ اپنی بیوی اور بچے کی فکر تھی۔ اسی کشمکش میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن اچانک اسے پاکستان سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا ”میرا یہ تیسرا چوتھا خط ہے اگر اس معصوم کا خیال نہ ہوتا تو کب کی زہر کھا کر مر چکی ہوتی۔ اگر اب بھی خبر نہ لی تو پھر نہ میں ہوں گی نہ یہ معصوم ہوگا۔ فقط ثمن!“

یہ دوسری خط پڑھ کر محمد بوٹا لرز اٹھا۔ اب اس نے ہر حال میں پاکستان پہنچنے کا فیصلہ کر لیا مگر مشکل یہ تھی کہ سفری دستاویزات کس نام سے تیار ہوں؟ محمد بوٹا کو پاکستان آنے اور یہاں کا ہو رہنے سے کوئی

آخر رانی نے اپنی سب سے زیادہ قابل اعتماد اور تجربہ کار خادمہ پورنماں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ خادمہ سالہا سال سے اس کی خدمت خاص کے لیے مقرر تھی اور تجربہ نے بتایا تھا کہ رانی ہر طرح سے اس پر پورا اعتماد کر سکتی ہے۔ اس لیے اس کڑے وقت میں بھی اسے وہی یاد آئی۔ اسے اپنا ہمارا بنایا اور مدد کی خواستگار ہوئی۔ خادمہ اگرچہ ہمیشہ سے اس کی منہ چڑھی تھی لیکن اس سے زیادہ اس کی خوش نصیبی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک عظیم سلطنت کی رانی اپنے اس قدر ذاتی معاملہ میں بھی اسے ہمارا بنا کر اس پر اعتماد کرے۔ وہ دل و جان سے ہر خدمت کے لیے راضی ہو گئی تو رانی نے اسے اپنا پیامبر بنایا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ چچ سے کیا باتیں کس طریقہ سے کرنی ہیں۔

پورنماں نے اشاروں کنایوں میں اپنی رانی کا عندیہ چچ پر ظاہر کیا مگر بات اس کے پلے نہ پڑی اور وہ راجہ رانی سے اپنی وفاداری ہی کا دم بھرتا رہا تو پورنماں کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ وہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود دراصل بات کیوں نہیں سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے صاف الفاظ استعمال کیے ”نو جوان چچ، یہ نہیں تجھے واقعی رانی کی بات سمجھ نہیں آئی یا تو سمجھنا نہیں چاہتا۔ تیری ذہانت تو مشہور ہے پھر بھی اس بات کو تو نہیں سمجھتا ہے تو سن۔“ لے کہ مجھے رانی جی نے تیرے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ تیرے چہرے پر پہلی نظر پڑتے ہی تو ان کے دل کو بُری طرح بھا گیا ہے۔ اسی وقت سے خواب و خوش ان کے لیے حرام ہو گئے ہیں اور اب ان کی زندگی پوری طرح تیرے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر تُو نے ان کی بات نہ مانی تو اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں گی اور اس ہتیا کا ذمہ دار صرف تُو ہوگا۔“

دلچسپ چہرے والے خوبصورت اور نو جوان برہمن زادہ کے بغیر تو کب سے اسکی شخصیت نقشِ تکمیل میں تڑپ رہی تھی۔

یہ برہمن زادہ چچ، سندھ کے راجہ رائے سامسی کا وزیر مراسلات تھا اور اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں محل کے اندر راجہ کے سامنے حاضر ہونے کا اسے پہلی مرتبہ اتفاق ہوا تھا۔ دربان نے اس کی آمد کی اطلاع دی تو رانی بھی اتفاقاً اپنے پیار اور بوڑھے شوہر کے قریب بیٹھی تھی۔

اور جب چچ کو دیکھا تو رانی ایک ٹک دیگستی ہی گئی۔ اسے لگا کہ اس شکل کو دیکھنے کے لیے تو وہ جہنم جہنم سے ترستی آئی تھی۔ چچ کی قابلیت اور ذہانت نے تو راجہ کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ اب اس کی مردانہ وجاہت اور خوبصورتی رانی کو فریفتہ کر گئی اور یہ فریفتگی تو رانی کے من کا روگ بن گئی تھی جو کسی پہلو اسے ایک لمحہ کے لیے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ اس روگ کا کوئی علاج بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لے دے کر اگر کوڑا، تدبیر کسی تو صرف یہ کہ کسی طرح چچ اس کا بن جائے۔ وہ چچ کو حاصل کر لے۔ اس کے علاوہ من کی اس لگن کو بجھانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اس کی بے کلی کو اور کسی طور سکون نہیں مل سکتا تھا۔

رانی کے روگ کا علاج تو صرف ایک ہی تھا مگر اس علاج کی تدبیر، اس کا حصول کیونکر ممکن ہو سکتا تھا۔ اصل مسئلہ یہی تھا جو رانی کی اصل الجھن بنا ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع اور عظیم مملکت کی رانی تھی۔ مملکت کی حدود میں واقع ہر چاند اور بے جان شے اس کی ملکیت شمار ہوتی تھی اور چچ تو اس کی رعایا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ملازم بھی تھا مگر اس کے باوجود اس نو جوان کو حاصل کرنا اس کے لیے آسان بات نہیں تھی۔ بڑی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد



پروفیسر جلیل نقوی

راجہ داہر کی ماں

قریب تیرہ سو سال پہلے 2 جولائی 712ء کو راجہ داہر نے محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔

اسی راجہ داہر کے عالم وجود میں آنے کا مکمل تاریخی پس منظر!

ڈھب اور کسی طریقے سے بھی وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کا اپنا آپ جیسے اس کے ہاتھوں سے نکلا چلا جا رہا تھا اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنی شخصیت کی باگ ڈور کس طرح اپنے قابو میں رکھے۔ اسے لگتا تھا کہ اس

یہ بلند و بالا، سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم، روشن چہرے اور چمکدار آنکھوں والا برہمن زادہ تو رانی تو بہن دیوی کے دل میں ایک دم اس طرح کھب کر رہ گیا تھا کہ اب اس کا بے چین اور بے قرار من کسی طور اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کسی

جس پر عمل کرتا یوں سمجھو کہ میرے بس اور میری طاقت سے باہر ہے۔“

”ہونا برہمن، بزدل۔“ پورنماں نے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال میں جا کر ساری بات رانی جی کو بتاتی ہوں۔ تم کل پھر اسی وقت میرا انتظار کرنا۔ یہ خیال رکھنا کہ میں تم سے بالکل تنہائی میں ملنا چاہوں گی بلکہ کوئی ایسا انتظام کیے رکھنا کہ میرے یہاں تمہارے پاس آنے کی بھی کسی شخص کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

طنے کا تیرا اس قدر نوکیلا تھا کہ چچ نے اس کی کاٹ محسوس تو کی لیکن اس وقت چپ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے مسکراتے اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا ”جس طرح رانی جی کا حکم ہو گا۔ تم سے البتہ ایک التجا ہے۔ رانی جی کو پوری صورت حال اس طریقہ سے سمجھانا کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔ مجھے ان کی ناراضگی کا خوف بھی اسی قدر ہے جتنا میں مہاراج کے غضب سے ڈرتا ہوں۔“

پورنماں یوں مسکرائی جیسے اس وقت سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہو۔ اس نے لا پرواہی سے کہا ”بے فکر رہو نوجوان، تو میری رانی جی کو پسند آیا ہے۔ اب یہ دیکھنا میرا کام ہے کہ تجھے کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

پورنماں چلی گئی تو چچ تمام سرکاری فرائض کو بھول کر اکیلا بیٹھا اس معاملے پر سوچتا رہ گیا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ یکدم الجھ کر رہ گیا تھا۔ رانی کی پیشکش بجائے خود کچھ کم دلچسپ نہیں تھی۔ پھر اسے قبول کر لینے کے بعد اس کا مستقبل بھی اس قدر تابناک ہو جانا تھا کہ اس کے تصور سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اسے اپنے آپ پر رشک آنے لگا مگر اس کے

سے مجھے حاصل ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ کی مجھے تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ موجودہ حیثیت میں مہاراج اور رانی جی کی جو خدمت مجھ سے بن پڑے گی وہ ضرور کرتا رہوں گا۔“

پورنماں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ شخص کسی طرح راہ پر آ ہی نہیں رہا ہے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس قدر دلچسپ دعوت کو قبول کرنے میں وہ اتنے تردد سے کام لے گا چنانچہ اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا ”لیکن تجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رانی تجھ سے ناراض ہوئی تو یہ منصب بھی تیرے پاس نہیں رہے گا بلکہ ایسی صورت میں شاید تجھے اور تیرے سارے خاندان کو اپنی عزت و آبرو اور جان و مال سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔“

چچ بھی اتنی جلدی قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا اب تک اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ اس نے فوراً چیئر تبدیل کر جواب دیا ”تم نے رانی جی کی ناراضگی کی بات کی ہے تو مجھے بھی اصل بات کہنی پڑ رہی ہے کہ دراصل یہ ناراضگی کا ہی خوف ہے جو مجھے رانی جی کے حکم کو ماننے سے باز رکھ رہا ہے۔ دراصل میں مہاراج کے غضب سے بہت خوفزدہ ہوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ بادشاہوں کی ملازمت میں آدمی ہر لمحہ امید و بیم کے درمیان معلق رہتا ہے۔ وہ خوش ہو جائیں تو دنیا کی ہر بڑی سے بڑی نعمت آدمی کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے اور ذرا ان کا مزاج برہم ہو جائے تو آدمی کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ، آگ اور سانپ کا بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ کب کسی بات پر غضب ناک ہو کر آدمی کو جسم کر ڈالیں۔ رانی جی کا حکم سر آنکھوں پر، وہ جو بھی حکم دیں اس کی تعمیل میرے لیے انتہائی خوش نصیبی کا باعث ہے لیکن یہ ایک ایسی بات ہے

بڑے مندر کے پرودہ ہیں۔ میں مہاراج کا نمک کھاتا ہوں اور نمک حرام بننا ہرگز نہیں چاہتا۔ ویسے میں رانی جی کا ہر طرح سے خادم ہوں۔ مجھ جیسے غلام کی خاطر اپنی قیمتی جان دینے کا تو انہیں خیال بھی نہیں آتا چاہیے۔ ان کی زندگی تو ملک کی رونق کا باعث ہے۔ یہ کام تو ہم غلاموں کا ہے کہ ان کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیں۔“

پورنماں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”نوجوان چچ ٹو باتیں خوب بنانا جانتا ہے۔ تیری فصاحت اور بلاغت کے تو مہاراج اور دو باری سارے ہی معترف ہیں لیکن یاد رکھ کہ دنیا میں صرف باتوں کے سہارے کام پورے نہیں ہو جاتے۔ یہاں کچھ کرنے کے لیے آدمی کو تھوڑی سی ہمت بھی کرنی پڑتی ہے اور کچھ خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ مہاراج کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ ہر غرض مند تاک لگائے ہوئے ہے کہ راجہ کے بعد اس وسیع سلطنت کے تخت پر وہ قابض ہو جائے مگر یوں لگتا ہے کہ تخت خود پکارے تب بھی تو شاید اس تک پہنچنے کی ہمت نہ کر سکے۔ تجھے پتہ ہے کہ رانی کی عنایت اور مہربانی تجھے کسی وقت اس ملک کا راجہ بھی بنا سکتی ہے۔ مگر آتی خوش بختی کو تیری طرح دھکے دیتے ہم نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔“

”تمہاری اس بات میں بھی قطعاً کوئی شک نہیں۔“ چچ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”رانی جی اس سلطنت کی مالک ہیں۔ وہ جس شخص پر مہربان ہوں اسے جو چاہیں بخش دیں لیکن بنگلوان مہاراج کے پران سلامت رکھے۔ وہ دیر تک ہمارے سر پر سلامت رہیں۔ ان کے اولاد نہ سکی بھائی بند اور عزیز رشتہ دار بہتر رہیں۔ میں تو ان کی ذات اور قبیلہ سے نہیں ہوں۔ تخت تو کیا میں تو اس منصب کا بھی کبھی خواب نہیں دیکھ سکتا تھا جو مہاراج کی عنایت

چچ ایک لمحہ کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ یہاں تک کہ پورنماں پر بھی اسے شک گزرا کہ کہیں وہ کسی سازش کے تحت اسے کسی جال میں پھنسانے تو نہیں آئی ہے۔ ساتھ ہی اس کی نظروں کے سامنے ڈھلتی عمر کی صحت مند رانی کا سرخ و سپید چہرہ پھر گیا جسے اس نے ایک نظر اس وقت دیکھا تھا جب وہ پہلی بار محل کے اندر راجہ سے ملنے گیا تھا۔ اب اس نے سوچا تو اسے لگا کہ یہ چہرہ خوبصورت تھا۔ اس میں بلا کی جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بہت روشن تھیں۔

”لیکن“..... اس نے کچھ کہنا چاہا تو پورنماں فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی: ”دیکھ نوجوان، کوئی غور کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ ایسے لمحے ہر شخص کی زندگی میں نہیں آتے اور نہ کسی شخص کو بار بار ایسے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ جس ملک کی رانی تجھ پر دیال ہے اس کی وسعت کا تجھے اچھی طرح پتہ ہے۔ اس کی سرحدیں اگر ایک طرف کشمیر سے کران تک پھیلی ہوئی ہیں تو دوسری جانب کوہ سلیمان سے دہلی کے قریب سمندر تک چلی گئی ہیں۔ اتنی بڑی سلطنت اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی دوسری موجود ہو اور اتنی بڑی سلطنت کی رانی اگر کسی شخص پر مہربان ہو جائے تو اس سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔ تجھے تو ہر قسم کا تردد اور لیکن ویکن چھوڑ کر بے ساختہ میرے ہاتھ چوم لینے چاہئیں کہ یہ خوشخبری تیرے پاس لے کر آئی ہوں۔“

”یہ سب باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔“ چچ اب تک کافی سنبھل چکا تھا۔ ”بھگوان کی دیا سے مجھے اپنے آپ پر ناز ہے کہ مہاراج اور رانی جی دونوں مجھے اچھا سمجھتے ہیں لیکن تمہیں پتہ ہے کہ میں ایک برہمن کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ اور بھائی اب تک شہر کے

کی مہامی کی جانب چل پڑا تھا۔

دربار میں اس کی ملاقات وزیر مراسلات رام سے ہوئی۔ چچ نے اسے اپنی فصاحت و بلاغت سے اس قدر متاثر کیا کہ رام نے اسے اپنا نائب بنانے کی پیشکش کر ڈالی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ چچ کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ کامیابی اس قدر جلد اس کے قدم چوم سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے کہا ”حضور کی عین نوازش اور بندہ پروری ہے کہ مجھے خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ میں کوشش کروں گا کہ ہمیشہ حضور کے اعتماد کا اہل ثابت ہو سکوں۔“

چچ کے دل کی مراد برآئی تھی۔ ایک مدت سے اس کے دل میں یہ تمنا کروٹیں لیا کرتی تھی کہ اسے راجہ کے دربار میں کوئی منصب حاصل ہو سکے تاکہ مندر کی یکساں، آہستہ رو اور بے رنگ زندگی سے نجات پا کر اپنے مستقبل کی تعمیر کا موقع ملے۔ اس کا باپ اس معاملے میں اس کا ہم خیال نہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ”بیٹا اپنے آپ کو منوانے کے لیے شاہی درباروں کا نہیں بلکہ علیت اور قابلیت کا سہارا تلاش کرو۔ دربارداری انسان کی صلاحیتوں کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہے جس سے دھرم اور دنیا دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ دنیا کی اس قدر ہوس نہ کرو کہ وہ تمہیں استعمال کرنے لگے بلکہ دنیا پر حاوی ہونے کی کوشش کرو تاکہ تم اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکو۔“ مگر اس قسم کی تمام نصیحتیں چچ کے لیے بے معنی تھیں۔ اس کی مہم جو طبیعت کو مندر کی فضا بڑی تنگ اور محدود نظر آتی تھی۔ وہاں دھرم ہی کیا تھا۔ لگے بندھے مذہبی رسوم و فرائض اور پوجا پاٹھ، یا پھر یہ کہ کتابوں سے مغز مار لیا یا تجزیہ کی قسم کی علمی بحثیں کر لیں۔ جذبہ عمل کی نشانی کے لیے

ساتھ ساتھ اس پر راجہ کے اس قدر احسانات تھے کہ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا خیال بھی اس کے لیے سوہان روح تھا اور یہ تو ایسا معاملہ تھا کہ راجہ کو گمان میں بھی کہیں شک گزر جائے تو اس کے پورے خاندان کی ہڈیاں تک سلامت نہیں رہ سکتی تھیں۔ ساتھ ہی اب رانی کی ناراضگی کا خدشہ بھی تھا۔ اس کی آنا کو کہیں ٹھیس نہ پہنچ جائے کہ ایک حقیر برہمن زادہ نے اس کی توہین کر دی ہے۔ اس صورت میں بھی اس کی خیریت نہیں تھی۔ گویا وہ بچی کے دو پاؤں کے درمیان آچکا تھا اور کسی صورت بھی خیریت اور سلامتی کا راستہ نظر نہیں آتا تھا مگر یہ بھی تو ممکن تھا کہ اس خادمہ کا آنا کسی درباری سازش کا حصہ ہو۔ راجہ کی اس پر اس قدر عنایت تھی کہ وہ اب راجہ کا منظور نظر کہلاتا تھا۔ اس کے خلاف کسی بھی سازش کو جنم لینے کے لیے یہ بہت بڑا جواز تھا۔ محل کا کوئی اہل کار، کوئی منصب دار، کوئی غلام، کوئی خادم، کوئی خادمہ ہمیشہ اسی قسم کی سازشوں کا کردار رہے ہیں۔ ایسی صورت میں تو غالباً اس نے بالکل درست رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے از سر نو پورنماں کے ساتھ اپنی ساری بات چیت کا جائزہ لیا اور خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اس کے منہ سے کوئی غیر محتاط لفظ نہیں نکلا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے اپنے اعصاب پر کوئی انجانا سا خوف مسلط ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو جس قدر مطمئن اور پرسکون کرنے کی کوشش کرتا تھا اسی قدر اُلجھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس دن کو کوٹنے لگا جب اس کے دل میں راجہ کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا اسے یوں لگا کہ وہ دن بڑا منحوس تھا۔ جب وہ اپنی فصاحت، بلاغت، علیت اور خوش خطی پر نازاں مندر کے پچھاروں کے پرسکون حلقہ سے نکل کر راجہ کے دربار

قدر خوش تھا کہ اس کے روبرو جاتے۔ سچ کو ہمیشہ مسرت حاصل ہوا کرتی تھی مگر اسے کیا معلوم تھا کہ محل کے اندر راجہ کے برابر میں رانی بھی براہمن ہوگی۔ وہ ذہلیق عمر کی انتہائی صحت مند، سرخ و سپید چہرے اور بہت روشن آنکھوں والی عورت تھی۔ اس عورت نے سچ کو کس قدر سخت و بدھا میں ڈال دیا تھا کہ پورنماں کو اس کے پاس سے واپس گئے گھنٹوں گزر چکے تھے مگر وہ اپنا سب کچھ بھلائے اس اُجھن کے تانے بانے میں پھنسا یوں بیٹھا تھا جیسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہ گیا ہو۔ وہ کیا کرے؟ اب کیا ہوگا؟ کیا ہو سکتا ہے؟ ایسی ادھیڑ بن سے اسے زندگی میں پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ رانی سوہن دیوی پہلی عورت تھی جو ایک دم اس کے راستے میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس قدر اچانک جارحانہ انداز میں، اب وہ کیا کرے؟

پورنماں نے رانی کے پاس پہنچ کر سچ کے ساتھ اپنی گفتگو کی تفصیل سنائی تو وہ ایک دم بھڑک اُٹھی ”اچھا، اس پجاری زادے کی یہ مجال اسے پتہ نہیں کہ عورت کھل کر اظہار محبت صرف اس وقت کرتی ہے جب اپنی بات منوانے کا تہیہ کر چکی ہو اور میں تو اس ملک کی رانی ہوں۔ وہ سمجھتا کیا ہے۔ اسے اس کے خاندان سیت بھسم نہ کر ڈالوں تو رانی سوہن دیوی نام نہیں۔ یہ سن کر کہ رانی اس کے لیے خودکشی کرنے چلی ہے وہ خود کو کرشن کینیا ہی سمجھ بیٹھا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ رانی سوہن دیوی اگر اپنی ضد پر آگئی تو وہ آکر رانی کے پیروں تلے کی زمین چاٹے گا اور خلاصی کا خواستگار ہوگا۔“

پورنماں کا جیسا پن بدستور قائم تھا۔ اس نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا ”لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی اور راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ غصہ میں آپ نے کوئی قدم اٹھایا تو اسے جو نقصان ہوگا، ہوگا ہی۔ آپ کا

وزارت اس کے سپرد کر کے اسے باقاعدہ بدھمن کے نائب کا عہدہ تفویض کر دیا۔ اب وہ اس قدر مطمئن اور خوش تھا جیسے اس نے اپنا مستقبل ہمیشہ کے لیے تعمیر کر لیا ہو۔ جیسے اس کی ساری خواہشیں پوری ہو گئی ہوں اور اس کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا ہو۔ وہ پوری لگن اور محنت کے ساتھ امور مملکت انجام دینے میں مہمک تھا۔ راجہ اس کی تعریفیں کرتا نہیں ٹھکتا تھا۔ مہامنتری بدھمن اس سے انتہائی خوش تھا۔ دربار میں اسے بلا کا رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور اس کی قابلیت اور اہلیت کے چرچے دارالخلافہ سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔ دنیا کی ہر نعمت اسے اس کم عمری میں ہی حاصل ہو گئی تھی۔ دولت، عزت، عظمت، شہرت، سب کچھ اس کے قدموں میں تھا۔ اس لیے وہ انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ سوچا کرتا کہ راوی اس کے لیے اب چین ہی چین لکھتا ہے۔

مگر اس زندگی میں بھلا چین کہاں؟ ان دنوں وہ راجہ کی بیماری کے باعث کچھ پریشان سا رہا کرتا تھا کہ رانی نے اسے ایک شدید اُجھن میں پھنسا کر رکھ دیا۔ راجہ اپنی بیماری کے باعث کئی دن سے محل کے اندر ہی کا ہو کر رہ گیا تھا اور دربار کے ساتھ اس کا تعلق ان اہلکاروں کے ذریعہ ہی سے باقی تھا جو محل کے اندر اس کی خدمت میں حاضری دے سکتے تھے اور اس تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ بدھمن تھا مگر ایک کام کے سلسلہ میں اسے بھی محل کے اندر جانے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ بدھمن نے اسے کہا تھا کہ اس کام کے متعلق وہ خود جا کر راجہ سے مشورہ کرے۔ ایسے مواقع پر یہ کام اس سے پہلے رام کیا کرتا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ رام کی وزارت کے دیگر فرائض کی طرح اس کام کو بھی وہ بڑی آسانی سے بھگت لے گا۔ ویسے بھی راجہ اس سے اس

تھا۔ چنانچہ بہت تھوڑی سی مدت میں وہ تمام کام پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ رفتہ رفتہ دربار میں وہ وزیر مراسلات کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ شہر میں جگہ جگہ اس کی قابلیت اور تدبیر کے چرچے ہونے لگے۔ رام ہر کام میں اس پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرتا چلا گیا۔ مہامنتری بدھمن کی نظروں میں اس کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔ راجہ کے کانوں تک بھی اس کی قابلیت اور اہلیت کا ذکر پہنچ گیا اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ گمان اور غریب پروہت زادہ ملک کی اہم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے لگا۔

رام اب بوڑھا ہو گیا تھا اور کچھ بیمار بھی رہنے لگا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ راجہ کو سچ اس قدر پسند آگیا ہے کہ وہ اس پر پوری طرح مہربان ہو گیا ہے تو چند دن بعد ہی اس نے بدھمن کے مشورے سے اپنے تمام منشی امور سچ کے سپرد کر دیے۔ وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ ہوتے ہوتے راجہ کی اجازت سے دربار میں بھی رام کی جگہ اسے مل گئی اور راجہ کی خدمت میں ضرورت کے وقت رام کی بجائے وہی پیش ہونے لگا۔ ادھر پھر دربار میں اسے روز بروز زیادہ سے زیادہ رسوخ حاصل ہوتا چلا گیا۔ راجہ تو اس سے اس قدر خوش تھا کہ جب بھی سچ کو اس کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملتا انعامات اور خلعت سے نوازا جاتا۔ ایک دن تو راجہ نے بھرے دربار میں اس کے کام سے خوش ہو کر یہاں تک کہہ دیا تھا ”ہمیں اس نوجوان کی پیشانی میں غیر معمولی چمک نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی کوئی اہم خدمت انجام دینے والا ہے۔“

چند دن بعد رام کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تمام کام تو سچ پہلے ہی انجام دے رہا تھا۔ اب راجہ نے سچ کو بلا کر سارے درباریوں کی موجودگی میں قلمدان

وہاں کسی قسم کا ذریعہ نہ تھا۔ اسی لیے سچ وہاں کی زندگی سے بھاگنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ آخر اس کی مسلسل ضد اور پیہم اصرار سے مجبور ہو کر سیلاخ کو اس کی بات ماننی پڑی۔ سچ کو راجہ کے دربار میں جا کر قسمت آزمائی کی اجازت مل گئی لیکن اس کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ کسی سفارش یا سہارے کے بغیر وہاں جائے اور اپنے آپ اپنی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی کوشش کامیاب ہو جائے تو سمجھ لے کہ اس کی تمنا پوری ہوگئی ورنہ مندر کی زندگی کو اپنا نوشتہ سمجھ کر واپس آجائے اور ہمیشہ کے لیے خود کو مندر کے سپرد کر دے۔

گویا راجہ کے دربار تک رسائی اور وہاں اپنے لیے جگہ پیدا کرنے کی یہ کوشش اس کی اس عظمت، قابلیت اور صلاحیتوں کا بہت بڑا امتحان تھا۔ جن پر اسے بڑا ناز ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ تنہا راجہ کے دربار میں پہنچا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی کوشش ناکام رہی تو ساری زندگی کے لیے اسے اپنا آپ مندر کے سپرد کر دینا پڑے گا اور اپنی عزیز ترین تمنا کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کر لیتا ہوگا لیکن اپنی ساری قابلیت اور استعداد کے باوجود اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کامیابی کا حصول اس کے لیے اس قدر آسان رہے گا اور اب جبکہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر کامیابی بڑی آسانی اور خاموشی کے ساتھ اس کے قدموں میں آ پڑی تھی تو اس کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ اس نے گویا آسمان کی بلند یوں کو چھو لیا تھا۔

راجہ کے دربار نے اسے اتنی جلد قبول کر لیا تو سچ نے بھی اپنی پوری قابلیت اور عظمت کو کام میں لا کر انتہائی محنت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے شروع کر دیے۔ خدا داد لیاقت اور ذہانت کا جوہر اس کے اندر موجود تھا ہی۔ بخت کا ستارہ بھی اوج پر

اور انتہائی خوش ہو کر اطمینان کا سانس لیا کہ ایک بہت بڑے طوفانی چکر کی زد سے محفوظ نکل آیا ہے۔

محل کے اندر چچ کی آمد و رفت شروع ہوئی تو چند دن بعد اس پر انکشاف ہوا کہ رانی اچھی خاصی حسین و جمیل عورت ہے۔ اگرچہ اس کی عمر اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں سے ڈھلنے کی بات شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ راز چچ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اس مقام پر پہنچ کر عورت میں ایک نئی قسم کی کشش اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے جو نوعمری سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہاں آ کر عورت میں وہ بھرپور قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو مرد کو سکون اور آسودگی کا احساس بخشتی ہے۔ اسی لیے چچ کو احساس ہوا کہ رانی کا شمار اب بھی حسین ترین عورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ پھر اس کا شاہانہ وقار، پر فرخ ناز، ایک انوکھی آن اور بھرپور جمال تو اسے لاکھوں میں نمایاں کرنے کے لیے کافی تھا۔ رانی کی نوازشات بھی چچ پر روز افزوں تھیں۔ ادھر اس کے دل سے خوف اور دھڑکے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہٹا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ غیر محسوس طور پر رانی کی جانب کھینچا چلا گیا۔ روز بروز اس کے اور زیادہ قریب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار اسے خود انتظار رہنے لگا کہ کب محل کے اندر جانے کا بہانہ ہاتھ آئے اور کب رانی کے درشن ہوں۔ محل کے اندر پہنچ کر اس کی خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت رانی کی قربت میں گزار سکے۔ اس کی نوازشات کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا سکے۔ زیادہ سے زیادہ دیر اس سے باتیں کر سکے۔

اتفاق سے راجہ سامسی رائے پر انہی دنوں بیماری کا پھر حملہ ہو گیا۔ بڑھاپا بذات خود بہت بڑی بیماری ہے اور پھر راجہ تو کافی کمزور بھی ہو گیا تھا۔ اس لیے بیماری عموماً اسے آدہائی تھی۔ راجہ کی بیماری کے باعث چچ کو روزانہ ہی امور سلطنت پر مشورہ کرنے کی غرض سے راجہ کے پاس محل کے اندر جانے کی ضرورت پیش

مقصد بھی تو حاصل نہ ہو سکے گا۔

یہ سن کر رانی واقعی کچھ دھیمی پڑ گئی۔ حیرانی سے بولی: ”کوئی اور راستہ؟ وہ کیا ہو سکتا ہے؟“

”کوئی بھی ایسی تدبیر کہ اس کے دل سے خوف کا بوجھ کم ہو جائے۔ اس کے بعد میرا خیال ہے کہ اسے تحلیل حکم میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔“

”تو تو اس طرح بات کر رہی ہے جیسے کوئی تدبیر پہلے ہی سے تیرے ذہن میں موجود ہے۔“

پورنماں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں رانی دیوی سے بہتر تو کیا سوچ سکتی ہوں۔ بس اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ اگر اسے یہ کہا جائے کہ روزانہ آ کر رانی دیوی کو صرف اپنی شکل دکھایا کرے تو میرا خیال ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد اسے یقین ہو جائے گا کہ رانی دیوی سے ملنے میں کوئی خدشہ نہیں ہے۔ ویسے بھی روزانہ آنا سامنا ہوگا تو رانی دیوی کا بے مثل حسن و جمال خود بخود شکار کے لیے ایک مضبوط دام کا کام کرے گا۔“

”ہو..... س..... س.....“ رانی کے ہونٹوں پر تبسم لہرا گیا۔ ”باتیں بنانی تجھے بھی خوب آتی ہیں لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ذرا سوچ لینے دے۔“

اگلے روز جب مقررہ وقت پر پورنماں نے چچ کو رانی کے شدید رد عمل اور اس مطالبے سے آگاہ کیا کہ وہ دن میں کم از کم ایک بار کسی بہانے محل میں آ کر رانی کو اپنا دیدار کرا دیا کرے تاکہ ان کے دل کی پیش پر سکون رہ سکے اور یہ کہ وہ اتنے پر ہی خوش ہو جائیں گی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیں گی تو چچ نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس قدر شدید الجھن اور پرخطر صورتحال کے مقابلہ میں یہ مطالبہ بہت معمولی تھا۔ محل کے اندر جانے کے چچ کے پاس سو بہانے تھے۔ وہ کسی بھی وقت ذرا کی ذرا محل کے اندر جا کر اپنے اس وعدہ کو نبھانے کے قابل تھا۔ اس لیے اس نے بلا تردد یہ بے ضروری بات مان لی

ہے۔ ”بدھمن نے فوراً کہا ”یہ نوجوان اب تو کافی عرصہ سے ہمارے پاس ہے۔ سب ہی اس کی دیانتداری اور راست روی کے معترف ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی نے صرف حسد کے مارے اس کی چغلی کھائی ہے۔“

یہ بات راجہ کے دل کو گئی۔ اس نے یقینی لہجہ میں کہا ”ہاں لوگ یقیناً اس سے حسد کرنے لگے ہوں گے کہ یہ ہماری ذات کا نہ قبیلہ کا مگر اس نوعمری میں ایسے بلند منصب پر کیسے پہنچ گیا؟“

”بالکل درست فرمایا مہاراج!..... مہاراج! لوگ کسی کی قابلیت اور اہلیت کو تو دیکھتے نہیں خواہ وہ حسد کرنے لگتے ہیں۔ آپ ایسی باتوں پر قطعاً دھیان نہ دیجئے۔ خاص طور پر ان دنوں تو آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ آپ ٹیخت رہیے۔ میں سارا کھوج نکال لوں گا۔“

کھوج تو کیا نکلتا البتہ یہ بات اس طرح رفت گزشت ہو گئی کیونکہ راجہ کی بیماری طویل پکڑ گئی اور روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ سرکار دربار میں اور ہر کام کو بھول کر سب کو ان کی فکر پکڑ گئی لیکن تمام دوا میں بیکار ثابت ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ رانی کو یقین ہو گیا کہ راجہ کی حیثیت اب چراغ محری سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے دور رس ذہن نے فوراً ایک تدبیر سوچی۔ پہلے تو اس نے عیادت اور مزاج پرسی کے لیے آنے والوں پر پابندی لگا دی کہ راجہ کی طبیعت اب کسی بات کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے اور انہیں مکمل آرام میں خلل اندازی کی برداشت نہیں رہی ہے۔ اس کے بعد اس نے شاہی معان کو اعتماد میں لیا اور اسے بے انتہا انعام و اکرام کا لالچ دے کر اس بات پر رضی کر لیا کہ راجہ کی حالت خواہ کیسی بھی ہو دربار میں یہی بتایا جاتا رہے گا کہ ان کی حالت سنبھل رہی ہے اور انہیں پورے آرام کی ضرورت ہے۔ بدھمن تو اس

آنے لگی۔ رانی اس موقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے چچ کو زیادہ سے زیادہ درمحل کے اندر ٹھہرائے رکھتی۔ ادھر چچ کا بھی اب کہاں دل چاہتا تھا کہ رانی سے الگ ہو۔ دونوں بیٹھے جانے کیا کیا باتیں کیے جاتے اور پورنماں، رانی کی ہدایت کے مطابق ان کی خاطر مدارت میں لگی رہتی۔ رانی روزانہ کوئی نہ کوئی پیش قیمت تحفہ اس کے لیے منگوا رکھتی۔ اس کے جواب میں چچ کو بھی کچھ نہ کچھ پیش کرنا پڑتا۔ ہوتے ہوتے بات راز و نیاز، وعدے وعید اور قول و قرار تک پہنچ گئی۔ چچ کو بھی یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی زندگی میں معنی کا رنگ رانی سوہن دیوی ہی بھر سکتی ہے لیکن تھا بہت ذکی اور دوراندیش۔ اس لیے اس نے اپنی قدر و قیمت کو مزید بڑھانے اور رانی کو..... پوری طرح قابو میں کر لینے کی خاطر پورے ضبط سے کام لیا۔ اب اسے پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ بوڑھے راجہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد رانی اس کے لیے کیا کچھ کر گزرنے کے قابل تھی۔

پورنماں انتہائی خوش تھی کہ اس کی تدبیر سو فیصد کارگر ثابت ہوئی تھی اور اس طرح اسے رانی کا اور زیادہ قرب اور اعتماد حاصل ہو گیا تھا لہذا اب محل کے اندر رانی کے بعد اسی کا درجہ تھا لیکن سب لوگ تو اس جیسے نہ تھے۔ نکتہ چیں اور چغل خوروں کی کہاں کی رہی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ دربار یا محل کے کسی شخص نے چچ اور رانی کے تعلقات کی بات خوب نمک مرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر راجہ کے کانوں تک پہنچا دی۔ بڑھاپے اور بیماری کے ستارے ہوئے راجہ کو سخت دھچکا لگا مگر اس نے برداشت سے کام لیتے ہوئے بدھمن کو طلب کیا اور ساری بات اسے بتاتے ہوئے کہا:

”ہمیں یقین نہیں آتا کہ چچ جیسا نیک برہمن زادہ ایسی حرکت کر سکتا ہے۔“

”مہاراج یقین کرنے والی بات ہی نہیں

خانوادہ کا ہمیشہ سے نمک خوار اور خیر خواہ تھا اس لیے رانی نے اسے بھی بڑی آسانی سے ہموار کر لیا۔ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی چنانچہ اس نے چچ کو اپنے کمرے میں بلایا اور بڑی رازداری سے کہا: ”مہمیں یہ تو معلوم ہو گا کہ مہاراج کی حالت غیر ہو چکی ہے۔ مجھے ان کی زندگی کی امید نہیں رہی ہے۔ اب تمہارے لیے عمل کا وقت آ گیا ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟“

چچ کو اپنے بدن میں ایک جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اسے کافی دنوں سے اندازہ تھا کہ یہ وقت کسی لمحہ بھی آ سکتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وقت آنے پر اسے کیا کرنا ہو گا۔ اس لیے جھجکتے ہوئے کہا ”میں..... میں سمجھا نہیں کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔“

”فی الحال تم صرف یہ اعلان کر دو کہ کل دربار عام منعقد ہو گا۔ سلطنت کے تمام امراء اکابر اور درباری لازمی طور پر حاضر ہوں۔ مہامنتری اس سلسلہ میں تمہاری مدد کریں گے۔ انہیں میں نے ساری بات سمجھا دی ہے۔“

دوسرے دن صبح وقت مقررہ پر تمام اکابر و عمائد، امراء اور سربراہان دربار میں پہنچ کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ تو گئے لیکن ان کے دل ایک انجانے خوف میں جکڑے ہوئے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ راجہ تخت پہنار ہے اور دربار میں آنے کے قابل نہیں۔ پھر ان سب کو دربار میں کیوں طلب کیا گیا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ان کے چہرے پر بے یقینی اور خوف اور دھڑکے کے تاثرات جھلک رہے تھے اور وہ آپس میں کھسر پھسر کر کے اصل بات معلوم کرنا چاہتے تھے مگر وہاں سب ایک جیسے تھے کوئی بھی کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ چچ کو بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ بھی عجب گونگوں میں جتنا تھا کہ آخر رانی کیا قدم اٹھانا چاہتی ہے البتہ بدھمن کا

تجربہ کار چہرہ اس طرح پرسکون تھا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو مگر وہ کسی کو کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس لیے سرگوشیوں میں چہ میگوئیاں جاری رہیں اور سب کے دل ایک انجانے خدشہ سے بے طرح دھڑکتے رہے۔

اچانک محل کی جانب سے ہٹو بچو کا شور بلند ہوا۔ دربار میں بیٹھے ہوئے لوگ ابھی اس شور کی وجہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ یکایک رانی سوہن دیوی دربار عام میں پہنچ گئی۔ اسے دیکھتے ہی ہر شخص دم بخود ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مملکت سندھ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ راجہ کے بجائے رانی دربار عام میں آئی تھی۔ رانی بڑھ کر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئی اور درباریوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو سب کے سب ساکت ہو کر بیٹھ گئے۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں رانی کی آواز ابھری تو سب ہمدن گوش ہو گئے۔ وہ کہہ رہی تھی:

”آج میں نے عظیم مملکت سندھ کے راجہ مہاراج سامسی رائے کی خواہش پر آپ سب لوگوں کو دربار میں آنے کی تکلیف دی ہے۔ یہ بات آپ سب کو معلوم ہے کہ مہاراج کی علالت طویل چلتی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے امور مملکت میں خلل واقع ہو رہا ہے۔ سلطنت کے بہت سے کام رک گئے ہیں اور یہ صورتحال ملک و قوم کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ مہاراج کو اپنی علالت کے باوجود ہر لمحہ ملک اور قوم کی بہبود کا خیال ہے۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ جب تک وہ خود حکومت کے کام سنبھال لینے کے قابل نہ ہوں ان کی جگہ کوئی ایسا شخص یہ کام چلاتا رہے جس کی قابلیت مسلمہ ہو اور جسے امور مملکت پر پورا عبور حاصل ہو۔“ رانی نے ایک لمحہ ٹھہر کر درباریوں کے چہروں سے ان کے دلی تاثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حکومت کے کاموں کے لیے مہاراج اپنے وزیر چچ کی

حکومت کی مخالفت کر سکتے تھے یا جو رانی کو صرف اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ تخت کا وارث پیدا نہیں کر سکی تھی۔ ان میں سے کچھ راجہ کے عزیز و اقارب تھے اور کچھ امراء و اکابر۔

چچ نے سب سے پہلے تو پچاس مضبوط زنجیریں منگوا کر اپنے ایک قابل اعتماد خادم کے ذریعہ رانی کو بھجوا دیں اس کے بعد رانی کی ہدایت کے مطابق بدھمن کو تمام منصوبہ بتا کر اسے اعتماد میں لیا۔ اس طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد ان پچاس آدمیوں کو بلانے کے لیے الگ الگ ایک خاص ترحیب سے ایک ہی پیغام سب کو بھیجا کہ ”مہاراج کی علالت نازک صورت اختیار کر گئی ہے۔ وہ آپ کو وصیت کرنے کے لیے طلب فرما رہے ہیں۔“

یہ پیغام جس کو بھی ملا وہ بھاگا چلا آیا۔ ہر ایک نے یہی سمجھا کہ سلطنت کا اہم ترین فرد وہی ہے اور ہر شخص کو امید لگی کہ شاید تخت و تاج اسی کے حوالے کیا جانے والا ہے۔ ادھر محل میں ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ان پچاس آدمیوں میں سے کسی کو ایک دوسرے کا پتہ نہ چل سکے، نہ ایک دوسرے پر نظر پڑ سکے۔ انہیں ایک ایک کر کے محل کے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ہر ایک کو ایک نئے کمرے کی جانب بھیجا جاتا تھا۔ ان کمروں کے اندر مضبوط زنجیریں پہلے سے نصب تھیں۔ جونہی کوئی شخص راجہ کی وصیت سننے کمرے کے اندر داخل ہوتا، مستعد اور اعتماد خادما سے قابو کر کے زنجیروں میں جکڑ دیتے تھے۔

اسی دن شام کے وقت راجہ کے ان تمام عزیزوں اور رشتہ داروں کو محل کے دروازہ پر بلایا گیا جنہیں ان کے خوشحال بھائیوں نے بالکل فراموش کر رکھا تھا۔ وہ عسرت و تنگ دستی کے ہاتھوں زندگی سے بیزار تھے اور مفلوک الحال ہونے کے باعث راجہ کی عزیزداری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے جمع ہو جانے پر

قریب بٹھاتے ہوئے کہا ”لیکن ان کے بعد مجھے نظر آتا ہے کہ تخت کے بے شمار دعویدار پیدا ہو جائیں گے۔ مہاراج کے اولاد ہوتی تو کوئی جھگڑا نہیں تھا مگر اب تو ان کے عزیز اور شاید کچھ امراء بھی تخت کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں گے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آج کے دربار کے بعد ہی سارا شیٹ اور گٹھ جوڑ شروع ہو گئے ہوں گے۔“

”آپ بڑی دوراندیش ہیں رانی دیوی۔“ چچ نے اعتراف کیا۔ ”مگر آئندہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ اگر کل ہی کوئی فتنہ کھڑا ہو گیا تو؟“

چچ کو کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر رانی بدستور بالکل مطمئن تھی۔ اس نے پرسکون لہجہ میں کہا ”یہ معاملات اسی طرح طے نہیں ہو جایا کرتے۔ آج رات تم محل میں میرے پاس رہو تا کہ تمام پہلوؤں پر مکمل غور و خوض کے بعد کوئی راستہ نکالا جاسکے۔“

چچ تو اب پوری طرح رانی کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح تھا۔ رانی کا اشارہ اس کے لیے واجب العمل تھا۔ اتنی بڑی سلطنت اسے اپنے قدموں میں محسوس ہو رہی تھی اور یہ سب کچھ رانی کی وجہ سے تھا۔ اس لیے وہ رانی کے قدموں میں تھا۔ چنانچہ وہ رات اس نے رانی کے کمرے میں گزار دی۔ رانی کی دیرینہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور صبح ہونے تک آئندہ کے لیے ایک منصوبہ بھی بن چکا تھا۔

دوسرے دن صبح انہیں جو پہلی خبر ملی وہ راجہ کی موت کی تھی۔ وہ گزشتہ رات کسی وقت چل بسا تھا جبکہ رانی اپنے کمرے میں چچ کی آغوش گرم کیے ہوئے تھی مگر رانی نے مکمل انتظام کر رکھا تھا کہ جب تک وہ نہ چاہے راجہ کی موت کی کسی کو کاناں کان خبر نہ ہو۔ ادھر چچ رانی کے کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں ان پچاس آدمیوں کے ناموں کی ایک فہرست تھی جو تخت کے دعویدار بن سکتے تھے یا چچ کی

انگلی میں پہنی ہوئی مہر حکومت کو دکھاتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس مہر کے ذریعہ اسے سب سے پہلا کام کون سا کرنا چاہیے۔ انہی سوچوں میں اٹھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے قدم محل کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ رانی سونہن دیوی نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلایا اور دیکھتے ہی بولی:

”مبارک ہو چچ۔ اب تم راجہ بن گئے ہو۔ اتنی بڑی سلطنت کے مالک۔ اب تو تمہیں پتہ چلا کہ میں تمہارے لیے کیا کچھ کر سکتی ہوں لیکن تم شاید اب بھی مجھے اس لائق نہیں سمجھتے کہ میری تمنا پوری کرو۔“

چچ کے لیے اب کچھ بولنے کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔ رانی نے اس کے قریب پہنچ کر اپنے بازو اس کی گردن میں سمائل کر دیئے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک نہیں بلکہ دو سلطنتوں کی بادشاہت اسے بیک وقت مل گئی ہے مگر بظاہر اب بھی اس نے خود کو سنبھالے رکھا اور صرف بات کرنے کی خاطر ایک موضوع ڈھونڈتے ہوئے بولا:

”رانی دیوی، آپ مالک ہیں، میں تو آپ کا بندہ بے دام ہوں مگر ایک بات ضرور بتا دیجئے کہ یہ انگوٹھی کیا واقعی مہاراج نے دی تھی آپ کو؟“

”مہاراج کہاں سے دیتے۔“ رانی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”انہیں اب ان باتوں کا ہوش ہی کہاں ہے۔ یہ تو میں نے خود ان کی انگلی سے اتار لی تھی مگر تم یہ نہ سمجھ لینا کہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ میں پہنچ گئی ہے تو کام مکمل ہو گیا ہے۔ حکومت پر پوری طرح قبضہ کرنے کے لیے ابھی بہت سی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔“

”حکومت پر قبضہ؟“ چچ نے سخت حیران ہوتے ہوئے پوچھا ”اور مہاراج؟“

”مہاراج تو اب چند سانوں کے مہمان ہیں۔“ رانی نے بڑے اطمینان سے اسے اپنے

لیاقت، دیانت اور ذہانت پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ سب کے سامنے چچ کو عارضی طور پر مہاراج کا نائب مقرر کر دوں۔ اس مقصد کے لیے مہاراج نے اپنی مہر حکومت والی یہ انگوٹھی مجھے دی ہے۔“ رانی نے انگوٹھی درباریوں کے سامنے لہرائی اور اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ”تا کہ اسے آپ لوگوں کے سامنے چچ کے حوالہ کر دوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ بھی مہاراج کی رائے سے متفق ہوں گے کیونکہ مہاراج کی طرح آپ بھی چچ کی قابلیت اور اہلیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔“

رانی کچھ دیر کے لیے خاموش رہی تو دربار کا سناٹا بدستور قائم تھا۔ امراء و عمائدین کے لیے یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ فوری طور پر کسی کو کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ رانی نے بھی انہیں زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دی اور پورے دربار کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے کہ پورا دربار مہاراج کی رائے سے اتفاق رکھتا ہے اور کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ انگوٹھی اور حکومت کے اختیارات چچ کے سپرد کرتی ہوں۔“

چچ کو اپنے نزدیک بلا کر رانی نے انگوٹھی اسے تھما دی اور اس کے ساتھ ہی دربار کو برخاست کرتے ہوئے اطمینان سے اٹھ کر باوقار قدموں کے ساتھ محل میں واپس چلی گئی۔ امراء اور اکابر کا اب تک یہ حال تھا جیسے وہ سب بھونچکا ہو کر رہ گئے ہوں اور کوئی بات کرنے کے لیے انہیں کافی دیر تک اپنے حواس بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

اتنی بڑی سلطنت پر حکومت کے اختیارات یوں اچانک حاصل ہو جانے پر چچ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ تو کبھی خواب میں بھی یہ خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی حالت اس مفلس شخص کی تھی جسے ایک دم بے اندازہ دولت مل گئی ہو اور پتہ نہ چلتا ہو کہ اس دولت کو استعمال کیسے کرے۔ وہ بار بار اپنی



نہیدہ کوثر

کپڑے سیٹ کر الماری میں رکھے اور دوبارہ کچن کی طرف لوٹ آیا لیکن ڈور بیل کی آواز پر چونک گیا۔ بھاگ بھاگ دروازے پر پہنچا۔ وہ کچھ حیران بھی تھا کہ اس قدر شدید طوفان میں کون ہو سکتا ہے؟ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔

ایک شخص کا فسانہ جس نے خود پر مصنوعی خول پڑھا رکھا تھا

پھر اس کا بوجھ اسے خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ آئینے میں اپنے سر کو دیکھتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ اس کا سر ابھی نہیں بڑھا۔ ایک مرتبہ اس کا اپنے ہم جماعت سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے لڑکے کو بہت پیٹا، اچانک ہی اسے اپنے سر کا خیال آیا۔ وہ واپس گھر کی طرف بھاگا۔ تمام راستے اس کا سر بوجھل اور دماغ ماؤف

وہ بہت شریف انفس انسان تھا۔ اس کی تربیت کا یہ خاصا تھا کہ وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ وہ ضرورت کے وقت ہی بولتا تھا۔ اس کی تربیت میں اس کی نانی اماں کا بڑا اہم کردار تھا۔ انہوں نے بہادر سوراؤں کی کہانیاں سنا کر اسے ایک مضبوط انسان بنا دیا تھا۔ اس نے نانی اماں سے سن رکھا تھا کہ گناہ کرنے والے کا سر بہت بڑا ہو جاتا ہے اور

مکمل طور پر اطمینان کر لینے کے بعد رانی نے راجہ ساہی رائے کی موت کا اعلان کر دیا۔ سارے ملک میں ایک ماہ تک اس کا سوگ سرکاری طور پر منانے کا فیصلہ ہوا۔ اس کی ارٹھی پورے شاہانہ اعزاز اور مراسم کے ساتھ اٹھائی گئی اور خاص صندوق کی چتا میں منوں گئی کے ساتھ جلا دی گئی۔

اب جج اور رانی سوہن دیوی کے لیے میدان قطعاً صاف تھا۔ مخالفین سب ختم ہو چکے تھے۔ حکومت پر عملاً جج کا قبضہ تھا اور ملک ان کے قابو میں تھا۔ چنانچہ ۶۳۲ء میں جج کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی اور وہ مملکت سندھ کا پہلا برہمن راجہ بنا۔ رانی سوہن دیوی کے عشق نے رائے خاندان کی حکومت کا ہی سندھ سے خاتمہ کر ڈالا اور برہمن خاندان کو یہ حکومت سونپ دی۔ تاجپوشی کے ساتھ ہی جج نے رانی سوہن دیوی کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی اور اسے اپنی رانی بنالیا۔

راجہ جج کی تاجپوشی کی رسم اسلامی تقویم کے مطابق ۱۱ھ میں شہر الوری میں ادا ہوئی جو ان دنوں کا بڑا خوبصورت شہر اور سندھ کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر کی نشانی روہڑی کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں اب بھی باقی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کی تاجپوشی کا سال وہی ہے جس سال جزیرہ نمائے عرب میں فخر آدمیت اور رہبر کامل ﷺ نے دنیا میں اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد رحلت فرمائی۔ اسی شہر الوری میں راجہ جج کے ہاں کچھ عرصہ کے بعد رانی سوہن دیوی کی سکن سے وہ لڑکا پیدا ہوا جو بعد میں داہر کے نام سے سندھ کا راجہ بنا اور نبی کریم ﷺ کے ایک نام لیوا نوجوان محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست کھا کر سندھ کا آخری ہندو راجہ ثابت ہوا۔

ماخذ: 1- جج نامہ، 2- تاریخ سندھ از مرزا محمد کاظم برلاس، 3- تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی، 4- تاریخ سندھ از مصحوبی، 5- تحفۃ الاکرام

رانی خود محل سے نکل کر آئی اور ان سے مخاطب ہوئی۔ ”میں نے آپ لوگوں کو اس لیے یہاں آنے کی تکلیف دی ہے کہ آپ میرے بھائی اور عزیز ہیں۔ میں نے مہاراج کے ناطے سے آپ سب کو ہمیشہ اپنا سمجھا ہے لیکن آپ کی بد حالی اور غربت کو میں صرف اس لیے دور نہیں کر سکی اور آپ کو اپنا صحیح مقام اس لیے حاصل نہیں ہو سکا کہ آپ کے اپنے عزیز رشتہ دار آپ کا حق غصب کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے لیے منصب، عہدے اور جاگیریں حاصل کرتے رہے مگر آپ کو فراموش کیے رکھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ان امراء اور درباریوں سے کبھی خوش نہیں رہے جو آپ کے عزیز ہو کر بھی آپ کی خبر گیری نہیں کرتے تھے مگر وہ طاقت اور دولت کے باعث آپ کی پہنچ سے باہر رہے۔ آج میں آپ کو خوشخبری دیتی ہوں کہ مہاراج کے حکم سے میں نے ان سب غاصبوں کو آپ کی خاطر قید کر دیا ہے تاکہ آپ سب ان کے ظلم سے نجات پائیں اور اپنوں نے آپ کے جو حقوق غصب کر لیے تھے وہ آپ کو واپس مل جائیں۔“

جمع سے رانی اور مہاراج کے لیے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ رانی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”لیکن اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے آپ کو بھی تھوڑی سی ہمت کرنی پڑے گی۔ یہ سب غاصب لوگ محل کے اندر مختلف کمروں میں زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں۔ آپ اندر جا کر اپنے ہاتھوں انہیں قتل کر کے ان کے ظلم کا بدلہ چکائیں۔ آپ میں جو شخص ان میں سے جسے بھی قتل کرے گا اس کے مل و دولت اور جاگیر کا بھی حقدار ہوگا۔“

یہ سننا تھا کہ یہ غریب اور فاقہ کشی سے تنگ آئے ہوئے لوگ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے محل کے اندر جا کر اپنے ہاتھوں انہیں قتل کر کے ان کے ظلم کا بدلہ چکائیں۔ آپ میں جو شخص ان میں سے جسے بھی قتل کرے گا اس کے مل و دولت اور جاگیر کا بھی حقدار ہوگا۔

میں شامل کر دی۔

☆.....☆.....☆

اچانک ہی لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔
”کیا میں سو گئی تھی؟“ لڑکی پریشان سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔

لڑکی نے کلاک پر نظر ڈالی۔

”افوہ بہت دیر ہو گئی“..... وہ گھبراہٹ میں بولی۔

اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ طوفان تھم چکا تھا۔

لڑکی نے بستر کے قریب رکھا ہوا جوتا پہنا اور آہستہ آہستہ اس کے قریب آ گئی۔ ”شاید میں سو گئی تھی“..... وہ بولی۔

”آں..... ہاں“..... وہ گھبرا گیا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی سپنے سے جاگا ہو۔ لڑکی کے چاہنے کے بعد بھی ابھی تک اس کے وجود کا احساس کمرے میں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے نانی اماں کی کہانیاں یاد آ گئیں۔

”ظلم“ وہ چونکا۔

اس نے یکبارگی اپنے سر پر ہاتھ پھیرا جو کہ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ اس کا سر تو نہیں بڑھا۔ وہ بڑبڑایا۔

تاہم اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ وہ تھکن سے بیڈ پر گر گیا۔

”یہ کیسا بوجھ ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

شاید نانی اماں کی کہانیوں کا بوجھ تھا یا گناہ کا بوجھ..... اسے جواب نہ مل سکا۔



کے لیے پناہ مل سکتی ہے۔“

لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

”لیکن میں گھر پر اکیلا ہوں۔“ اس نے گھبراہٹ سے کہا۔

”میں طوفان کے ختم ہوتے ہی واپس چلی جاؤں گی۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

وہ لڑکی کی لجاجت کو دیکھ کر دروازے سے ہٹ گیا۔

خوفزدہ سی لڑکی ہولے ہولے قدم بڑھاتی اندر آ گئی۔

لڑکی نے طائرانہ سی نظر کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں پر ڈالی اور بیڈ کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

”آپ آرام کیجئے میں چائے لاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

اس نے کرسی تھسٹ کر لڑکی کے آگے کر دی۔ وہ بلا چوں و چراں کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ کچن میں آ گیا اور دوبارہ چائے بنانے لگا۔ اس کباڑ خانے میں اسے لڑکی کا وجود نہ مل گیا۔

رہا تھا۔ اسے نانی اماں کی کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں بہادر سورما ہوتے تھے۔ نانی اماں نے اسے بھی بہادر بنا دیا ہے۔ اس نے خود کو اندر سے مضبوط کرتے ہوئے سوچا۔

پھر اسی سے کچن کے سامنے والی دیوار پر سورماؤں اور بہادر انسانوں کی شکلیں اُبھرنے لگیں جو اس پر قہقہے لگا رہے تھے اور وہ ان قہقہوں سے اندر ہی اندر موم کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔

اچانک ہی اس کی مضبوطی کا خود ساختہ خول اس کے وجود سے الگ ہو کر چولہے پر گر پڑا اور جل کر خاکستر ہو گیا اور پھر تمام سورما ایک ایک کر کے اس کے قدموں پر گر گئے۔

اس نے کچن کی فیلٹ میں رکھی ہوئی خواب آور گولیوں کی کچھ مقدار چائے کے کپ

”تختہ مشق“

جج ملزم نمبر 1 سے: تم کو عدالت میں کس لیے لایا گیا ہے؟

ملزم نمبر 1: ”حضور، میں فٹ بال سے کھیل رہا تھا۔“

جج ملزم نمبر 2 سے: تم عدالت میں کس لیے لائے گئے ہو۔

ملزم نمبر 2: حضور، میں فٹ بال سے کھیل رہا تھا۔

جج ملزم نمبر 3 سے: اور تم کیوں آئے ہو؟

ملزم نمبر 3: حضور، وہ فٹ بال میں ہی تھا۔

رہا۔ گھر آ کر بار بار اپنے میں سر کو دیکھا لیکن ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا جو نانی اماں بتایا کرتی تھی۔ نجانے کیوں اس کے ذہن میں خوف بیٹھ گیا۔

آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ اب ہر ایک کی کڑوی سیلی بات برداشت کر لیتا تھا اور آف تک نہ کرتا تھا اور نہ ہی جواب دہ بھلا کہتا۔ خاموش طبع تو وہ پہلے ہی تھا۔ ایک مرتبہ اس کے پاس نے اسے سخت ست الفاظ کہے لیکن وہ خاموش رہا۔ ماتھے پر ایک شکن بھی نہ آئی۔

اس کے دفتر کے ساتھی اسے اللہ میاں کی گائے کہنے لگے اور وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ وہ کرائے کے گھر میں رہتا تھا۔ اس کے گھر کے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کو اس نے سنور بنا رکھا تھا اور دوسرا کمرہ بطور بیڈ روم استعمال کرتا تھا۔ بیڈ روم کے ساتھ ہی کچن تھا جو انتہائی گندا اور میلّا تھا۔

زندگی اسی ڈگر پر چل رہی تھی۔ کبھی کبھار اسے محسوس ہوتا تھا کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا ہے۔

جب تک اماں زندہ رہیں، ان کی شدید خواہش رہی کہ وہ اس کی دلہن لے آئیں لیکن ہر بار وہ انکار کرتا رہا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ وہ بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہ کر بیٹھے۔

لیکن اب وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر میں سلیقہ ہونا چاہیے لیکن وہ کس سے شادی کرے اور اتنی قلیل تنخواہ میں وہ ضروریات زندگی کیسے پوری کرے گا کیونکہ اس تنخواہ میں بمشکل گھر کا کرایہ ادا ہوتا۔ باقی پیسے بل ادا کرنے میں صرف ہو جاتے۔

ایک روز ناسازئی طبیعت کی وجہ سے وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔

گھر پہنچنے ہی اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف تھا کہ اچانک آنے والے طوفان سے گھبرا گیا۔ وہ چولہا بند کر کے بالکونی کی طرف بھاگا جہاں اس نے کل شام کپڑے دھو کر لٹکاے تھے۔

کپڑے سیٹ کر الماری میں رکھے اور دوبارہ کچن کی طرف لوٹ آیا لیکن ڈور بیل کی آواز پر چونک گیا۔ بھاگم بھاگم دروازے پر پہنچا۔ وہ کچھ حیران بھی تھا کہ اس قدر شدید طوفان میں کون ہو سکتا ہے؟

وہ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر دروازے پر اجنبی خاتون کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”وہ..... دراصل..... میں“ لڑکی گھبرا رہی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ بھی تھوڑا سا گھبرا گیا۔

”جی میرا نام فائزہ ہے۔ میں یہاں نچلے فلیٹ میں اپنی دوست سے ملنے آئی تھی لیکن وہاں تالا لگا ہوا ہے۔ باہر بہت طوفان ہے۔ کیا مجھے تھوڑی دیر

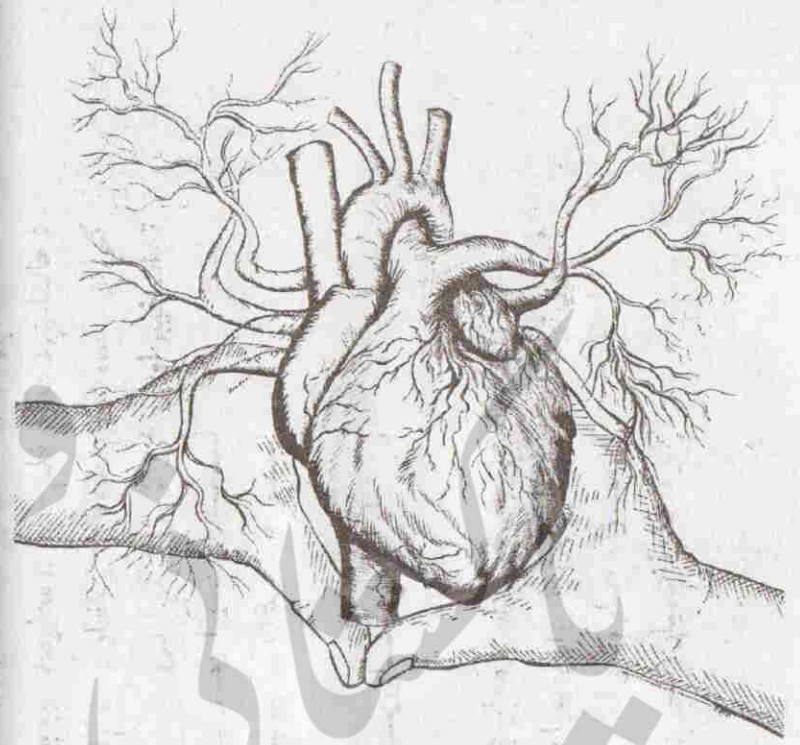
میں کنجوس ہوتا ہے لیکن دل کے معاملے میں بڑا حاتم طائی ہوتا ہے۔ اب حاتم طائی کو لے لیں۔ اس کی سخاوت مشہور ہے لیکن کسی واقعہ میں اس کے دل کا ذکر نہیں ملتا حالانکہ حاتم طائی بڑا دل والا تھا۔ اس نے اپنا دل کسے دیا؟ اس کا آج تک راز فاش نہ ہو سکا۔ بہر حال بھی کسی محقق یا مورخ کا دل چاہا تو وہ ہی اس مجید سے پردہ اٹھائے گا۔

ڈاکٹر زونڈے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ انسان دل کے بغیر نہیں جی سکتا مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس نظریے کے پرچار اور سائنسی حقیقت کے ماننے کے باوجود یہ لوگ اپنا دل دے دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر دل لینے اور دل دینے کے منجھے ہوئے مشتاق کھلاڑی ہوتے ہیں۔ جب تک انہیں کوئی دل نہ دے..... وہ اپنے دل کی وابستگی کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اپنا دل دینے کے بعد کئی کئی دن، ہفتوں، مہینوں، سالوں بغیر دل کے گزرا کرتے ہیں۔

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح ہر شام سورج مغرب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اسی طرح دل بھی انسان کو زندگی میں ایک بار اقتاد میں ضرور مبتلا کر دیتا ہے۔ بعض لوگ تو سال کے تین سو پینسٹھ دن اس موذی مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں اور لاعلاج قرار پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مہلک بیماری کا شکار ہو کر نہ صرف دل سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بلکہ کبھی کبھار جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اسی لیے تو دانا کہتے ہیں کہ دل کا قابو میں رکھنا چاہیے نا کہ دل کے قابو میں آ جانا چاہیے۔ یہ بھی عجب افسوس ہے کہ انسان ضعیف العمر ہو جاتا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکا دیتا ہے لیکن اس کا دل سدا بہار رہتا ہے جس پر وقت کی خزاں نہیں چھاتی۔ جب بھی انسان آئینہ دیکھتا ہے تو مر جھکا جاتا ہے ایسے میں دل اسے بڑی تقویت بخشتا ہے اور دھیرے دھیرے کہتا

تعب تو یہ ہے کہ دل ہر وقت زیر استعمال رہتا ہے پھر بھی ہمیشہ قابل استعمال رہتا ہے۔ کجخت نہ ذرا سا گھٹتا ہے، نہ خراب ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی چول ڈھیلی پڑتی ہے اور تو اور..... بالکل ترو تازہ، ہشاش بشاش اور جوان رہتا ہے۔ جس قدر زیر استعمال رہتا ہے اسی قدر تندرسرست و توانا رہتا ہے۔ جتنا مصروف عمل رہتا ہے اتنا ہی مسکراتا اور خوش و خرم رہتا ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ ہر جوان کو بالآخر بوڑھا ہونا ہے لیکن یہ دل ہے جو سدا جوان رہتا ہے۔ خواہ جسم بوڑھا ہو جائے، عقل ٹخنوں سے تلواروں میں اتر جائے مگر دل ہے جو گھڑی کی سوئیوں کی طرح ٹک ٹک کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب روح نفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تب بھی دل کئی منٹ تک زندہ سلامت رہتا ہے اور اپنی ابدیت کا الارم بجاتا رہتا ہے۔

حیرت تو یوں بھی ہے کہ دل چوبیس گھنٹے اور بارہ مہینے زیر گفتگو رہتا ہے۔ اگرچہ تلوں مزاج انسانوں کا دل اب تک اس موضوع سے نہ صرف بھر جانا چاہیے تھا بلکہ آگتا جاٹا چاہیے تھا کیونکہ چار دن وال کھلافتو انسان کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے مگر اس موضوع پر سسپینس نکال دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور بدن میں جان آ جاتی ہے۔ وہ دل کے ذکر پر دیدہ و دل واکر دیتا ہے۔ اس کی حالت میں یکجخت تغیر آ جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ہر عمر، ہر نوع اور ہر جنس کے لیے دلچسپی کا محرک ہے۔ جوان تو جوان..... بچے اور بوڑھے بھی اس کی زد میں رہتے ہیں کیونکہ یہ ہر انسان کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔ ہر ذی روح ایک عدد دل کا مالک ہے۔ یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ اس نے انسان کو ایک ہی دل سے نوازا ہے اگر خدا نخواستہ دو یا دو سے زیادہ ہوتے تو نجانے کیا ہوتا.....؟؟؟؟ حد تو یہ ہے کہ کنجوس ہر چیز



عارف صبح خان

دل ہے کہ مانتا نہیں.....

بوڑھا ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد کسی دل تھام لیتے ہیں اور دل کی تسبیح پڑھنے لگتے ہیں مگر دل بے اختیار ہے۔ جتنا مٹاؤ اتنا بگڑتا ہے، جتنا سمجھاؤ اتنا کڑتا ہے۔ سچ سچ دل بڑا خاتم ہے۔ بے ایمان ہے۔ بے قابو ہے۔ کیا کیجئے..... دل ہے کہ مانتا نہیں!!

انسانی جسم کے اہم ترین عضو ”دل“ کے بارے میں دلچسپ ”انکشافات“

کثرت اور رغبت و محبت سے کیا جاتا ہے جیسے دنیا ”دل“ پر قائم و دائم ہے۔ مانا کہ دل زندگی کا ضامن ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دل زندگی کی کائنات پر چھا جائے اور اعصاب پر یوں مسلط ہو جائے کہ ہر شے ”دلبر“ نظر آنے لگے۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ دل کا تذکرہ اتنی فیاضی سے کیوں ہوتا ہے؟ جبکہ دیگر جسمانی اعضاء مثلاً پیچھے پڑے، گردے، معدہ، جگر، تلی وغیرہ کے ساتھ سوتیلیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے حالانکہ ان کی افادیت کہیں زیادہ مسلم ہے۔ پھر دل کا تذکرہ اس

ہے..... ابھی تو میں جوان ہوں! اور انسان اس تال پر ٹھکر اٹھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دل کے ہاتھوں ہر بشر پریشان ہے۔ یہ انسان کو نچلا نہیں بیٹھے دیتا۔ دل کے ہاتھوں انسان حماقتیں کرتا ہے۔ نتیجتاً خسارے، دکھ اور شرمندگی اٹھاتا ہے۔ جب کوئی بوڑھا کہیں دل لگا بیٹھے وہ بھی اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے..... تو جواب میں عموماً بڑھاپا خراب اور بزرگی خوار ہوتی ہے یا جب کوئی شادی شدہ یہ احمقانہ حرکت کر بیٹھے اور بیوی کو بھول کر کہیں اور دل لگانے کی کوشش کرے تو پول کھلنے پر جہاں لڑکی کے گھر والوں کے ہاتھوں درگت بنتی ہے اور ذلت ملتی ہے وہاں اکثر معاملہ اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایسے دل لگانے والوں کو اپنی معصوم بیوی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں کیونکہ بے وفائی کا بدلہ وفادار بیویاں جدائی کی صورت میں دیتی ہیں۔ تب دل کو بے قابو رکھنے کا انجام بھیانک نکلتا ہے پھر دل ہی تسمخرانہ انداز میں کہتا ہے..... دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا! جب عقل کا دامن چھوٹتا ہے تو دل کے ہاتھوں حماقتوں کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ دل انسان کو نئی نئی الجھنوں میں الجھا دیتا ہے۔ کبھی ہنساتا ہے کبھی زلاتا ہے اور کبھی تو مری طرح کھیانا کر دیتا ہے۔

یہ دل ہے جو ایک ہنگامہ بپا رکھتا ہے۔ غریب انسان اس کے اشاروں پر کٹ چلی بن کرنا چتا ہے، سچ تو یہ بھی ہے کہ اگر انسان کے سینے میں دل نہ ہوتا تو وہ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ دل نے انسان کی دنیا میں کھلبلی اور تہلکہ مچا رکھا ہے اور اسے کسی طور نچلا نہیں بیٹھتے دیتا..... اور کبھی تو دل کی لہزش سے زلزلہ آ جاتا ہے اور جب یہ زلزلہ سینہ کی سرزمین سے گزر جاتا ہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا

سوائے کھنڈرات کے۔

دل کی باتیں عجیب اور انہونی ہوتی ہیں۔ دل جب چلتا ہے تو جتنا سنبھلاوتا ہی بگڑتا ہے۔ دل کا اختیار تو صرف عقل والوں کو ہے ورنہ دل کا کہا ماننے والے تو وہ کچھ کر بیٹھتے ہیں جس کی توقع ایک پاگل سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ دل ہی ہے جو ایک لنگور کو چور کی خواہش پر اکساتا ہے..... اکثر ایسے بیوقوف بھی ہوتے ہیں جو اپنی صورت شکل اور حیثیت دیکھے بغیر کسی پری داد کی تمنا میں مرغ بگل کی طرح تڑپتے ہیں۔ کئی کالوں کو دیکھا ہے جو چاند چہرے کی آرزو میں مرتے ہیں اور کچھ بیچارے ایسے بھی ہیں جو خود اپنی صورت دیکھ کر ڈر جاتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ نکاح کے دو بول کسی حسن و جمال کے پیکر کے ساتھ پڑھوائیں۔ پھر کوئی سچ کہہ دے تو برا مان جاتے ہیں۔

بہر حال اگر دل نہ ہوتا تو کہانیاں وجود میں نہ آتیں۔ یہ کارخانہ حیات دل کے کارن ہی رنگین ہے کیونکہ اس میں سرنخی بہت سے دلوں کا خون ہونے سے پھیلی ہے۔ دل نہ ہوتا تو شاعری بھی نہ ہوتی..... شاعری میں حسن و عشق کی چاشنی دل کی بدولت ہے کیونکہ ہر شاعر کا دل حسین ہوتا ہے اور وہ دل پر چوٹ کھائے ہوتا ہے۔ یہ دل ہی ہے کہ جس کی وجہ سے آئے روز نئی نئی، رنگ برنگی، چٹ پٹی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ اگر دل نہ ہوتا تو کائنات سونی ہوتی مگر اشرف المخلوقات معجزہ خیز یوں سے محفوظ و مامون رہتی۔

ویسے کبھی دل پر ٹوٹ کر شدت سے پیار آتا ہے کہ دل ہے تو سب کچھ ہے اور کبھی کبھی دل پر بہت رشک آتا ہے کہ کہنے کو تو یہ گوشت کا ٹکڑا ہے جس میں دریدوں، شریانوں اور خون جھیری چیزیں بھری پڑی ہیں۔ دیکھنے میں خاصا نامعقول

”مجبوری“

باپ بیٹی سے: پہلے تم مجھے پاپا کہتی تھی اب ڈیڈی کیوں کہتی ہو؟
بیٹی: ڈیڈی! ”پاپا کہنے سے میری لپ سنک خراب ہو جاتی ہے۔“

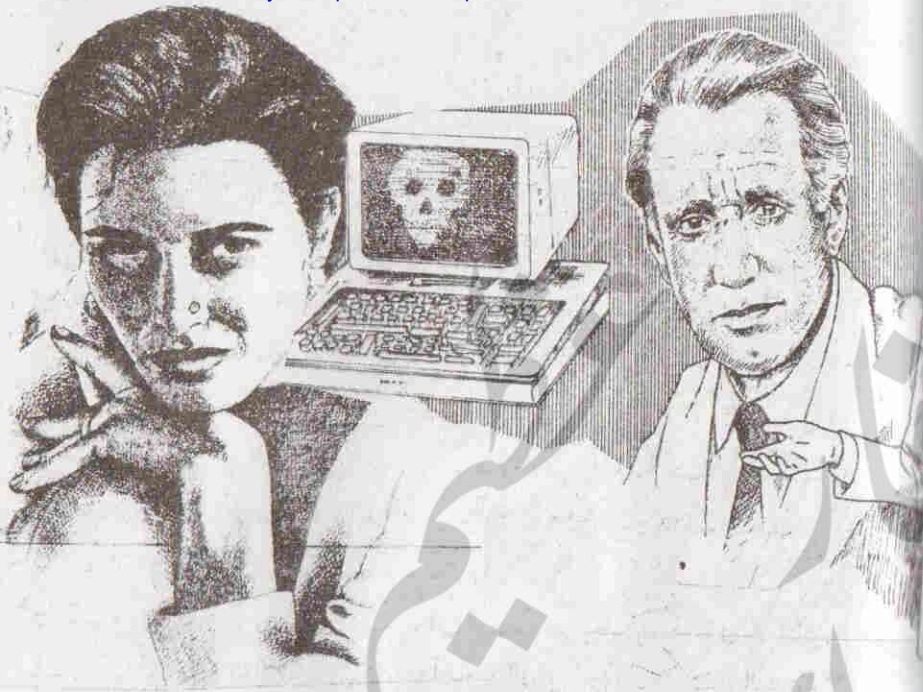
اور بد ہیئت نظر آتا ہے لیکن ہر دل والا دل کا متوالا ہے حتیٰ کہ دل جلے بھی دل کے کن گاتے ہیں۔ کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے کہ دل کو دل میں چھپالیں کیونکہ یہ ہے تو زندگی کا چراغ روشن ہے۔ دل ہے تو دل لگی بھی ہے۔ دل ہی سے احساس کا جذبہ ہے۔ اور دل ہے تو جذبات کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ یہ بلا مبالغہ شوق اور ولولوں کو جگاتا ہے۔ آرزوؤں اور خواہشوں کے پیچھے اڑاتا ہے۔ خزاں میں بہاروں کو بلاتا ہے اور اپنی ”محبت“ پر پیار کی ایسی بارش کرتا ہے جو ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی ہے۔ ایک بار دل میں محبت کا رنگ جم جائے تو پھر کبھی شیریں فرہاد، ہیر رانجھا جیسی داستانیں دل کی کہانیاں سناتے لگتی ہیں حالانکہ دل ہے کیا خانہ خراب..... محض گوشت کا ایک ٹوٹھڑا..... ہونہ! ذرا سادہ باؤ تو ہمیں بول جائے بلکہ دم نکل جائے مگر اس دل پر ہی بڑا امان اور تکبر ہوتا ہے اس دل کی ہی بڑی تنہا ہوتی ہے۔

اگرچہ انسان کے جسم میں دل کے علاوہ اور بھی کئی کارآمد عضو ہیں لیکن اولاد آدم کو صرف دل سے عشق ہے۔ بنی نوع انسان کی نا انسانی دیکھئے..... کبھی ان پر نگاہ غلط انداز ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ غلط خدا کو دل سے اتنی عقیدت و محبت ہے کہ اس سے کبھی

بھول چوک نہیں ہوتی کہ غلطی سے یہ کہہ دے کہ ”جان! تم میرا پیچھے رہا ہو۔“
وہ میرا معذہ ہے۔
میں اس کا گروہ ہوں۔
بیلو ڈارلنگ تلی!!! تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔

ڈیڈی لیلے! میرا بھی کچھ یہی حال ہے!
میری محبوبہ نے میرے جگر میں جگہ بنائی ہے اور اپنا پتہ مجھے دے دیا ہے۔
اے حسینہ!! تم مجھے اپنی آنت کی طرح عزیز ہو۔
اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میری شریانوں میں درد ہونے لگا۔
میری جان بیچا..... تم کھوپڑی کی طرح خوبصورت ہو۔

ایک دن میں ضرور تمہارا خون فتح کر لوں گا۔
میری رگوں میں ہر وقت تمہاری محبت دوڑتی ہے۔
جی نہیں..... ہمیشہ اس کے منہ سے ”دل“ کا کلمہ ہی بلند ہو گا۔ انتہائی کرب اور مصروفیت کے عالم میں بھی وہ دل ہی پکارے گا۔ چاہے تکلیف ناگوں میں ہو یا غشوں میں ہو، خواہ کمر میں ہو یا کندھوں میں مگر لگتا ہے جیسے سارا درد دست کر دل کی چہار دیواری میں مقید ہو جاتا ہے اور انسان ہائے دل ہائے دل کی گردان شروع کر دیتا ہے۔ بوڑھا ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد کبھی دل تمام لیتے ہیں اور دل کی تسخیر کرنے لگتے ہیں مگر دل بے اختیار ہے۔ جتنا مناؤ اتنا بگڑتا ہے، جتنا سمجھاؤ اتنا اکڑتا ہے۔ سچ سچ دل بڑا خالم ہے۔ بے ایمان ہے۔ بے قابو ہے۔ کیا کیجئے..... دل ہے کہ مانتا نہیں!!



سليم بشير

ایک تھی ماں

کچھ دیر بکوتر ادھر سے ادھر کی پیغام رسانی میں مصروف رہے پھر حسب معمول، دھیرے دھیرے دنگوڑ بند ہونے کا وقت آ گیا۔ شہزادے کو ناستہ بنانے کے بعد دو دن کے جمع شدہ برتن دھونا تھے۔ مٹی کی کاس شروع ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے اور بڑی شہزادی کا آٹس کا بریک ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

ایک عورت کی کہنا، جس کی زندگی ایک ”جادوئی“ ڈبے میں سم کر رہ گئی تھی

تار خوشی سے جھنجھٹا اٹھتے تھے اور وہ خود کو ہوا میں تیرتا محسوس کرتی تھی۔

بارہ کا گزرنے جانے پر ان دنوں کے گھر بھاگنے کا منظر بھی ایک سا ہوتا تھا۔ سنڈریلا، پارتی کے مہمانوں کو حیرت زدہ چھوڑ، اپنی شیشے کی سینڈل سنبھال، اپنی خوبصورت بھی میں جلدی جلدی جا

ابھی رات کے صرف دس ہی بجے تھے کہ ملکہ کی طبیعت میں بے چینی شروع ہو گئی۔ سنڈریلا کی طرح وہ بھی رات بارہ بجے سے پہلے ہر قیمت پر اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ یہی وقت تھا اس کے دل کی مراد برآئے کا، اس کی اور اس کے محبوب کی ملاقات کا یہی سے تھا۔ جب اس کے دل کے

رحم آگیا اور وہ تیز تیز ڈرائیو کرتی گھر روانہ ہو گئی۔ تیسری منزل پر واقع اپنے گھر کی سیڑھیاں پھلانگتے پھلانگتے اس کا سانس پھول گیا مگر اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ان سے ملنے میں اب چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔ چابی گھما کر دروازے کو زور سے کھولنا ہی چاہتی تھی کہ یکدم اس کے ہاتھ ٹک گئے۔ اس کا خیال آگیا جو اندر موجود تھا، جو اس کی تاک میں رہتا تھا، اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کا خون جگر پی پی کر موٹا تازہ ہو چکا تھا، درندہ بن کر پورے گھر میں دندناتا پھرتا تھا۔

”ہیلو!“ ملکہ نے جیسی آواز میں سرگوشی کی اور اپنے بھائیوں کو بھانپ کر گھڑے گھر کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

”آگسٹس سیر سانا کر کے؟“ سنانا ایک سربل خاوند کی طرح جینے چھاڑنے، دھاڑنے لگا۔ گھر کی دیواریں یکبارگی زور سے لرزیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ وہ پہلو بجا کر اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ وہ بھی ساتھ ہی اندر گھس آیا اور اسے کپڑے بدلنے دیکھنے لگا۔ ملکہ نے اس شو شو کر کے بھگانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس سے مس نہ ہوا۔ ”مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟“ وہ زور زور سے طنز یہ قہقہے لگانے لگا اور اچانک اپنے نوکیلے پنجے اس کی روح میں گاڑ دیے۔

”تم کہیں دغا نہیں ہو سکتے؟“ ملکہ نے جھلا کر ٹی وی آن کر دیا۔ سنانے کو کانٹے کے لیے وہ اکثر یہی کیا کرتی تھی مگر حسب معمول ٹی وی بھی اس کے سامنے کوئی ٹنگا بن کر بیٹھ گیا اور ماحول ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

”میرے ساتھ ہی گزرا کرنا سیکھو۔“ درندہ کچھ ڈھیلا بڑتا ہوا غرا ہوا۔

ٹھیک بارہ بجے اس نے اپنا جادو کا ڈب آن کیا اور شارٹ کا بین دبا دیا۔ ”LOGIN نام

تو مند گھوڑوں کی شکل میں تبدیل ہو جانے والے اس کے دوست مریل جو ہے، اسے گھر پہنچانے کو سر پٹ دوڑنے لگ جاتے۔ ان دونوں کے گھر پہنچنے کے بعد کے حالات میں توڑا بہت فرق البتہ ضرور تھا۔

سنڈریلا کے گھر بہت سے بے مہرشتہ دار اس کا انتظار کر رہے ہوتے جبکہ ملکہ کے گھر اس کا محض ایک ہی تعلق دار اس کا استقبال کرتا ملتا۔ ملکہ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے کی کوشش کرتی۔ کوئی دعوت، سنگی ساتھیوں کی کوئی بیٹھک، رشتہ داروں کی کوئی تقریب، کوئی نہ کوئی جگہ اسے بہر حال مل جاتی اور وہ یوں اپنے گھر میں تنہا شامیں گزارنے کے آزار سے بچ جاتی۔ اس کے سب دوستوں کو پتہ تھا کہ وہ رات بارہ بجے کے بعد رکا نہیں کرتی مگر وہ اس بات کا برانہ ماننے کے بجائے ہنس کے نظر انداز کر دیتے کیونکہ وہ اس کی وجہ سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

سنڈریلا کی طرح اس کی بھی مخصوص گھر بن جانے پر جون بدل جایا کرتی۔ وہ حسین و جمیل، متمول شہزادی سے دوبارہ ایک مفلوک الحال یتیم لڑکی میں تبدیل ہو جاتی اور ملکہ ایک خوش باش ہنسی مسکراتی، پر اعتماد، اپنی ذات میں مکمل شخصیت سے ایک کمزور اور اُداس عورت کی شکل اختیار کر لیتی۔ سنڈریلا آنے والے وقت کی شہزادی تھی اور اس ملکہ کا راج باٹ مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ جو اس کے کچھ لگتے تھے انہوں نے بن باس لے لیا تھا اور درمیان میں بحرطالت حائل ہو چکا تھا۔

اس نے وقت دیکھا۔ ابھی اس کے گھر پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ تقریب جاری تھی مگر اسے اٹھنا ہی تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب کو خدا حافظ کہا اور باہر سردی میں ٹھنڈی ہوئی اپنی ہزاری سی پاور کی پرانے ماڈل کی بھی کو سٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھما دی۔ چند لمحوں کی لمحوں کے بعد انجن کو

بتائیے۔“ حکم ملا۔

”گزر رہا ہوا کل۔“ اس نے جواب دیا۔

موسیقی کی ایک مدھر لے کے ساتھ ہی راج مول کی طرف جانے والی بندرگاہ ایک سمندر میں تبدیل ہو گئی اور لکڑی کا ایک موٹا سا تہا بہتا ہوا اس کی طرف آگیا۔

”ENTER“ ہونے کے لیے اسم اعظم؟“

سوال کر گیا۔

”نہیں اپنا خفیہ اسم نہیں بتا دیا۔“ بخت“

”کنٹیکٹ کروایا جائے۔“ آؤن ملنے ہی برقی تاروں کا جال ادھر سے ادھر اُچھل اُچھل کر چھٹکنا مارنے لگا۔ ملکہ اشتیاق سے جادو کے ڈبے کی سکرین کو کھنکھنے لگی جہاں اسے کچھ ہی دیر بعد ان سے ہمکلام ہونا نصیب ہونا تھا۔

راج محل کی سر زمین بھی عجیب تھی۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور آسمان پر تارے عکسبوت کا سا تہا ہوا جال۔ ملکہ کو آگے سفر کرنے کے لیے اسی سمندر پر Surf کرنا تھا۔ وہ Log کو مضبوطی سے تھامے اعتماد سے آگے بڑھنے لگی۔ تار عکسبوت کے سفید ریشمی ریشوں پر چھوٹی رکاوشیں پھلانگتی، وہ جلد ہی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کتنا پر اسرار تھا یہ راستہ! کتنی پر بچ خسی یہ وادی! کتنی دنیا میں نہیں راہ میں آباد اور کتنا گھنا تھا قوتوں کے درختوں کا پر اسرار جنگل۔ YAHOO ایک بندر ٹھہنیوں پر ادھر سے ادھر چھلانگ مارتا چیتا۔

”کس سائٹ پر جانا ہے؟“ اگلے دربان نے وضاحت طلب کی۔

”مگر ماگرم..... لیجئے، مگر گرم“ ایک ڈاکے نے وصال و فراق کے جذباتوں میں سگتی ڈاک کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے آواز لگائی۔

”طلمس ہو شر با سے دل بہلائیے گا؟“

”تازہ ترین اخبارات، رسائل؟“

”ابھی لوگوں سے دل کی باتیں، گپ شپ؟“ ریزہیوں پر مختلف قسم کا سامان سجائے ریڑھی والے اپنی اپنی بولیاں بولتے اس کی جانب آئے اور پھر غائب ہوتے چلے گئے۔

”مجھے تو صرف MSN کے دروازے کی انٹری چاہیے اور کچھ نہیں۔“ ملکہ نے حسب معمول اپنی سادہ سی خواہش کا اظہار کیا۔ MSN کے نمائندہ دو بیت چمک کر اپنی موجودگی کا سگنل دینے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی وہ ان دونوں بتوں کو ایک میں تبدیل کر دے گی تمام پتھریلی راہیں ہموار ہو جائیں گی اور وہ اپنے تینوں شاہ زاروں سے ہم کلام ہو سکے گی۔ پہلی سٹی سے ہی پہلی وڈو کھل گئی۔ ”امی آپ کیسی ہیں؟“ ڈبے کی ساکت سطح پر ایک پرمسرت چیخ ابھری اور ساری سکرین پر چھا گئی۔

”جی میری جان!“ ملکہ کی اگلیوں نے جلدی جلدی جواب دیا اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ دور ایس میں اس وقت دن کے دو بجے ہیں۔ بڑی شاہ زادوں کے آفس میں یہی بریک ٹائم تھا لہذا وہ اسی وقت ماں سے بات کیا کرتی تھی۔ وڈو میں محصور بڑی شہزادی نے سہانوں کی REPUNZEL ری پنزل شہزادی کی طرح اپنے لالچے سنہرے بال کھڑکی سے نیچے لٹکا دیئے۔ ری پنزل کا محبوب شہزادہ تو ان بالوں پر جھول کر اوپر آ جایا کرتا تھا مگر بڑی کی محبوب ماں ان بالوں کی نرمی کو چھو نہ سکتی تھی۔ بس وہ انہیں دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ جاتی۔

”نن!“ سے چھٹی کی کھٹی بجی۔ اعلان ہوا ولی عہد شہزادہ آن لائن تشریف لا رہے ہیں۔

”السلام علیکم امی۔“ بڑے شہزادے نے کپور چھوڑا۔

”اُٹھ گئے بیٹا؟“ اس نے پیار سے اپنے بیٹے کو پچکارا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ٹائٹ ڈیوٹی سے آنے کے بعد اسی وقت سو کر اٹھا ہوگا۔

”جی آج بہت نیند آرہی تھی، شفٹ کچھ لمبی ہو گئی تھی۔“

”ہائے صدقے جاؤں کچھ کھایا تو نہیں ہو گا۔“

ماں کے کلیجے میں ٹیس اٹھی۔

”نہیں ابھی ناشتہ بناؤں گا میں نے کہا پہلے آپ سے بات کر لوں ورنہ آپ پریشان ہوں گی۔“

سات سمندر پار کی ورکنگ کلاس کے ایک نمائندہ شخص نے جواب دیا۔ ملکہ کا دل کٹ کے رہ گیا۔

کاش میں اس کے پاس ہوتی۔ اس کو ناشتہ بنا کر دیتی۔ اس کے گھر میں صفائی کر دیتی۔

”ای جی مجھ سے بھی بات کریں نا۔“ تیسری ونڈو میں کھڑی ننھی شہزادی نے ضد کرنا شروع کر دی۔ وہ کب سے اپنی باری کی منتظر تھی۔

”میری لاڈو رانی، میری شہزادی تیرے صدقے جاؤں کیا کر رہی ہے تو؟“ انگلیوں نے بے چینی سے متوالا قفس شروع کر دیا۔

”کلاس میں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے نا مجھے ہاسٹل کا ہاتھ روم شیئر کرنا پڑتا ہے اس لیے شاور کا بھی مزہ نہیں آتا۔“

منی شہزادی نازوں کی پٹی تھی مگر اپنی یونیورسٹی میں اب ایک عام سٹوڈنٹ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھی

”اور پھر ہاتھ روم میں لوٹا بھی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پھولوں کو پانی دینے والا ایک فوارہ رکھا ہوا ہے۔ چپکے

سے ہاتھ روم میں لے جاتی ہوں۔ ایک دن میری روم میٹ کہنے لگی، ہم نے تو ہاتھ روم میں کوئی پلانٹ نہیں دیکھے تو پھر تم کیوں یہ وائر لکین لے کر جا رہی ہو؟“

منی شہزادی کا یہ جملہ سنتے ہی دوسری ونڈو میں موجود اس کے دونوں بھائی بہن زور زور سے ہنسنے لگے

اور سائنک چہرے بنا بنا کر سکرین پر پھول کھلا دیئے۔ ملکہ بھی محفوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ شریر کہیں کے، اسے

تینوں پر لکھت پیارا آ گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ یہ بھول

گئی کہ وہ اس سے اتنی دور تھے۔ اسے بالکل ایسا لگا جیسے وہ اس کے آنگر۔ من لگے امرود کے پرانے درخت تلے

آپس میں کھیل رہے ہوں، لڑ بھگڑ رہے ہوں، دور دیس کی کسی آدم منڈی میں کھسے ہوتے کی کمین نہ ہوں۔

”میری بچی! باہر برف گر رہی ہو گی۔ سنو شوڑ اور دستانے پہنے بغیر باہر نہ نکلنا۔ سردی میں احتیاط

کرنا۔“ اس نے ننھی شہزادی کو تنبیہ کی۔

”ہاں آپ کے ہاتھ کا لپکا ہوا پراٹھا بہت یاد آ رہا ہے۔“ شہزادے نے حسرت بھرا پیغام بھیجا۔ ملکہ کے دل

پر کٹاری لگی مگر وہ خاموش رہی۔ وہ کبھی کیا سکتی تھی۔ لٹی ہوئی راجدھانی کی ملکہ کی زندگی کی بساط تو کب کی انٹ

چک تھی۔ اس کی کوکھ جسے شاہ زاد، اپنا اپنا نعیم کھوجنے سات سمندر پار کوہ کنی میں مصروف تھے۔ وہ پیچھے رہ گئی

تھی مگر پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی بھی تو احساس تنہائی کا بوجھ اسے اس قدر

پریشان کر دیتا کہ اسے لگتا وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھے گی۔ اسی لیے اس نے جاو کے ڈبے کو اپنا راز دان بنا لیا تھا۔

ہر رات اپنے بچوں سے chat کرتی اور یوں ایک کے بعد ایک دن گزارنے میں کامیاب ہو جاتی۔

کچھ دیر کیوٹر ادھر سے ادھر کی پیغام رسانی میں مصروف رہے پھر حسب معمول، دھیرے دھیرے

ونڈو بند ہونے کا وقت آ گیا۔ شہزادے کو ناشتہ بنانے کے بعد دو دن کے جمع شدہ برتن دھونا تھے۔

منی کی کلاس شروع ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے اور بڑی شہزادی کا آفس کا بریک ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

اچھی شب ملنے کا وعدہ کر کے انہوں نے اپنے کواڑ بند کر لیے اور اپنی اپنی زندگیوں میں واپس لوٹ گئے۔

ملکہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ سکرین جو ابھی کچھ ہی دیر پہلے زندہ اور متحرک تھی، ٹھنڈی اور بے جان ہو گئی۔ کہاں گئے وہ! ابھی تو یہیں تھے۔ مادر ملکہ نے

اپنے بچوں کے گرم لمس کو محسوس کرنے کے لیے

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بورت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

اجزاء:

- انڈے: 3 عدد
شملہ مرغ: 2 عدد
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں): 3 عدد
مٹر (اُبلے ہوئے): 1 کپ
پیاز (آلیٹ کی طرح): 1 عدد
آلو: 2 عدد

(تحریر: صائمہ عمران)
جی جناب! بقرہ عید پر تو آپ خوب گوشت کی مزیدار ڈشز سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ بقرہ عید کے بعد پورا مہینہ گوشت سے بنی ڈشز ہی دسترخوان پر نظر آتی ہیں۔ ایسے میں روز روز انسان یکسانیت سے بور ہو جاتا ہے۔ تب ہی دل کرتا ہے چٹ پٹی اور مزیدار ڈشز کھانے کو۔ اسی لیے ہم نے سوچا کیوں نہ آپ کو ہم گوشت سے ہٹ کر علیحدہ سے کچھ سادہ مگر چٹ پٹی ڈشز بنانا سکھائیں۔ گوشت سے کھانے کی لذت تو بڑھتی ہے لیکن اگر سبزی یا دال بھی دل سے اور پوری محنت سے بنائی جائے تو اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

Egg with Vegetable

نئے چمک کر رہ گئے تھے جو کبھی اس کے کیسٹ پلیئر سے نکل کر اسے خوش کیا کرتے تھے۔ اس کے کمپیوٹر سے آنے والی ٹک ٹک کی مسلسل آواز، ٹیلیفون کے ریسپونڈر سے باہر پھل آنے والے، اس کی سہیلیوں کے قہقہے سب کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟ وہ سوچنے لگی جب چیزیں وہاں پر نہیں رہتیں جہاں وہ ہوتی ہیں تو پھر کہاں چلی جاتی ہیں؟

سارا دن گھر میں خاموشی کی اداس دھند چھائی رہتی جس سے بچنے کے لیے ملکہ دن بھر باہر رہتی۔ درود یوار ایک دوسرے سے لپٹے اس کی آمد کا انتظار کرتے اور اس کا سگنی ساتھی سارے گھر پر راج کرتا۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ اسے آج کی رات شٹ ڈاؤن کرنا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر گھمائی۔ اس کا شریک حیات اس کے چاروں طرف موجود اسے چپ چاپ بیکٹا چلا جاتا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے اس کی طرف دیکھا..... ہوں..... تو ویسے اتنا برا بھی نہیں اس کا وجود۔ ملکہ نے ایک سوچ کو نکال کیا۔ سنائے کی ایک اپنی اہمیت اور ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ سناتا نہ ہو تو ”بگ بینگ“ کے بعد کائناتیں وجود میں نہ آتیں۔ تخلیق کا سلسلہ آگے نہ چلے۔ تخلیق کا کنٹرول جب سکوت کے تالاب میں کھلتا ہے تو زیادہ دلچسپ اور خوشبودار ہوتا ہے۔ سنڈریلا گزرے ہوئے کل کی خیالی شہزادی تھی جبکہ ملکہ آج کی حقیقی عورت۔

یکدم ملکہ کی ساری افسردگی delete ہونے لگی اور اس نے مکمل سپردگی کے ساتھ اپنا وجود اپنے شریک حیات کے حوالے کر دیا۔ کتنا نرم و ملائم پیارا اور ہمدرد تھا وہ۔ اسے بے اختیار اس پر پیار آنے لگا۔ اب وہ اسے اپنا دشمن نہیں بلکہ ایسا مخلص دوست محسوس ہو رہا تھا جس کی اپنائیت بھری گود میں تحفظ ہی تحفظ ہوتا ہے۔

سکریں پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا اور اس زندگی بخش حرارت کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ تین ستارے کچھ ہی دیر پہلے ایک دیران تاریک آسمان پر چمکے تھے اور اسے منور کر دیا تھا مگر اب آسمان اکیلا تھا۔ میل ہامیل ٹیک گہرائیوں سے اونچائیوں تک تجا اور سناں۔

جدائیاں اس کی زندگی میں بار بار آتی رہیں تاہم وہ ان سے محبت نہ کر سکتی تھی۔ راج پاٹ الٹ جانے کے بعد سب سے پہلے بڑا شہزادہ اس سے علیحدہ ہوا تھا۔ فلائٹ کی رات جب وہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں چھپ چھپا کر رو رہی تھی تو وہ اسے ڈھونڈتا ہوا آ نکلا اور اس سے بے اختیار لپٹ گیا۔

اس کے جانے کے چند سال بعد بڑی شہزادی کو ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور اس نے بھی اپنا رخت ستر باندھ لیا۔ فلائٹ کی رات وہ ہنس ہنس کر ماں اور چھوٹی سے باتیں کرتی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد غسل خانے جا کر رتنے کوئی رہی۔ منہی شہزادی اور ملکہ نے کئی سال اکٹھے گزارے۔ دونوں نے سہیلیاں بن کر رہنا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خوشیوں کے باغ سے پھول چنتیں، تیلیوں سے کھیتیں، درختوں کے سائے تلے جا لیٹتیں، کھانے کھاتیں، ٹی وی دیکھتیں، موج اڑاتیں۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی کہ ایک دن چھوٹی کا بھی دور ویس کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا اور وہ برف ڈھکے ایک شہر کے سفر کو روانہ ہو گئی۔

مادر ملکہ کی کوکھ سے درودہ کی آخر پھر اٹھی اور اسے بے بس کر گئی۔ منہی کے جانے کے بعد اسے پہلی بار سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہو جانے کا احساس ہوا۔ اب اس کے پاس اپنی ذات کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ منہی شہزادی کے گھرے میں جا پہنچا کھڑے اس کے بالوں کے کلب، ریز، بیڈ، سکرز، پوسرز، شیش، سلفڈ stuffed کھلونے، اس کی جدائی سے ٹھہال نظر آتے تھے۔ دیواروں سے وہ



اجزاء:

پرائز:	200 گرام
لہسن پسا ہوا:	ایک چائے کا چمچ
اورک پسا ہوا:	ایک چائے کا چمچ
دوسٹر شائر ساس:	ایک کھانے کا چمچ
اویسٹر ساس:	ایک کھانے کا چمچ
چلی گارلک ساس:	دو کھانے کے چمچ
لٹائو کچپ:	دو کھانے کے چمچ
شملہ مرچ:	ایک عدد
گا جڑ:	ایک عدد
ہری پیاز:	دو عدد
ثابت لال مرچ:	چھ سے آٹھ عدد



لہسن: چار یا پانچ جوئے
 نمک: ایک چائے کا چمچ یا حسب ذائقہ
 چینی: ایک چائے کا چمچ
 لیموں کا رس: ایک لیموں کا
 پودینے کے پتے: آٹھ سے دس
 کوکونٹ ملک پاؤڈر: دو کھانے کے چمچ

ترکیب: مچھلی کے علاوہ سب اجزاء کو بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں اور پختی بنا لیں۔ اس میں مچھلی کو میرینٹ کر لیں اور کم از کم 30 منٹ تک فریج میں رکھ دیں۔ اب فوائل پیپر کی شیٹ بنا لیں۔ مچھلی کے ایک ایک پیسے کو الگ الگ فوائل پیپر میں لپیٹ کر پیک کر لیں۔ ایک نان سٹیک چین (Pan) کو گرم کر لیں۔ تیل میں آئل نہیں ڈالنا۔ اب اس میں مچھلی کے بیک شدہ پیسے رکھ دیں۔ اس کو ڈھک دیں تاکہ سٹیم سے مچھلی پک جائے۔ 10 منٹ کے بعد اس کا رخ بدل دیں اور دوسری سائیڈ کو بھی 10 منٹ تک پکے دیں۔ اس کے بعد پیک شدہ پیسے نکال کر کھول لیں اور سردنگ ڈش میں ڈال دیں۔ فریج فرائز کے ساتھ پیش کریں۔



شیزوان پرائز

SCHEZWAN PRAWNS



نمک:	حسب ذائقہ
کالی مرچ:	حسب ذائقہ
لال مرچ:	ڈیڑھ چائے کا چمچ
ہری مرچ:	باریک کٹی ہوئی
کریم:	ایک چائے کا چمچ
تیل:	2 کھانے کے چمچ
	1/2 پیالی

ترکیب: آلو ابال کر باریک کاٹ لیں (زیادہ نرم نہ ہونے پائیں) ایک چین میں تیل گرم کر لیں۔ اس میں آلو ڈال کر گولڈن ہونے تک فرائی کر لیں۔ اب آئل اور کریم کے علاوہ تمام اجزاء ڈال کر ہلکی آگ پر پکائیں۔ جب ٹماٹر گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو بھون لیں۔ اب کریم ڈال کر کس کر لیں۔ اوپر سے انڈے توڑ کر ڈال دیں اور ڈسکن رکھ کر دم دے دیں۔ پرائزوں کے ساتھ کھائیں۔ یہ ڈش بہت مزہ دے گی۔



مصالحہ دال چنا

اجزاء:

دال چنا:	1/2 کلو
پیاز (پیٹ بنا لیں):	1 عدد
انار دانا:	2 1/2 چمچ

(دھو کر کھار کر گرائنڈ کر لیں)

ہلدی:	ایک چائے کا چمچ
اورک لہسن کا پیٹ:	2 چائے کے چمچ
دار چینی:	ایک ٹکڑا
لال مرچ پاؤڈر:	ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی:	4 کھانے کے چمچ

(اس وقت استعمال کریں جب دال بالکل گل جائے)

ترکیب: دال ابال لیں جب گلنے لگے تو

کوکونٹ فش

اجزاء:

مچھلی کا گوشت:	500 گرام
(گوشت کو نمک اور لیموں لگا کر کم از کم 5 منٹ کے لیے رکھیں اور پانی سے دھو لیں۔)	
ہرا دھنیا:	ایک کپ
ہری مرچ:	چار یا پانچ عدد



بزم شاعری

وہاں دشمن بھی جلتے ہیں، خدا سے اور کیا مانگیں
حضور ﷺ پاک کی نظر کرم سے کوہساروں کے
بڑے پتھر پھٹتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
جہاں پہ ایڑیاں رگڑیں تھی اسماعیل پیاسے نے
وہاں زم زم نکلتا ہے خدا سے اور کیا مانگیں
نبی ﷺ کے نور کی بس اک جھلک کے واسطے شاہ جی
کروڑوں دل چمکتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
(سید شیر احمد شاہ، فیصل آباد)

نعت رسول مقبول ﷺ

حبیب خدا آقا بطحا کے والی
لئے آیا ہوں در پہ میں جھولی خالی
تخی ہو، عطا عشق جامی سا مجھ کو
علم بھی علیٰ جیسا ذوق غزائی
نہیں تم ہو یوسف، حبیب خدا ہو
سنا بھی مثالی، تخی بھی مثالی
تیرے در سے بھر بھر کے ہر روز جھولی
لئے جا رہے ہیں کروڑوں سوالی
سدا رہے سرسبز و شاداب میرا وطن اور
رہے سر بلند اپنا پرچم ہلائی
مرا شوق لکھنے کا تازہ تو ہے پر
عطا ہو مجھے در سے سوز ہلائی
(شوق خانوائی، خانوائی)

عکس زینت

سرخرو ہو کر نکلتے ہیں زندگی کے امتحانوں سے
جو خالق سے حق بندگی نبھاتے ہیں
آسان ہو جاتی ہے ایقان و یقین کی منزلیں

حمد

تبی دامن و تہی دست و گناہ گار ہوں مولا
خطا کار و سیاہ کار ہوں، اشک بار ہوں مولا
تیری نعمتیں بے حساب ہیں، بے شمار ہیں عنایتیں
میں نہ کر سکا تیرا حق اداء شرم سار ہوں مولا
ہیں اس قدر تیری رحمتیں نہیں جن کی کوئی بھی انتہا
تیرے در سے لوٹوں نہ خالی ہاتھ خواستگار ہوں مولا
تو ہے بے نیاز و مستغنی ہر شے پہ ہے تیری دسترس
سیدھی راہ پہ رکھنا مجھے سدا، طلبگار ہوں مولا
یہ بحر و بر ہیں تجھی تیرے، کل جہاں ہے تیرا کردار
ہے تیری قدرت پر محیط، میں عاجز و لاچار ہوں مولا
میری بار بار ہے التجا، مجھے اپنے گھر تو پھر سے بلا
مدت سے ہے یہ طلب میری، مدت سے ہے تیرا ہوں مولا
یہ سوچو یوچھ، عقل و فہم عطا ہے سب ٹیری کبریا
میرے پاس جو بھی ہے سب تیرا، میں تیرا شاہکار ہوں مولا
(محمد عبداللہ عاظم، منٹا کینٹ)

نعت رسول مقبول ﷺ

نبی ﷺ کے در کے ملتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
وہ ہم سے پیار کرتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
ہر خواہش تو پوری ہو گئی نقد سکوں میں
خزانے اب اچھلتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
جو مکہ بوند بھر پانی کو ترستا تھا مگر اب تو
وہاں چشمے اُبلتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
کہ جن راہوں پہ کانٹے دین کے دشمن بچھاتے تھے
وہاں غنچے نکلتے ہیں خدا سے اور کیا مانگیں
جہاں نور ہدایت کے دیے دن رات جلتے ہیں

پر آرزو تیار ہیں۔

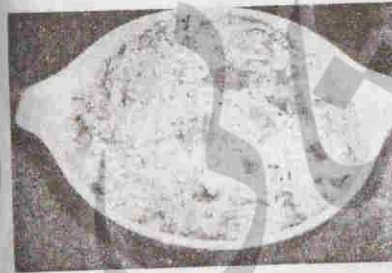
☆☆☆

(تخریر: فاطمہ قیوم)



گارلک فرانڈ رائس

Garlic Fried Rice



اجزاء:

چاول اُبلے ہوئے: آدھا کلو
لہسن: 10 جوئے
سفید زیرہ: 1 چھوٹا چمچ
دھنیا: 1 پیالی
ہری مرچ کٹی ہوئی: 8 عدد
نمک: حسب ضرورت
ایک ڈلی کھن

توکیب: کھن میں لہسن، سفید زیرہ، ہری
مرچ، نمک، ہرا دھنیا ڈال کر تھوڑا سا کائیں اور پھر
چاول ڈال کر کس کریں۔ اوپر سے تھوڑا کھن اور ڈال
کر دم کر دیں۔

مچھلی کا قورمہ

Fish Quorma

اجزاء:

فیش: 1 1/2 کلو
لہسن اور ک: 2 ٹیبل سپون
لال مرچ: حسب ذائقہ
کالی مرچ پیسی ہوئی: 1 چھوٹا چمچ
گرم مصالحہ: 1 چھوٹا چمچ
دہی: ایک پیالی
ہری مرچ: 4 سے 5 عدد
نمک: حسب ضرورت
سفید زیرہ: آدھا چمچ
سوکھی میتھی: 1/2 چمچ
کالی مرچ ثابت: 8 سے 10 عدد
بڑی الائچی: 2 عدد
لوہگ: 4 سے 5 عدد
میتھی دانہ: 1 چمچ
کڑی پتہ، دار چینی: چند عدد

توکیب: تین میں 3 بڑے چمچ آئل، دار
چینی، کڑی پتہ، لاٹک، دہی پھینٹ کر ڈالیں۔ لہسن

سزا خود اپنے لیے ہی شدید کر لی ہے
اسے بھلانے کی کوشش میں یاد کر کر کے
خود اپنی زیت ہی مشکل مزید کر لی ہے
حسین ابن علیؑ کی طرف ہی لوٹیں گے
جنہوں نے بیعت فکر یزید کر لی ہے
عطائے میر ہے مجھ پر، کہ میں نے بھی روشن
غزل کی شمع بطرز جدید کر لی ہے
چچا ہے اب کہیں جا کر نسیم جامہ زیت
کہیں کہیں سے جو قطع و برید کر لی ہے
(نسیم سحر)

غزل

تنہائیوں سے دل کو ہم نے لگایا
سکون پھر بھی نہ زندگی میں ہم نے پایا
دور رہ کے بھی خیالوں میں کوئی
دل کے قریب کسی نے پھر دیا جلایا
گن گن کے دن گزارے تھے ہم نے
آنے والا پھر بھی لوٹ کے نہ آیا
گرم سرد ہواؤں میں بسیرا ہے اپنا
سراخ زندگی کا کسی نے نہیں پایا
جاوید کسی نے طعنہ دیا ہے تجھے
وہ اپنا نہیں پھر بھی نکلا پرایا
(محمد اسلم جاوید، فیصل آباد)

انقلاب

طلوع انقلاب بلاخیزست مشرق دیکھ
گھیر رہا ہے سب قرب و جوار
وقت کا فرعون مر رہا ہے مصر کے بازاروں میں
تاج و تخت کس طرح رسوا ہے
مظلوموں کی آہ و بکا کا اثر دیکھ

غزل

حد نگاہ تک ہے جو منظر دھواں دھواں
شاید ہوا ہے جل کے کوئی گھر دھواں دھواں
بجھنے کے بعد شمع کا عالم عجیب ہے
رخ پر نمی نمی سی ہے سر پر دھواں دھواں
کہتے ہیں جس کو کہہ کوئی اور شے نہیں
شبنم ہے آفتاب سے جل کر دھواں دھواں
کیا جانے کیسی خوشہ گندم کی آگ تھی
پھیلا ہوا ہے آج بھی گھر گھر دھواں دھواں
دو رخ ہیں بادلوں کے بھی تصویر کی طرح
اندھ سے آب آب ہیں، باہر دھواں دھواں
آتش فشاں پہاڑ کی زندہ مثال ہے
ہوتا ہے دل کی آگ سے پھر دھواں دھواں
پچھتائے آسمان کی طرف اڑ کے ہم امتیاز
ہر شے دکھائی دی ہے زمیں پر دھواں دھواں
(ایس امتیاز احمد، کراچی)

غزل

جو یاد یار سے گفت و شنید کر لی ہے
تو گویا پھول سے خوشبو کشید کر لی ہے
جدائیوں میں بھی ڈھونڈی ہیں قربتیں میں نے
ضرر رساں تھی جو شے وہ مفید کر لی ہے
نہیں کھلے تھے جو منظر مری بصارت پر
تصورات میں ان کی بھی دید کر لی ہے
ستارے ٹانگ دیئے ہیں فلک کے دامن پر
اور اپنی چادر شب بے نوید کر لی ہے
میں چاہتا تو اسے کچھ قریب لے آتا
مسرتوں کی جو ساعت بعید کر لی ہے
اسے تو دکھ ہی نہیں کچھ مری جدائی کا!

اب یہاں کوئی کسی کو صدا نہ دے
شہر اجاڑ ڈالے گلیاں جلا ڈالیں
کسی کو بھی خدا ایسا راہنما نہ دے
کیا ہو گا اب میرے چارہ گر کو خبر کرو
ہجوم عاشقان ہے کوئی کسی کو راہ نہ دے
میں اہل دل کے ساتھ رویا بربادی چن پر
پھر کیوں مجھے اب ہر کوئی سزا نہ دے
جو غم مجھے ملا ہے اس شہر پرسان میں
ایسا دکھ کسی کو بھی خدا نہ دے
جلد گھر پہنچو ایسا نہ ہو کہیں
بھوک پھر تھک کر بچوں کو سلا نہ دے
(وسیم اختر، راولپنڈی)

غزل

جس کی برسات الٹی ہوئی پاگل ہوا
ساتھ اپنے لے گئی سب گھیر کر بادل ہوا
مہکی مہکی دے رہا ہے آپ کا آئین ہوا
ایک شاعر کو کہیں یہ کر نہ دے پاگل ہوا
دیراں دیراں چہرے کے سب رنگ پتھیکے پڑ گئے
جب چرا کر لے گئی تھی آنکھ سے کاجل ہوا
ادھ کھلے دروازے سے یوں دیکھ کر چھپ جاتے ہو
چھیڑ کر زلفوں کو جیسے ہوتی ہے اوچھل ہوا
ہر کوئی مادہ پرستی میں پھر گلے تک جنس گیا
خشک کر سکتی نہیں اب حرص کی دلدل ہوا
میرے کانوں میں تمہارے دل کی ساری داستان
چپکے چپکے کہہ رہی تھی خاموشی سے گل ہوا
پاسداری ختم ہو جاتی ہے ہر قانون کی
بھیج دیتے ہیں کبھی جو شہر میں جنگل ہوا
(سید ریاض گیلانی، فیصل آباد)

ہر سانس کملی والے کی محبت میں بتاتے ہیں
خسارے میں رہتا ہے نفس امارہ کا غلام
میں دینا میں لوگ کئے کی سزا پاتے ہیں
ماتھے پہ خشونت آنکھوں میں شرارت بستی ہے
سادہ لوح بندے مصنوعی مسکراہٹوں سے دھوکا کھاتے ہیں
طاغوت کے پھکنڈوں کا خوف نہیں سچائی کے پرستاروں کو
وہ ظلم و جبر سے زندگی کی نمونہ پاتے ہیں
یقیناً دکھ پہنچتا ہے انسانیت کے ہی خواہوں کو
ظالم و جابر جب خدا کے بندوں کو ستاتے ہیں
لے ڈوبتا ہے انجام کار طاقت کا گھمنڈا فرعونوں کو
عدل کا کوڑا برستا ہے تو پھر آنسو بہاتے ہیں
(قاضی محمد یوسف، مظہر)

غزل

شمار ہوتا ہے ان کا دیوانوں میں
ڈوبے رہتے ہیں جو میرے افسانوں میں
جو دیکھو تو چند ادراک بکھرے ہیں
جو پڑھ لو تو گئے جاؤ فرزانوں میں
بچوں کو سلائی ہیں بستی کی مائیں
خالی ہنڈیا اور جھوٹے بہانوں میں
شہر والوں کو چاہت ہے دولت کی
لگے ہیں جالے دل کے مکاتوں میں
حسن والوں نے بڑی نزاکت سے بدر
دل رکھے ہیں سجا کے دکانوں میں
(سید بدر سعید، لاہور)

غزل

تیز ہوا چلی ہے ہوشیار رہنا
جنا چراغ کہیں یہ بجھا نہ دے
ہزاروں پر لگے ہیں ساعتوں پر

خاموشی وقت کی آواز سن

گر گوش ہوش نباش ہے

آگے بڑھ بزدل راہنماؤں سے پیچہ آزما ہوجا

یہ وزدان کر کے درکن دارند چراغ

حق نہ مانگ، چھین لے بڑھ کر

دو روز مانہ چال قیامت کی چل گیا

آواز دو انقلاب انقلاب

قریب قریب کو بہ کو

(ظفر کاٹھیری، سیالکوٹ)

غزل

چاندنی صحن میں اترتی ہے

کتنے لہوؤں میں رنگ بھرتی ہے

میں نے دیکھے ہوئے ہیں وہ لمبے

خامشی جب کلام کرتی ہے

کہنے والے سمجھ نہیں سکتے

سننے والوں پہ جو گزرتی ہے

میری امید کا یہ عالم ہے

ڈوبتی ہے کبھی ابھرتی ہے

کون ہے جس کو یاد کر کے کنول

روح میں تازگی اترتی ہے

(یاسمین کنول، پرورد)

دریا

چشموں سے جب نکل کے بہتا ہے

کوہساروں میں ڈھل کے بہتا ہے

باتیں کرتا ہوا چٹانوں سے

کھائیوں سے کہیں کسانوں سے

واپس میں اترتا ہے ایسے

شیر، کوئی گزرتا ہو جیسے

پھر یہ میدان میں نکلتا ہے

اپنے تیور کئی بدلتا ہے

ہے بھنور میں کہیں چھلک میں کہیں

سائے سائے کہیں چمک میں کہیں

کھیتوں تک نکل کے نہروں سے

گاؤں سے پہنچ جائے شہروں سے

لہلہاتی ہیں فصلیں پانی سے

ابر گرہیں تری روانی سے

جا کے ملتا ہے تنہا ساگر میں

زندگی جھومتی ہے ساغر میں

(ظفر علی تنہا، ملتان)

غزل

زرد پتے جھڑنے لگے شجر سے آگیا موسم خزاں

پگھلٹیاں پگھٹ سب لگنے لگے ہیں ویراں

دل اپنا بھی کھنڈر ہو گیا ہے جانے کیوں

ہر بات احساسات پر لگنے لگی ہے بہت گراں

پھنڈر کے مجھ سے کشن سے رغبت نہ رہی تجھ کو

کبھی کبھی تمہاری بات یہ کر جاتی ہے پشیمان

قلب سوزاں کو جتلانے عذاب کرنا اچھا نہیں

مانند موسم گل رہے گا صدف اپنا آشیاں

(نسیم سیکند صدف، ڈسکہ)

غزل

کسی بھی بشر کو نہ ہر گز ستاؤ

محبت سے سب کو، گلے سے لگاؤ

جہالت کی باتوں سے خود کو بچاؤ

فراسط سے دنیا کو اپنا بناؤ

کبھی بھی دلوں میں کدورت نہ لاؤ

تقصیب سے آپ اپنا دامن بچاؤ

غزل

وہاں پر کس طرح نہ دوستو ڈینگلی بخار آئے
جہاں پر موڈی گھمراہ کائنات کو بار بار آئے
وہاں ہیضہ کے ہونے پر نہیں حیرانگی کوئی
جہاں پر کھانے پہ مکھی قطار اندر قطار آئے
نشر سب کہیں یہ لوڈ شیڈنگ چند روزہ ہے
پر وعدوں کے ڈس لوگوں کو کیسے اعتبار آئے
گزشتہ رات میں نے یہ انوکھا خواب دیکھا ہے
ہمارے حکمران اس دیس کا قرضہ اتار آئے
جہاں افلاس ہو چاروں طرف ننگے بدن رقصاں
وہاں پر کس طرح لوگوں کے چروں پر نکھار آئے
خدائے لم یزل پھر کھل انھیں امید کی کلیاں
خزاؤں کے ستارے اس جن میں پھر بہار آئے
فرشتے داد دینے کو یقیناً دوڑے آئیں گے
قرم زندگی اپنی جہنم میں گزار آئے
(ریاض حسین قمر، جہلم)

نہ دنیا کی الفت کو دل میں بساؤ
لگاؤ تو لو بس، خدا سے لگاؤ
زمانے کے ہاتھوں سے جو ہیں پریشاں
انہیں عزم و ہمت کی راہیں دکھاؤ
مصائب کو سہتا ہی مردانگی ہے
بہادر بنو، لب پہ آئیں نہ لاؤ
جو واقف نہیں، رمز صدق و وفا سے
حکایت انہیں کربلا کی سناؤ
عداوت سے معمور نفرت کدوں میں
خلوص و محبت کی شخصیں جلاؤ
جو مظلوم ہیں، مفلس و ناتواں ہیں
سدا ان کے دکھ درد میں کام آؤ
اندھیروں کو ہو اپنی ظلمت سے نفرت
چراغ محبت کچھ ایسے جلاؤ
یہ پیغام معنی ہے، سب دوستوں کو
جہاں بھی رہو، خوش رہو، مسکراؤ
(ایس۔ معنی حیدر۔ کراچی)



16 دسمبر..... زخم جو بھلایا نہیں جا سکتا

رانا محمد شاہد

کیا ان 90 ہزار سپاہیوں کے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو دشمن کے خون سے اپنے ملک میں لگی آگ بجھانے کے ارادے لے کر آئے تھے۔ ہر محبت وطن شخص ان سپاہیوں کے جذبات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ وہ تو حکم کے غلام تھے ”جتھیار پیچیک دو، پھیک دیئے۔ جتھیار اٹھا لو، اٹھا لے۔“

ملکی تاریخ کا سیاہ ترین دن، اس زخم کی ششیں تاعمر باقی رہیں گی

حاصل کی تھی اور دوسرے دن اسی ہندو دشمن کی فوج، جو اپنے ناپاک عزائم کے ساتھ اس وطن کی سالمیت کی طرف بڑھی تھی، اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن..... 16 دسمبر آتا ہے اور دے پاؤں گزر جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثریت کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس دن کیا خاص واقعہ رونما ہوا تھا۔ جو جانتے ہیں کہ اس دن ہم نے کیا کھیا تھا، وہ اپنے سوئے ضمیر کو مزید سلا دیں گے یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند

14 اگست اور 6 ستمبر کو ہم پاکستانی بحریہ پر خوشیاں مناتے ہیں۔ گھروں اور بازاروں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر آزادی اور فوج کے دفاعی کردار پر پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ خصوصی غذا کرے منعقد کئے جاتے ہیں اور خصوصی نئے ہماری ساعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ ہم کیوں خوشیاں نہ منائیں کہ ایک دن ہم نے اپنے انگریزوں اور ازلی دشمن ہندو سامراج سے آزادی

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرا کا تعارف بصری طور پر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ پر کر کے سیارہ ذابجست: 244 میں مارکیٹ ریو از گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوین برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

تعلیمی قابلیت:

پسندیدہ شاعر:

پسندیدہ غزل/نظم:

تاریخ پیدائش/ہجرت:

شادی شدہ/غیر شادی شدہ:

پتہ:

ای میل:

ہماری تاریخ یوں منحنی نہ ہوتی۔ اگر ہمارے ارباب اختیار عظمت کردار کے حامل ہوتے تو یہ سب نہ ہوتا اور اگر وہ اتنے ہی عظیم ہوتے، اتنے ہی چوکس، ہوشیار اور دوراندیش ہوتے تو یقیناً آستین کے ان سائپوں کو پکڑ لیتے جن کی سازشوں نے پاکستان تقسیم کر دیا۔

آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنی زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس سے زیادہ ضرورت اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لیے تو بہت زیادہ قربانیاں دیں لیکن پھر ہم تن آسائشی کا شکار ہو گئے۔ حوصلہ اور جذبہ مفقود ہو گیا۔ آزادی برقرار رکھنے کے لیے جس لہو کی ضرورت تھی وہ لہو زمین، جاسید اور نفسانی خواہشات کی خاطر بہایا جانے لگا اور یوں آزادی کی وہ نعمت جسے حاصل کرنے کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے جان، مال اور عزت و آبرو کی قربانی دی تھی وہ ہماری آرام پرستی اور عیش و عشرت دیکھ کر ہم سے ناراض ہو گئی اور اس نے 16 دسمبر کو ہم سے اس ناراضگی کا بدلہ لے لیا۔

کیا ان 90 ہزار سپاہیوں کے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو دشمن کے خون سے اپنے ملک میں لگی آگ بجھانے کے ارادے لے کر آئے تھے۔ ہر محب وطن شخص ان سپاہیوں کے جذبات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ وہ تو حکم کے غلام تھے ”ہتھیار پھینک دو، پھینک دیے۔ ہتھیار اٹھاؤ، اٹھا لیے۔“ ہاں 16 دسمبر کے اصل ”ہیر“ تو ہمارے حکمران اور جرنیل تھے۔ عام سپاہی تو محض ایک فلم میں ایکسٹرا کے کردار کی مانند تھے جن کی اہمیت ہمیشہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ وہ سپاہی جن کا ایمان بنا دیا جاتا ہے کہ ہتھیار کو خود سے جدا نہیں کرنا، وطن کی حفاظت جان سے زیادہ ضروری ہے اور پھر جب اس سپاہی کو ”ہتھیار پھینک دو“ کا حکم ملتا ہے تو کیا آپ اس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اس لمحے کس کرب سے گزر رہا ہے کہ جب

کرنے کا ڈرامہ کریں گے۔ ہاں مگر کچھ لوگ ہوں گے جو اپنی روح پر لگے اس زخم کو نہ بھلا پائیں گے۔ ہمارے اسلاف کے کارنامے تو کچھ اور ہی کہتے تھے، قوموں کی تاریخ لہو سے رقم ہوتی ہے۔ ان کے فیصلے قلم سے لکھے جاتے ہیں اور تلوار سے نافذ ہوتے ہیں مگر جب وہی قومیں عیش و عشرت کی دلدراہ ہو جائیں تو ان کے اندر انتشار پیدا کرنا، انہیں آسائش پرست بنانا انتہائی آسان ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شعر میں بڑے پتے کی بات کہی تھی:

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
لیکن کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
قوموں کی اساس نظریات پر ہوتی ہے اور جب نظریات غیروں سے لیے جائیں تو کیا قوم اور کیسی قومیت؟ ہم جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تو تن من و دھن قربان کر دیتے ہیں مگر نظریاتی محاذ اکٹھ برسوں سے خالی چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا یہ محاذ انتہائی کمزور ہے اور اس کمزوری کا نتیجہ ہے کہ دشمن ہمارے اس محاذ پر بہت تیز اور تلخ حملہ کرتا ہے اور ہم اس پر توجہ نہیں دیتے یا دیتا نہیں چاہتے۔

ہم اس لمحے کو بھی سمجھ نہ پائے کہ جب اغیار نے ہمارے درمیان آ کر دو بازوؤں کو ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا اور ہم تب بھی سمجھ نہ پائے جب جسم ہی نہیں قلب و جان کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے گئے اور ہم نے غیروں اور مکالموں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ”آج ہم نے نظریہ پاکستان، بحیرہ عرب میں غرق کر دیا ہے۔“

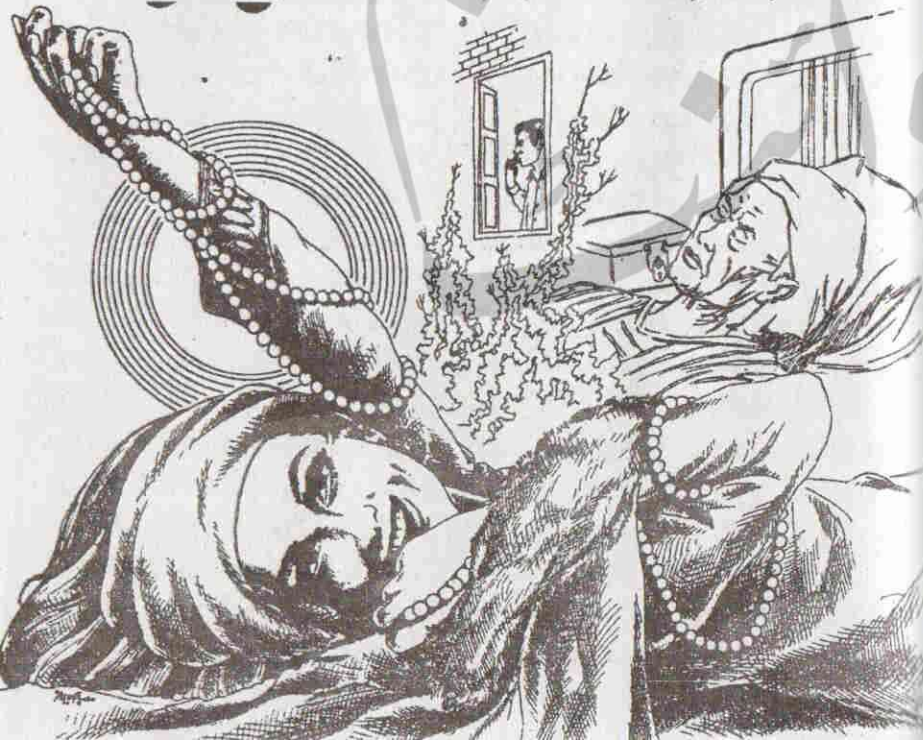
ہم کھیل کو جنگ اور جنگ کو کھیل سمجھ بیٹھے۔ اگر ہم اپنے مشاہیر کے کردار و عظمت کو سامنے رکھتے، بابائے قوم کے فرمودات پر عمل کرتے اور ہم جان جاتے کہ کہاں قوت لگانی ہے، نظریاتی اور سرحدی محاذ پر کیسے کام کرنا ہے، اگر ہم اپنے فرض کو جان لیتے اور عیش و عشرت میں نہ پڑتے تو شاید 16 دسمبر کو صدیوں کی سزائے ملتی اور

خورشید خان اب اس سوچ میں تھا کہ وہ کس انداز میں نرگس کے پاس جائے۔ اس نے ملازمت ایک ماہ قبل چھوڑ دی تھی اور اس گفتگو کی مشق کر رہا تھا جو اس نے نرگس کے سامنے جا کر کرنی تھی۔ اس معاملہ میں اس کا کوئی راز دار تو تھا نہیں اس لیے وہ آئینے کو سامنے رکھ کر مشق کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب ہوگا۔

ایک شاطر کی داستان، اس نے اپنے تئیں نکال سانس تیار کی تھی

خورشید خان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ پھر بھی ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ مردانہ حسن و جمال میں بھی وہ ثانی نہ رکھتا تھا۔ جب وہ جوان تھا تو لڑکیاں اس کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں مگر جوانی میں ہی وہ بُری صحبت میں پڑ گیا اور اس کا شمار نامی گرامی بدمعاشوں میں ہونے لگا۔ جرائم کی دنیا میں وہ اپنی ایک بیچان رکھتا تھا۔ کون سا برا کام

خورشید خان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ پھر بھی ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ مردانہ حسن و جمال میں بھی وہ ثانی نہ رکھتا تھا۔ جب وہ جوان تھا تو لڑکیاں اس کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں مگر جوانی میں ہی وہ بُری صحبت میں پڑ گیا اور اس کا شمار نامی گرامی بدمعاشوں میں ہونے لگا۔ جرائم کی دنیا میں وہ اپنی ایک بیچان رکھتا تھا۔ کون سا برا کام



ہے۔ بھارت اور امریکہ بہت دفعہ ایسے نقشہ جات جاری کر چکے ہیں جس میں بلوچستان کو پاکستان کا حصہ نہیں دکھایا گیا۔ ظاہر ہے اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے وہ عملی طور پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

سوات و شمالی علاقہ جات کی صورتحال ہم سب کے سامنے ہے۔ سیاستدان اس قسم کی باتیں کرتے نہیں تھکتے جن سے تعصب کی فو آئے۔ ”سندھ کے وزیراعظم کو پھانسی دے دی گئی اور پنجاب کے وزیراعظم کو بیرون ملک بھیج دیا گیا۔ یہ سب کیا ہے؟“

آگ تعصب کی لگا کر ہم سب اب کھڑے سوچتے ہیں بجائیں کیسے

وہ پاکستان جو وہ تو فی نظریے کے ذریعے حاصل کیا گیا اور جس کے لیے لاکھوں انسانوں نے جان و مال کی قربانیاں دیں اور تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی

وہ پاکستان جس کی بنیاد ہی امن، بھائی چارہ، محبت، اخوت اور جدوجہد پر رکھی گئی تھی آج ہم نے اپنے ہاتھوں سے اسی پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں تو کیا اس

تعصب و فرقہ وارانہ و گروہی مسائل کے بعد 1971ء کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو ورنہ

شاید بابائے قوم کی روح ہمیں کبھی معاف نہ کرے۔ اگر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان پیار و محبت، چاہت اور بے غرضی کا سمندر

بہتا رہتا تو پھر دنیا کے سات سمندر مل کر بھی ان دونوں بھائیوں کو جدا نہیں کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ

ایسا نہ ہو سکا۔ کیا اب ایسا ممکن ہے کہ چاروں بھائی مل کر محبت و چاہت کا دریا بن جائیں جو زمینوں کے

ساتھ ساتھ دلوں کو بھی سیراب کر دے۔ کاش کہ آج ہم پیار و محبت کی وہ تصویر بن جائیں جس پر ایک

زمانہ رشک کرے اور ہمارے کان کوئی ایسی خبر نہ سنیں کہ جس سے ہمیں 16 دسمبر کی فو آئے۔

اسے اپنے ہی ہتھیار دشمن کے حوالے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایک تجربہ نگار نے لکھا کہ وہ جب ڈھاکہ

انٹریورٹ سے شہر کی طرف جا رہے تھے تو اس کے میزبان نے ایک مخصوص جگہ رُک کر 1971ء کا ایک

واقعہ سنایا۔ واقعہ یوں تھا کہ جب ہمارے جرنیلوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو مذکورہ مقام پر پاکستانی

سپاہیوں کی ایک کمپنی موجود تھی۔ جب اس کمپنی کے جوانوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم ملا تو اس کے سارے جوان

اپنی رائفلیں لے کر آئے سامنے آکھڑے ہوئے اور ”پاکستان زندہ باد اور اللہ اکبر“ کے نعرے لگاتے ہوئے

ایک دوسرے پر گولیاں چلا کر شہید ہو گئے۔ کیا تاریخ سپاہی کی اس بے بسی پر آنسو نہیں بہاتی؟ کیا صدیوں

سے اٹھی گردن ایک بار پھر جھکنے پر مجبور نہیں ہو جاتی؟ ہاں اس دن فتح و نصرت کا پرچم بھی سرنگوں ہو گیا۔

کیا ہم یہ جان سکتے ہیں کہ آخر 16 دسمبر کے دن کس نے اپنے مفاد کو قوم کے لبو سے برتر سمجھا؟

کس نے اس لبو سے غداری کی جو پاکستان کی سالمیت و بقا کے لیے بہایا گیا تھا۔ کس نے اقتدار کی

کرسی کی خاطر پاکستان کے دو ٹکڑے کر دئیے؟ 16 دسمبر آتا ہے اور خاموشی سے گزر جاتا ہے اور

ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم نے کیا کھو دیا ہے؟ پورے اور مکمل پاکستان کو 25 سال کی زندگی بھی نہ ملی۔

کیا اسی پاکستان کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ہمیں 64 سالہ جشن منانے کا حق پہنچتا ہے۔ ملازمت

اور شرمندگی کا وہ رُخ جو ہمیں 16 دسمبر کو ملا، شاید وہ کبھی نہ بھر سکے۔ پھر اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی ہم کس

تندر خوش ہیں کہ ہم آزاد اور خود مختار قوم ہیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھائی تو ہم 1971ء سے پہلے بھی تھے۔ اس وقت ہم دو بھائی تھے اور آج چار بھائی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج ہم

ہوتا۔ وہ جوا خانے چلاتا تھا۔ اپنے بندوں سے وہ چوری چکاری بھی کرا لیتا۔ اسے حرام حلال اور اچھے بُرے کی تمیز ہی نہ تھی۔ وہ ایسے فضول کاموں میں اپنی زندگی برباد کر رہا تھا۔ اس کا ضمیر مر چکا تھا۔ مگر ایک دن جب اس کا اپنا دامن جلنے لگا اور آگ اس کے گھر تک پہنچی تو اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ کسی نے اس کی بہن پر بُری نظر ڈالی تھی۔ کسی نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا۔ اس روز وہ بہت روئی تھی۔ خورشید خان اس سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا اور جب اس نے بھائی کو رونے کی وجہ بتائی تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ مگر بہن نے اسے غیرت دلائی کہ ”تم خود بھی تو ایسے ہی ہو۔ تو پھر غصہ کس بات کا۔ تم بھی لوگوں کی بہنوں اور بیٹیوں کو ایسی ہی نظر سے دیکھتے ہو۔“

بھائی..... چھوڑ دو ایسے کاموں کو جن میں سراسر گھائے کا سودا ہو۔ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ سانبان ہوتے ہیں مگر میں کس پر مان کروں..... ایک بد معاش پر..... ایک شرابی پر۔ ایک جواہر پر۔“

اس روز خورشید خان نے قسم کھائی اور عہد کیا کہ وہ تمام بُرے کام چھوڑ دے گا اور اپنی آئندہ زندگی شرافت سے گزارے گا۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں اور دوستوں کو فراموش کر دیا۔ اس نے بہن کی شادی کر دی اور پھر وہ شہر ہی چھوڑ دیا..... اور ایک چھوٹے سے قصبے میں آکر ملازمت کر لی۔ کچھ ماہ اس نے موٹرول کی ایک ورکشاپ میں کام کیا اور پھر وہاں سے ملازمت چھوڑ کر ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم ہو گیا..... اس مل میں تین شخصیں چلتی تھیں۔ تیسری شفٹ رات گیارہ بجے شروع ہوتی تھی۔ خورشید خان کی ڈیوٹی تیسری شفٹ میں لگائی گئی تھی..... وہ جس محلہ میں رہتا تھا وہاں سے وہ پیدل

عورت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے دن میں بھی حویلی کے کئی چکر لگائے مگر دن کے وقت اسے وہاں کوئی بھی انسان نظر نہ آیا۔ گلتا تھا اس حویلی میں زندگی صرف رات کو ہی رواں دواں ہوتی ہے اور دیا صرف ایک مخصوص کھڑکی میں صرف رات کو ہی جلتا ہے۔

ایک روز اس نے فیکٹری میں کام کرنے والے ایک ساتھی سے اس حویلی کے بارے میں پوچھا..... تو وہ اسے بتانے لگا۔

”سنا ہے وہاں کوئی پاگل عورت رہتی ہے جو 20 سال سے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ کوئی جڑیل ہے اور اس نے حویلی میں رہنے والوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا ہے اس لیے ہم تو اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتے کیونکہ شام ہوتے ہی حویلی میں تاریکی اور سناٹا چھا جاتا ہے اور سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں ایک دیا روشن ہو جاتا ہے۔ آندھی آئے، طوفان آئے یا بارش ہو، سردی ہو یا گرمی ہو وہاں دیا ضرور جلتا ہے اور یہ سلسلہ 20 برس سے جاری ہے۔ سنا ہے یہ عمارت پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ بہت مضبوط اور وسیع بھی ہے۔ اب برسوں سے رنگ روغن اور مرمت نہ ہونے کی وجہ سے ایک اُبڑے ہوئے مقبرے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ عمارت تھی جہاں کسی زمانے میں محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ہر طرف شکستگی اور تازگی نظر آتی تھی..... لیکن اب یہاں ہر طرف اُداسی، سوگاری اور ویرانی چھائی رہتی ہے۔ ایسی ویرانی کہ دن کے وقت دیکھنے سے ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے۔“

خورشید خان کے دل میں جو تجسس پیدا ہوا تھا اب وہ گہری نوعیت اختیار کر گیا۔ اسے اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا ایک سنہری موقع ملنے کی امید

پیدا ہو گئی..... وسیع حویلی، تنہا عورت اور محبوب کی منتظر..... اس کا مجرمانہ ذہن ایک بار پھر بیدار ہو گیا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا اور اس کے تحت اس حویلی اور اس عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں لگ گیا۔

حویلی کے جد امجد ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان کا تعلق بھوپال کے نواب خاندان سے تھا۔ روایات کے مطابق یہ لوگ اپنے ساتھ کروڑوں روپے مالیت کے جواہر اور سونا چاندی لائے تھے۔ اس خاندان کا آخری نواب ظہیر الدین تھا اور حویلی میں رہنے والی نرس خاتم اس خاندان کی آخری فرد اور نواب ظہیر الدین کی بیٹی تھی۔ نواب ظہیر الدین کا خاندان حسن و بھالی و وجاہت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا..... مگر نرس کی بد قسمتی کہ وہ خاندان کے کسی فرد پر نہ گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی بلکہ حقیقت میں وہ ایک بد صورت عورت تھی۔ حویلی کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ بھی سفید نہ تھا۔ اس کے اگلے تین دانت بہت ہی لمبے اور اوپر اٹھتے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ بعد میں اس کے وہ تینوں دانت نکلوا کر نقلی دانت لگائے گئے تھے مگر پھر بھی اس کی بد صورتی میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی۔ نواب صاحب نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اسے اخلاق و آداب سکھانے کے لیے خصوصی استاد مقرر تھے۔ اس کی جسمانی دیکھ بھال کے لیے بھی عورتیں مقرر تھیں جو اسے ہر وقت بنا سنوار کر رکھتی تھیں..... مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ خوبصورت اور پر حشش نہ بن سکی تھی..... مگر اس کے برعکس اس کی ذہنی سطح بہت بلند تھی۔ کالج میں تعلیم کے دوران اور یورپ کی سیر کرنے کی وجہ سے اسے بہت سے مشاہدات اور تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔

نواب صاحب نے نرگس کی اس ضد کو جذباتی فیصلہ سمجھا اور یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نرگس دلشاد کو بھول جائے گی۔ وہ اس کو پھر بھی سمجھاتے اور مانتے رہے مگر

شیر کا شکاری

ایک شکاری ایک خوبصورت عورت کے سامنے اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیروں کے نیچے بھی ہوئی شیر کی کھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”جہاں تک اس شیر کے شکار کا تعلق ہے، میں نے اسے بنگال میں شکار کیا تھا۔ اس کے شکار میں زندگی کی بازی لگ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نہیں یا شیر نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ پھر کیا ہوا؟“

”ہاں مجھے کہنا ہی پڑے گا“ اس عورت نے کہا۔ ”آپ جیت گئے کیونکہ قالین شیر کی کھال کا ہی اچھا لگتا ہے۔“

”دلشاد..... دلشاد.....“ نرگس نے کہا اور دروازے کھول دیا۔
”کیا..... تم واقعی دلشاد ہو.....؟“
”ہاں میں تمہارا دلشاد ہوں..... کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ رقت آمیز تھا۔
”میں..... میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی..... دلشاد..... آؤ..... اندر آ جاؤ۔“

نرگس نے حسب معمول سفید لباس اور سیاہ چشمہ پہن رکھا تھا..... اس نے دونوں ہاتھ ٹٹولنے کے انداز میں آگے کر رکھے تھے..... خورشید خان نے ہینڈ بیگ اٹھایا اور اندر چلا گیا۔ پھر وہ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے ٹھک کر بولا۔
”نرگس! تم نے سیاہ چشمہ کیوں پہن رکھا ہے؟“
”میری آنکھیں بھی سیاہ ہیں..... میں کچھ دیکھ

کا میاب ہوگا۔ ناکامی کا امکان کم ہی تھا۔ پھر بھی اسے ناکامی کی صورت میں کسی قسم کے خطرے کا سامنا نہیں کرنا تھا۔

”یہ میری زندگی کا آخری جرم ہوگا۔ کامیابی ہو یا ناکامی..... اس کے بعد وہ مرتے دم تک کوئی جرم نہیں کرے گا۔“ اس نے یہ عہد کر لیا تھا۔

اس نے سوچا میں برس کے انتظار کے بعد نرگس خانم کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہوگی اور وہ کوئی شک کئے بغیر اسے دلشاد کی حیثیت سے تسلیم کر لے گی۔ وہ اس سے معافی مانگ لے گا اور وہ یقیناً اسے معاف کر دے گی..... خورشید خان کو اپنی کامیابی کا بہت ہی زیادہ یقین تھا۔

رات کے دس بجے تھے۔ حویلی کے ارد گرد سناٹا طاری تھا۔ تب خورشید خان نے بڑے دروازے پر دستک دی۔ چند ساعتیں گزر گئیں تو اس نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنا دی..... کوئی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ خورشید انتظار کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے کے قریب آ کر زکا ہے۔ پھر اس کے کانوں نے ایک آواز سنی۔
”کون.....؟“ ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز نے پوچھا۔

خورشید کو یقین تھا کہ یہ نرگس خانم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

”نرگس!..... یہ میں ہوں۔“ خورشید خان نے کہا۔

”تم..... کون؟“
”میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں..... دوسری طرف سانسوں کی آواز تیز ہو گئی۔

”تنت..... تم کون ہو؟“
”تمہارا مجرم..... تمہارا دلشاد علی۔“

ہاتھ تیزاب منگوا اور ان میں سلائیاں ڈبو کر اپنی آنکھوں میں پھیر لیں اور ہمیشہ کے لیے اپنی بینائی ختم کر ڈالی۔ وہ اندھی ہو گئی۔ طویل انتظار نے اس کے اندر مایوسیاں بھری تھیں اور اس کی آنکھیں دلشاد کی راہ نکلتے نکلتے پتھر اگتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ جو آنکھیں اس کے محبوب کو نہیں دیکھ سکتیں وہ کسی اور کو کیوں دیکھیں۔ لیکن اس تکلیف دہ قربانی کے بعد بھی اس نے اپنے محبوب کا انتظار ترک نہ کیا۔ وہ اب بھی کھڑکی میں دیا ضرور جلاتی۔ اندھی ہونے کے باوجود بھی اس کے طرز زندگی اور انتظار میں فرق نہ آیا۔ وہ سراپا انتظار رہی اور بائیس برس بیت گئے۔ خورشید خان نے جب یہ معلومات جمع کر لیں تو اس کے مجرمانہ ذہن نے کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ اس نے سب سے پہلے دلشاد کے بارے میں چھان بین شروع کر دی۔ شادی کے وقت دلشاد علی کی عمر تیس برس تھی گویا اس وقت وہ تین برس کا ہو چکا تھا..... خورشید خان اور اس کی عمر میں صرف ایک برس کا فرق تھا۔ جہاں تک اس کی شکل و صورت کا معاملہ تقصیر میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو اسے پہچان سکتا ہو کیونکہ وہ حویلی میں دوبار ہی آیا تھا۔ زیادہ تر لوگوں نے اسے شادی والے روز ہی دیکھا تھا اور وہ بھی بس ایک جھلک۔ رہی نرگس کی بات تو وہ اندھی ہو چکی تھی اور اب وہ دلشاد کو پہچان نہ سکتی تھی۔

خورشید خان اب اس سوچ میں تھا کہ وہ کس انداز میں نرگس کے پاس جائے۔ اس نے ملازمت ایک ماہ قبل ہی چھوڑ دی تھی اور اب وہ اس گفتگو کی مشق کر رہا تھا جو اس نے نرگس کے سامنے جا کر کرنی تھی۔ چونکہ اس معاملہ میں اس کا کوئی راز دار تو تھا نہیں اس لیے وہ اپنے کو سامنے رکھ کر مشق کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا منصوبہ

نرگس ان کی اس بات پر دھیان ہی نہ دیتی۔ چند سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نرگس دلشاد کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے علاوہ اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہ رہی۔ شوہر کے انتظار نے نرگس کو نیم پاگل کر ڈالا۔ اب وہ چاندنی راتوں میں شادی والا جوڑا پہن کر حویلی سے باہر نکل جاتی اور ہر گزرنے والے کو دلشاد جان کر آوازیں دینے لگتی..... یہ صورتحال دیکھ کر اس کے والدین نے اسے کمرے میں بند کر دیا لیکن اس پابندی نے اس کے ذہن پر اور بھی برا اثر ڈالا اور اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ ثواب صاحب اور ان کی نیگم کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کا دن اور رات کا چین اور سکھ ختم ہو کر رہ گیا۔

بالآخر ثواب صاحب نرگس کو علاج کی غرض سے انگلینڈ لے گئے جہاں وہ ڈیڑھ سال زیر علاج رہی۔ اب اس کی جنونی کیفیت تو ختم ہو گئی لیکن دلشاد کی یاد اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔ اس کے ناشاد دل کو دلشاد ہی شاد کر سکتا تھا۔

یوں ہی چودہ برس بیت گئے۔ اس عرصہ میں ثواب صاحب اور نرگس کی ماں ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب نرگس حویلی میں تنہا رہ گئی۔ اس نے ملازموں کو بھی چھٹی دے دی۔ اب اس کے انتظار میں ایک استقلال سا آ گیا۔ اس نے تمام جاننے والوں، سہیلیوں وغیرہ سب سے قطع تعلق کر لیا۔ نہ وہ خود کسی سے ملنے جاتی اور نہ ہی حویلی میں کسی کو آنے دیتی، سوائے ایک ملازمہ کے جو حویلی کی صفائی اور کچھ کام کر کے چلی جاتی۔ نرگس کا اب ایک ہی کام اور ایک ہی مشغلہ رہ گیا..... بس دیا جلا کر اپنے محبوب کا انتظار کرنا۔ اب تو وہ راتیں بھی جاگ کر گزارتی تھی۔ ایک رات اس نے ایک ناقابل یقین حرکت کر ڈالی۔ اس نے ملازمہ کے

رکھا ہے؟“

”جب انسان کی باطنی آنکھیں کھل جائیں تو اسے بیرونی روشنی کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو باہر کی دنیا نہیں دیکھ سکتا وہ بہت سی ذہنی اذیتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ انسان جب کسی خوبصورت چیز کو دیکھتا ہے تو اسے پانے کی تمنا بھی کرنے لگتا ہے لیکن ہر تمنا پوری نہیں ہوا کرتی اور ہمیں سے ذہنی اذیت کی ابتدا ہوتی ہے لہذا جو دیکھ نہیں سکتا وہ زیادہ آرام میں ہے۔“

خورشید خان نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ نرگس بڑے اطمینان سے چل رہی تھی جبکہ وہ اندھے میں چلتے ہوئے دقت محسوس کر رہا تھا۔ نرگس نے اسے غسل خانے تک پہنچایا اور خود کھانا تیار کرنے کے لیے واپس لوٹ آئی۔ وہ تاریکی میں ایسے غائب ہوئی جیسے دھواں ہوا میں تحلیل ہوتا ہے۔ جب خورشید خان غسل کر کے باہر آیا تو نرگس کو اپنا منظر پایا۔ وہ اس کی راہنمائی کرتے ہوئے ایک کشادہ خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ وہاں میں دیے روشن تھے۔ وہ نہایت ہی آراستہ کرہ تھا۔ بالکل ایسے جیسے عجلہ عروسی ہو۔

”میں اس خواب گاہ کو گزشتہ بیس برس سے سہا رہی ہوں۔“ نرگس نے کہا۔ ”تمہاری جدائی نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور میرے پایا مجھے علاج کے لیے لندن لے گئے تھے لیکن میں اتنی بھی پاگل نہیں ہوئی تھی کہ اپنے فرض سے غافل ہو جاتی۔ بس اپنی ملازمہ کو ہدایت کر گئی تھی کہ وہ اس کمرے کی سجاوٹ کا خاص خیال رکھے اور ہر رات دیا بھی جلایا کرے۔“ خورشید خان حیرت سے کمرے کی آرائش دیکھنے لگا۔ میز پر کھانا بھی رکھا تھا۔ اس میں بننا ہوا گوشت، شاہی کٹلے، تلی ہوئی چٹلی اور کچھ اچار چٹنیاں رکھی تھیں۔ دونوں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

نہیں سکتی..... جو آنکھیں اپنے محبوب کو نہ دیکھ سکیں ان کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ اب تم آگے ہو تو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ آؤ اندر چلیں۔“

خورشید خان نے بڑی گرجوٹی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں دیا جل رہا تھا۔

”نرگس..... میں بہت شرمندہ ہوں اور.....“

”نہیں..... کچھ نہیں“ نرگس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج کوئی پرانی بات نہیں ہوگی..... بیس سال میرے لیے بیس لمحوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے..... میرے لیے سب سے اہم بات تو یہی ہے کہ تم واپس آگئے ہو..... بس یوں سمجھ لو کہ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ گزرے لمحوں کا حساب کر کے ہم جال کو نا خوشگوار ہرگز نہیں بنائیں گے۔ تم یوں کرو کہ غسل کر لو۔ میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“

”لیکن نرگس.....“

”کچھ نہیں..... آج کی یہ رات میری رات ہے۔ میری زندگی کی یادگار رات..... اس لیے آج تم کچھ نہیں بولو گے آج جو میں چاہوں گی وہی ہوگا۔ رات گزر جائے تو پھر جو تم چاہو گے وہی ہوا کرے گا۔ تم یہ فکر نہ کرو کہ میں کیسے کام کروں گی۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ بس تم جلدی سے فریش ہو کر تیار ہو جاؤ۔ آج ہماری شادی کا دن نہیں بلکہ رات.....“

خورشید خان نے اپنے بیک سے کپڑوں کا جوڑا نکالا۔ تو نرگس اس کے ساتھ چل بڑی کہ آؤ تمہیں غسل خانے تک چھوڑ آؤں۔ نرگس کی باتیں اسے عجیب لگ رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی نارمل انسان کی باتیں نہ ہوں۔ خورشید خان نے نرگس سے پوچھا۔ ”یہ تم نے ہر طرف اندھیرا کیوں کر

مرحبا سبوس اسپغول

قدرت کی صحت بخش غذا اور دوا



مرحبا کا سبوس اسپغول جو کہ پلانٹگو اوٹا (Plantago Ovata) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بغیر اسٹارچ کے کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل انتہائی حل پذیر فایبر ہے۔ یہ قطعی طور پر بے ضرر اور خاص طور پر دائمی قبض اور پیسلری پیچش کے لیے مفید ہے۔

خواص: قبض روزمرہ کی شکایات میں سب سے زیادہ عام ہے جبکہ پیسلری پیچش اور دائمی قبض تو عالمگیری حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان بیماریوں میں سبوس اسپغول کا استعمال لیکویڈ پیرافین یا اس کی مصنوعات سے بالکل جدا آرام دہ اور بہتر ہے کیونکہ لیکویڈ پیرافین آنتوں میں حیاتین اور غذا کے معدنی اجزاء کے جذب کو روک دیتا ہے۔ جبکہ چھلکا اسپغول کے استعمال سے ایسی کوئی پیچیدہ صورتحال پیدا نہیں ہوتی۔ مزید برآں یہ ایبائی پیچش الہریٹیکولائٹس (Ulcerative Colitis) اور یواسیر میں بھی انتہائی موثر علاج ہے۔ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ چھلکا اسپغول کا باقاعدہ استعمال موٹاپے اور خون میں چربی جیسے مہلک بیماریوں کا تدارک کرتا ہے۔

طریقہ عمل: مرحبا کا سبوس اسپغول معدہ اور آنتوں میں پانی کی کافی مقدار جذب کرتا ہے جس سے اس کی شکل جینی کی طرح ہوجاتی ہے۔ جو نہ صرف آنتوں کی دیواروں کو خراشوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ چکنائٹ بھی پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ معدے اور آنتوں سے مضر صحت اجزاء جیسے چکنائی اور کولیسٹرول کے مایکول، فالٹو کاربوہائیڈریٹ وغیرہ کو دیوبج لیتی ہے۔ جس کی بدولت جسم میں ان اجزاء کا توازن برقرار رہتا ہے جو کہ موٹاپے کو کم کرتا ہے اور خون کی نالیوں کو تنگ ہونے سے بچاتا ہے۔ حال ہی میں نیشنل کولیسٹرول ایسوسی ایشن پروگرام برائے ایڈلٹ اور ٹریڈنٹ گائیڈل ٹینیز یو۔ ایس۔ اے (U-S-A) نے سبوس اسپغول کے استعمال پر کافی زور دیا ہے جو کہ خون میں کولیسٹرول کھانے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اسپغول مین پینٹین، میوکی لیجر، کئی ایک ہیپیلووزیز اور پوناٹیم جیسے اجزاء شامل ہیں جن میں کولیسٹرول کھانے کی صلاحیت موجود ہے۔

خوراک: بالغ افراد کے لیے دو چائے کے چمچ ایک گلاس پانی کے ساتھ دن میں دو یا تین بار بچوں کے لیے آدھا چمچ سے ایک چمچ تک دن میں دو سے تین بار

ہدایات: مرحبا کا سبوس اسپغول / دودھ، مشروبات اور دیگر اشیاء کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے / چھلکا اسپغول کو نگل لیں / چنا کر نہ کھائیں / شیرخوار بچوں کو نہ دیں۔ / بدقسمتی کی صورت میں استعمال نہ کریں / ضرورت کے مطابق خوراک کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

تیار کردہ

مرحبا لیبارٹریز

142- مین انڈسٹریل اسٹریٹ کوٹ کھپت لاہور۔ پاکستان

فون نمبر: 5156068 - 5118679

E-mail: info@marhaba.com.pk Web site: www.marhaba.com.pk

نرگس مسلسل بولے جا رہی تھی..... یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بیس سال کے سارے دکھ سکھ وہ ایک ہی رات میں کہہ دینا چاہتی ہو۔

کھانے کے بعد وہ برتن اٹھا کر لے گئی..... پھر تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو وہ شادی کے سرخ جوڑے میں ملبوس تھی۔ وہ نہایت سچے تلے قدموں سے اندر آئی اور پلنگ پر بیٹھ گئی.....

خورشید خان حیرت سے اسے دیکھنے لگا..... ”کیا تم میرا گھونگٹ نہیں اٹھاؤ گے“ نرگس شرماتے ہوئے بولی۔ ”لیکن ایک منٹ پہلے یہ جائیداد کے کاغذات دیکھ لو۔“ اس نے ایک لٹافہ خورشید خان کی طرف بڑھایا۔

”جائتم“ خورشید نے چالاکی سے کہا..... ”میں اب جائیداد نہیں لوں گا..... مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے، میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے آیا ہوں، کفارہ ادا کرنے آیا ہوں اس گناہ کا جو میں نے تمہیں پہنچا دیا تھا۔“

”بس کچھ نہ بولو..... میں کہہ چکی ہوں کہ آج

کی رات صرف میری رات ہے۔ آج تم میری ہر بات مانو گے۔ کل سے میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ آج تم میری کسی بات اور کسی خواہش کو رد نہیں کرو گے۔ آج میں ساری رات تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آج تم میری ویران زندگی میں بہار بن کے آئے ہو..... آج کی رات کتنی رنگین ہے، کتنی خوبصورت ہے، آج کی رات میری زندگی کی یادگار رات ہوگی..... دیے بجھا دو اور میرے پاس آ جاؤ۔“ نرگس نے ناہنیں پھیلا دیں..... پھر بولی..... ”ابھی ٹھہرو..... میں تمہارے لیے دودھ

لے کر آتی ہوں۔ یہ ہمارے خاندان کی روایت رہی ہے کہ سہاگ رات دودھ کا آدھا گلاس پہلے

دلوہا پیتا ہے..... اور پھر آدھا گلاس دہن چینی

ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دودھ کا گلاس لے کر آگئی اور خورشید کو گلاس تھماتے ہوئے بولی ”آدھا تم پیو..... آدھا میں پیوں گی۔“

خورشید نے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا اور آدھا گلاس پی گیا..... اس نے گلاس نرگس کی طرف بڑھا دیا۔ نرگس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور دیکھنے لگی۔ ابھی اس نے دو تین دیے ہی بجھا دیے تھے کہ خورشید کو محسوس ہوا کہ اس کا سر بھاری ہو رہا ہے۔ وہ سر کو دباتا ہوا لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اسی وقت اس کے کانوں میں ایک تیز تھپتھپ کی آواز گونجی..... اس نے آنکھیں کھول کر سر اٹھا کر دیکھا تو نرگس کسی جنونی کی مانند فیس رہی تھی..... پھر وہ اچانک ٹک گئی اور اپنی بے نور پلکیں جھپکانے لگی۔

”گلتا ہے زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔“ اس نے چیخ کر کہا..... ”مجھے یقین تھا کہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے دلدادہ علی..... آج میں بہت خوش ہوں۔ اب میری باقی زندگی سکون سے گزرے گی۔ تم نے مجھے ٹھکرا کر میری جو توہین کی تھی میں نے اس کا انتقام لے لیا ہے۔“

خورشید خان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر جسم ساکت ہو چکا تھا۔ نرگس کی آواز اسے میلوں دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ کچھ کہنے اور سوچنے کے قابل نہ رہا تھا۔ موت کا آہنی پنچہ اس کی گردن کے گرد خنٹ ہوتا جا رہا تھا.....

اگلی شام قصبے والوں نے دیکھا کہ حویلی کے پچے پچے پردے جل رہے تھے جیسے وہاں کوئی آگ مٹا جا رہا ہو.....!

ناقابل شکست۔۔۔!

ایس۔ امتیاز احمد

میرے ارد گرد کھڑے ہوئے آفسر مجھے رشک سے دیکھ رہے تھے۔ ”کیا تمہارا رشتہ دار ہے بریگیڈیئر جنرل۔ تمہارے خاندانی مراسم ہیں۔ تم اس کی بیوی کے رشتہ دار ہو۔ اس نے تمہیں مدعو کیا ہے۔ بہت قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے تمہارا۔“ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔

”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے جسے ٹال نہیں جاسکتا۔“

مشورہ دیا تھا۔ اس دن وہ گم سم اور بیزار صوفی پر بیٹھی کرسی پر نیم دراز یا بستر پر لیٹی سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اس سچے کے خواب دیکھ رہی ہے جسے سات ماہ بعد پیدا ہونا تھا۔ اس کے اضطراب کو میں جذباتی ہیجان سمجھا تھا اور بیزار صوفی کو

سات سال قبل جس رات یکطرفہ طور پر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب میرے ساتھ نہیں رہ سکتی، کمرس میں دو دن باقی تھے۔ ہم نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بڑی محبت سے سپایا تھا۔ میں نے اکیلے سارا کام کیا تھا کیونکہ جین کو ڈاکٹر نے آرام کرنے کا

جسم کا ایک فطری رد عمل۔ چنانچہ میں نے خود ہی مہمانوں کے نام لکھے اور دعوت نامے ارسال کئے اور ٹیکٹ بنوائے۔ دو ٹیکٹ..... ایک شادی کی پہلی سالگرہ کا اور دوسرا کرسمس کا۔ رات کے کھانے سے پہلے میں بڑے کمرے میں چھت کو چھونے والے کرسمس ٹری کی آرائش سے فارغ ہوا تو سخت تھک چکا تھا۔ اتنا بڑا درخت میں نے بچپن سے اب تک کبھی اپنے گھر میں نہیں دیکھا تھا چنانچہ میں نے اس کی تزئین میں رنگین بلب، چمکیلی پر، سنہرے اور روپیلے رنگوں کے گولے، کاغذ کے رنگ برنگے فانوس اور جھالریں لٹکائیں جس کے بعد درخت کسی نئی نوبلی دلہن کی طرح جگ گیا۔ ابھی چین کے لیے تھکے خریدنے کا مرحلہ باقی تھا جسے میں نے اگلے دن پر اٹھا رکھا اور سو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ جا چکی تھی۔ میرے پہلو میں بستر پر اس کی جگہ خالی پڑی تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بھرا گھرا اپنی تزئین و آرائش کے باوجود ویران پڑا ہے۔ بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ آدمی جس گھر کی پناہ میں قید رہتا ہے اس کے درود یوار اسے سب کچھ بتا دیتے ہیں مگر میں کچھ نہ سمجھا۔ پھر میں نے لفافہ اٹھایا۔ اس میں ایک سیدھا سادا پیغام تھا جو صرف ایک سطر پر مشتمل تھا۔

”میں تمہارا ساتھ چھوڑ رہی ہوں۔“۔۔۔ چین!

کوئی وجہ نہیں کوئی جواز نہیں۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ طلاق چاہتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ کس کے پاس اور کہاں جا رہی ہے۔ ان ہزاروں سوالات کا جو میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے، واحد جواب ایک سطر تھی جس سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

میں نے گھر میں تالا لگایا اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ صرف یہ جاننے کے لیے کہ میرا قصور

کیا ہے۔ گزشتہ ایک سال میں اگر اسے مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو اس نے مجھ سے تذکرہ کیوں نہیں کیا اور اگر وہ مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو یہ فیصلہ اس نے تنہا کیوں کیا۔ اگر اس کی محبت کا مرکز میری جگہ کسی اور کی ذات بن گئی تھی تو کیوں۔ کیوں۔ کیوں۔۔۔ ایسے سینکڑوں ہزاروں ”کیوں“ قطار در قطار کھڑے ہاتھ پھیلائے اپنا اپنا جواب مانگتے تھے اور میرے پاس کسی کو دینے کے لیے ایک جواب بھی نہ تھا۔ میں نے اس کی ماں کے گھر فون کیا۔ اس کے بھائیوں سے پوچھا۔ دوستوں اور سہیلیوں سے معلوم کیا یہاں تک کہ ریلوے آفس اور ایئر پورٹ سے معلومات حاصل کیں مگر مزو وین چین یا جین اسکاٹ کے نام سے کسی کی ریزرویشن نہ تھی۔ مجھے اگر اس کے دماغی توازن پر شبہ ہوتا یا کسی سے خطرہ ہوتا کہ اسے اغوا کر لے گا تو میں پولیس سٹیشن بھی جاتا مگر رفتہ رفتہ اسکے سابقہ چند دنوں کے رویے کی اس کے اضطراب کی اور خاموشی کی وجہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

جب وہ مجھے کہیں نہ ملی تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ اس نے کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔ تین دن بعد میں گھر لوٹا تو کرسمس گزر چکا تھا۔ میرے گھر آنے والے مہمان مایوس ہو کر جا چکے تھے اور میں نے تقدیر کے لکھے کوائل جانتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ میں اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ تصور میرا نہیں۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں۔ میں نوجوان اور صحتمند، تعلیم یافتہ اور مہذب ہوں۔ شکل و صورت اور عادات و اطوار کا بُرا نہیں۔ لڑکیاں ہمیشہ مجھ پر یا میری لیشینٹ کی وردی پر مرمی رہی ہیں اور میرے حلقہ احباب میں اچھے لوگ ہیں۔ غلطی میں نے چین کو سمجھنے میں کی۔ وہ اچھی محبوبہ بن سکتی تھی، بیوی نہیں۔ اور کسی ایک مرد پر قانع ہو کر وفاداری سے پوری

زندگی گزارنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ جس کے ساتھ گئی ہے سال چھ مہینے بعد اس سے بھی آگے جائے گی اور اگر لوٹ کر میرے پاس نہ آئی تو کسی تیسرے شخص کے پاس چلی جائے گی۔ ایسی عورت کے لیے رونے پینے یا زندگی تباہ کرنے سے کیا حاصل۔ رسوائی اور شرمندگی چند دن کی بات ہے۔ پھر لوگ سب بھول جائیں گے۔ اگر اس نے مجھ سے طلاق مانگی تو میں فوراً دے دوں گا۔ بلکہ اس کا سراغ مل گیا تو خود ہی اس سے چھکارا حاصل کر لوں گا۔ جب میں نے طے کیا تو اس فیصلے سے مجھے بڑا سکون حاصل ہوا۔

میں نے تین دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کو صاف کیا۔ غسل کر کے لباس بدلا اور کھانے کے لیے باہر نکل گیا۔ رات کا کھانا آفیسرز میں تھا۔ اس کے لیے میں نے پورے اہتمام سے بہترین سوٹ منتخب کیا اور اپنے ساتھ ایک ایسی لڑکی کو لے گیا جسے میں جین سے شادی کرنے سے پہلے جانتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میری بیوی مجھے چھوڑ گئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ میری وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ غلطی اس کے تنگ نظر حامد شوہر کی تھی جو میرا کما گنگ آفیسر تھا، کرٹل فورڈ۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے شادی کے بعد بھی اس کی بیوی سے ترک تعلق نہیں کیا جو کہ سراسر غلط بات تھی۔ ایک تو میں خود شادی کر چکا تھا دوسرے وہ میرا افسر تھا۔ ایک شادی شدہ لیشینٹ ایک کرٹل کی بیوی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے مستقبل سے اور خود بزدل ہو یا کرٹل کمینہ ہو تو کوئٹ مارشل سے بھی ڈرتا ہے۔ ”مریم!“ میں نے کہا میں تمہیں کرسمس کے دن اور ڈانس میں لے جا رہا ہوں۔ وہاں کرٹل فورڈ بھی ہوگا۔

وہ ہنسی ”اور تمہاری بیوی بھی ہوگی۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”تمہیں کب سے معلوم ہوا۔ کون ہے وہ خبیث۔“ وہ پھر ہنسی۔ صرف تمہیں ہی معلوم نہیں وہ کون نہیں جانتا کہ مجھے فورڈ نے تمہاری وجہ سے چھوڑا تھا۔

”اُسے شک تھا کہ میں اب بھی تمہیں چاہتا ہوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے کہا۔ میرے کان گرم ہونے لگے تھے۔

”نہیں۔ اسے تمہاری بیوی پہلی ملاقات ہی میں پسند آگئی تھی۔ خیر تمہاری بیوی تو مجھے بھی پسند آئی تھی اور نہ جانے کتنے لوگوں کو پسند آئی ہوگی مگر ہوا یہ کہ تمہاری بیوی بھی کرٹل پر مرمی۔“ مریم نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”میں ابھی تیار ہوتی ہوں۔“ وہ غسل خانے میں جاتے ہوئے بولی۔ میں باہر ٹہلتا رہا۔ گزشتہ ایک برس کے واقعات میری نظروں کے سامنے تھے۔

”مریم۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اس فاشیہ کو بھی اور اس حرام زادے کو بھی۔ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے اس طرح۔“

”کس بات کا انتقام؟“ مریم اندر سے بولی۔

”کیا تمہاری بیوی اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی ہے؟ کرٹل نے تمہاری بیوی کو اغوا تو نہیں کیا ہے۔“ میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

میرے نقطہ نظر سے یہ اغوا ہی تھا کیونکہ فورڈ کرٹل تھا۔ اس کا عہدہ وہ طاقت تھی جس کی مدد سے اس نے ایک بہت ادنیٰ درجے کے ماتحت افسر کی بیوی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے عہدے نے میری بیوی کو سمور کر دیا تھا اور وہ مجبور ہو گئی تھی یا کرٹل فورڈ نے یہ جانتے ہوئے کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا میری بیوی پر ڈورے ڈالے تھے۔ بات ایک ہی تھی۔ تصور اس کے عہدے کا تھا۔ اگر میں کرٹل ہوتا اور وہ

لیفٹیننٹ تو کچھ نہ ہوتا۔

زبردست تھی۔ ”ویل۔ لیفٹیننٹ ویلس۔۔۔“ اس نے اچانک کہا ”اس کالج میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔“ وہ ذرا دیر کے لیے رُکا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”مریم فاؤلر۔“ اس نے ایک فائل اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ یہ سب اس کی اداکاری تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

”ویلس سر۔“ میں نے کہا ”وہ میری کلاس فیلو تھی۔“ میں یہ بات کہتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔ معنی خیز انداز میں۔ کیونکہ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری دوست تھی۔۔۔؟“ وہ پھر نظر فائل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”لڑکیاں تم جیسے سارٹ آدی کو پسند کرتی ہوں گی۔۔۔“ میں اس تعریف پر خوش ہوا۔ میں نے کچھ نہیں کہا، نہ تروید نہ تائید میں لیکن میں جانتا تھا کہ خاموشی کا مطلب اعتراف ہوتا ہے۔ ”یہ لڑکی۔“ وہ فائل پر دستخط کرتے ہوئے بولا۔ ”مریم فاؤلر یہ بھی تمہیں پسند کرتی تھی۔ ضرور مرنی ہوگی۔“

مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ ”حقیقت تو یہ ہے سر کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ پھر میں نے دشمن لے لیا اور سینڈ ہرسٹ چلا گیا۔ سنا ہے اس بے وفائے شادی کر لی ہے۔ چار سال بھی انتظار نہیں کیا میرا۔ آپ کیسے جانتے ہیں اسے۔“ اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر بولا: ”وہ میری بیوی ہے۔“

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر وہ بولا: ”مریم تمہیں دیکھ کر خوش ہوگی۔۔۔ شام کی چائے میرے گھر پیو۔“ اور جواب کا موقعہ دیے بغیر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا ”تھینک یو لیفٹیننٹ۔“ گویا ڈکس۔ میں باہر نکل آیا۔ یوں جیسے میں کسی عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کر کے نکلا ہوں۔ کرنل فورڈ نے کسی ماہر وکیل استغاثہ کی

طرح مجھے جرح میں الجھا کر میرے اپنے الفاظ میں اقبال جرم ریکارڈ کر لیا تھا۔ سزا دینے والا بھی وہ خود ہی تھا چنانچہ اپنے گھر مدعو کر کے اس نے بیوی سے میرا قطعی ذکر نہیں کیا اور اس شام مریم مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرے حقاظ روئے کے باوجود وہ ایک فطری گرم جوشی سے ملی۔ کرنل فورڈ محض مسکراتا رہا۔ یوں جیسے پرانے چاہنے والوں کی مجبوری کا نظارہ کر رہا ہے جن کے درمیان وہ خود یو یو ایل کی طرح ہے۔ یہ غلط فہمی تھی اس کی۔ ہمارے درمیان چاہت کے جذبات مفقود تھے۔ پرانے وقت کی یاد ضرور باقی تھی مگر وہ بات ایک جذباتی حادثے کی طرح تھی اور بدلے ہوئے حالات میں دل لگی سے زیادہ محسوس نہ ہوتی تھی۔ دل لگی تو مریم سے جدا ہونے کے بعد بھی جاری رہی مگر مریم ایک بھولی ہوئی داستان بن گئی۔ درمیان میں صرف ایک کلاس فیلو کے اچانک مل جانے سے مجھے معلوم ہوا کہ مریم نے شادی کر لی ہے تو مجھے قطعی احساس نہ ہوا کیونکہ اس زمانے میں میری جین سے متکئی ہو چکی تھی۔ کمیشن لینے کے بعد میں نے شادی کر لی اور مجھے عدل بھیج دیا گیا جہاں کرنل فورڈ آرمرڈ کور کی ایک رجمنٹ کی کمان کر رہا تھا۔ یہ آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ مجبوراً مجھے جین کو چھوڑ کر جانا پڑا۔

پہلی ملاقات میں میری گفتگو سے کرنل پر جو تاثر قائم ہوا اس میں کچھ غلغلہ نوجوانی کے غرور کا بھی تھا۔ کالج کے شاندار ریکارڈ کے بعد فوج کی افسری مل گئی تھی اور مریم کے بعد جین جس کا حسن نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا اور لوگ ہمیں چاند سورج کی جوڑی کہتے تھے۔ میرا باپ ایک دولت مند شخص تھا۔ بہت بڑے کاروبار کا مالک اور جین کا باپ وزارت دفاع کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا۔ اُسے یقین تھا کہ فوج میں میرا مستقبل بہت تابناک ہے۔ کرنل فورڈ شاید اپنی شکی

طبیعت کے باعث اپنی بیوی کے ایک کلاس فیلو سے صرف یہ جانتا چاہتا ہو گا کہ ماضی میں اس کی بیوی کا کردار کیسا تھا، اس سے کوئی سیکینڈل تو منسوب نہیں تھا، وہ بدنام تو نہ تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس پر اچانک انکشاف ہوا کہ وہ جسے راز دار بنا رہا ہے وہی ماضی میں اس کا رقیب تھا۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے کچھ نہیں بتایا اور میں نے جذباتی ہو کر وہ کہہ دیا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ محبت کے معاملے میں بھی میری وفاداریاں اور مستقل مزاجی میرے کردار کی ایک خوبی ہے لیکن یہ خوبی مجھے بڑی مہنگی پڑی۔ مریم مجھ سے کالج کے زمانے کی باتیں کرتی رہی اور میں مجرم بنا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ پروفیسر کی باتیں، کلاس فیلوز کے معاشقوں کے قصے، شرارتوں کے تذکرے۔ اچانک مریم کو احساس ہوا کہ اس کا شوہر بالکل خاموش تماشائی بنا بیٹھا ہے۔ وہ اس کی طرف پلٹی ”جان۔۔۔“ وہ ہستے ہوئے بولی، تمہارے سامنے یہ ماتحت لیفٹیننٹ شاید ڈپلن کا پابند بنا بیٹھا ہے ورنہ ویلس جیسا ذہین اور شوخ طبیعت کا لڑکا کالج میں نہیں تھا۔ بڑی تہذیبی آگئی ہے اب تو، پہلے یہ اتنے سنجیدہ اور خاموش نہیں تھے۔ ”کسی جذباتی حادثے کا اثر معلوم ہوتا ہے۔“ کرنل فورڈ مسکرایا۔۔۔ میں نے زیر لب کہا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں اور مسکرایا بھی مگر مریم ہنس پڑی۔ ”جان بڑی مضحکہ خیز لگتی ہے اب یہ بات مگر ایک زمانے میں ہم محبت کرتے تھے۔۔۔“ وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

”مجھے معلوم ہے ڈیئر۔“ کرنل فورڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مریم کی ساری شوخی کا فور ہو گئی۔“ اس کی ہنسی کو جیسے کسی منہ پر ہاتھ رکھ کر بدایا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور اپنے شوہر کی ساری بات سمجھ

اس نے مجھے ایک ایسے جرم کی سزا دی تھی جو میں نے نہیں کیا تھا۔ اس وقت کا جب کرنل فورڈ کی بیوی میری کلاس فیلو تھی اس وقت سے کوئی تعلق نہ تھا جب وہ کرنل کی بیوی تھی۔ چار سال پہلے ہم نے جو ایک بے ضرر سا معاشرہ لڑایا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ ہمیں اس وقت یہ بھی علم نہ تھا کہ کرنل فورڈ (جو اس وقت میجر تھا) نام کا کوئی شخص فوج میں ہے تو کہاں ہے اور کیوں ہے۔ غیب کا علم نہ مجھے تھا نہ مریم کو۔ نہ میں جانتا تھا کہ مریم چار سال بعد کرنل فورڈ کی بیوی بن چکی ہوگی نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ کمیشن لینے کے بعد میری پوسٹنگ اس کے یونٹ میں ہوگی چنانچہ جب میں رپورٹ کرنے پہنچا تو میں نے کمانڈنگ آفسر کی حیثیت سے اسے دیکھا اور اپنا تعارف کروایا۔

اس نے مجھے بڑے اخلاق سے بٹھایا اور پوچھا کہ میں نے کہاں تعلیم حاصل کی ہے؟ میرے والدین کہاں ہیں؟ شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے اس کالج کا نام بتایا جہاں میں سینڈ ہرسٹ جانے سے پہلے پڑھتا رہا تھا تو اس کے ماتھے پر لمحے بھر کے لیے پل پڑ گئے مگر میں نے اسے اپنی بات کا رد عمل نہیں سمجھا۔ وہ اپنے شاندار آفس میں بڑے کروفر سے بیٹھا تھا اور میز پر رکھے ہوئے پیڈ پر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ مجھ سے گفتگو کے دوران اس نے چائے بھی منگوائی اور کاغذات پر دستخط بھی کئے اور چند احکامات بھی صادر کئے۔ دو افراد کے مقدمے کا فیصلہ بھی کیا جو کچھ نئے کی حالت میں سر کے بل ایڈجسٹ کے سامنے گزرے اور اسے سیلٹ بھی کیا۔ دونوں کو پندرہ دن کے لیے گارڈ روم میں بھیج دیا گیا۔ میں سخت متاثر اور مرعوب بیٹھا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل فورڈ کی شخصیت بہت

گئی مگر تیرکان سے نکل چکا تھا۔ اس نے فراخ دلی اور بے تکلفی سے اپنے شوہر پر اعتماد کرتے ہوئے اور خود کو اس اعتماد کا سچا سمجھتے ہوئے ایک بات کہہ دی تھی۔ میری طرح اسے بھی بات ہوگئی تھی اور ہم دونوں کرنل فورڈ جیسے شاطر کے سامنے بٹے ہوئے مہروں کی طرح بیٹھے تھے۔ پھر میں نے صورتحال کو سنبھالا۔ ”محبت کہاں تھی وہ سزا فورڈ“ میں نے ہنستے ہنستے کہا، طالبعلی کا زمانہ تھا۔ بچپن کہہ لیجئے، جذباتی حماقت سمجھیں کہ ہر لڑکی اچھی لگتی تھی۔ پھر کون کے یاد رکھتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ چار سال بعد آپ سے بالکل اتفاقیہ ملاقات ہوئی ہے۔“

”بعض اتفاقات بڑے حسین ہوتے ہیں مسٹر ویلس۔“ کرنل فورڈ نے گلاس کو اپنے ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

”ییس سر“ میں نے فوراً کہا۔ ”جین سے اپنی ملاقات کو میں ایسا ہی اتفاق سمجھتا ہوں۔ حال ہی میں ہم نے شادی کی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ محبت آدمی کو کیا بنا دیتی ہے۔ آدمی گزشتہ زندگی کو کتنا بے مصرف اور نامکمل سمجھتا ہے۔ جین کے عشق نے میری تکمیل کی اور اب میں اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ مجھے معلوم تھا کہ مریم کو ان باتوں سے رنج ہوگا لیکن میں فورڈ کے دل سے بدگمانی کے داغ کو دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے یہ جذباتی انداز فکر ہے۔ آدمی ہر حال میں زندہ رہتا ہے۔ اسکی تکمیل زندگی کے تجربات کرتے ہیں۔ تجربات و حوادث جن میں محبت بھی شامل ہے۔“ کرنل فورڈ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”لیکن محبت آدمی ایک ہی بار کرتا ہے سر“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ میں نے بھی یہی سنا ہے۔ خصوصاً

عورت کے بارے میں کہ وہ اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کر سکتی۔“ وہ آہستہ آہستہ مریم کی طرف پلٹا۔ ”کیوں ڈارلنگ“ اس نے شہین کا جام مریم کو پکڑایا اور بڑی لائقیت سے دو جام اپنے اور میرے لیے بھرنے لگا۔

”میں۔۔۔ میرا خیال ہے یہ افسانوی باتیں ہیں۔“ مریم نے لہجے کو شکستہ رکھنے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہا۔ ”فلوں اور ناولوں کی طرح۔“

”تمہارا مطلب ہے ان میں جھوٹ بھرا ہوتا ہے۔ زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”مجھے کیا معلوم۔ میں فوجی آدمی ہوں۔ تم ہی زیادہ شوقین ہوان کی۔“ پھر اس نے ایک جام مجھے دیا اور اپنا جام اٹھا کر بولا ”پرانے دوستوں کی ملاقات کے نام“ اور پی گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مریم کے لیے اور میرے لیے کرنل کے سامنے اقرار ممکن ہے نہ انکار۔ اس کی گفتگو بظاہر شائستہ اور بے ضرر تھی لیکن کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں مریم کے اعصاب جواب نہ دے جائیں اور وہ ہسٹریا میں مبتلا نہ ہو جائے یا میں اچانک مشتعل نہ ہو جاؤں۔ فورڈ یہی چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ہم دونوں کی زبان سے محبت کا اقرار کرا لیا تھا اور اب اس محبت کو الزام بنا کر ہمیں احساس جرم میں مبتلا کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ تنگ نظر حامد اور کمینہ تھا۔ میں نے کسی ناخوشگوار صورتحال کے پیدا ہونے سے قبل ہی بھاگ جانا بہتر سمجھا۔

مگر میرے لیے کہیں بھاگ جانا ناممکن تھا۔ دن میں دس بار میری اور کرنل فورڈ کی ملاقات ہوتی تھی۔ پونٹ میں میرے علاوہ بھی جوئیر آفیسر تھے مگر میرے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے تکلف دوستوں کا سا تھا اور وہ بے تکلفی کی آڑ میں ایسی باتیں کہہ جاتا تھا جو اس کے معاندانہ جذبات کی مظہر ہوتی تھیں۔

اس نے مریم کو چھوڑنے کے بعد جین کو مجھ سے چھین لیا۔ ایک عام عورت کے لیے کرل فورڈ کے سامنے مزاحمت کرنا نامکن نہ سہی دشوار ضرور تھا لیکن میں جین کو عام عورت نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے اس پر پورا اعتماد تھا۔ کرل اس پر چپکے چپکے ڈورے ڈالتا رہا اور میں اسی اندھے اعتماد میں بے خبر رہا۔ اس دن تک جب میں نے اس کا ایک سطر کا فیصلہ پڑھا۔ کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اگر دیکھا یا سنا تب بھی کرل فورڈ کے ڈور سے کچھ نہ بولا۔ میرے منہ پر ثبوت کے بغیر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی یا شاید کسی نے کچھ نہ دیکھا نہ سنا۔ بات کچھ بھی ہو اب اگر مریم کہہ رہی تھی کہ کرل فورڈ نے میری بیوی کو اغوا نہیں کیا تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ صرف مجھے ہی معلوم نہ تھا کہ جین ہی نہیں ہر عورت عام عورت ہوتی ہے۔ میں کرل فورڈ سے انتقام لینے کا تہیہ کر چکا تھا لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ جب وہ میری بیوی کے ساتھ آئے گا تو اس بات کے باوجود کہ کرل کی بیوی میرے ساتھ ہوگی میں صورتحال کو برداشت کر سکوں گا یا نہیں۔ مریم اور جین میں تھوڑا سا فرق تھا۔ کرل فورڈ نے مریم کو طلاق دے دی تھی لیکن جین ہنوز میری بیوی تھی۔

ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں ماتحت اور فوجی ڈسپلن کا پابند ہونے کے باعث وہاں سب کے سامنے کرل فورڈ کو گریبان سے پکڑ لیتا تو اگلے دن ایک اور کورٹ مارشل ہوتا جس میں سابق وکیل صفائی کی حیثیت ملزم کی ہوتی اور اس کے اپنے دلائل اس کے خلاف استعمال کئے جاتے اور کرل فورڈ مجھے بھی تین سال کے لیے سول جیل ارسال کر دیتا۔ میرے کیریئر کا خاتمہ ہو جاتا۔ اپنے سے طاقتور دشمن سے بدلہ لینے کے لیے طاقت سے زیادہ عقل کا حربہ کارگرتھا مگر جین کو دیکھتے ہی

گھٹنے کرل فورڈ کی بیوی اور اس کے ساتھ رہنے پر مجبور۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ ایک بار میں اور جین ان کے گھر مدعو تھے۔ دوران گفتگو اچانک کرل نے مریم سے کہا ”تمہیں جین سے حد محسوس نہیں ہوتا ڈارلنگ۔“ مریم کا چہرہ سفید پڑ گیا اور میرے کان گرم ہو کر سرخ ہو گئے مگر وہ مسکراتا رہا۔

”کیوں؟“ مریم نے ناگواری سے ماتھے پر ہل ڈال کر کہا۔ ”حد کی بات کیا ہے؟“ وہ ہنسا۔ ”مجھے تو ویس سے ہوتا ہے۔“ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ مریم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔ جین ہکا بکا بیٹھی رہی۔

”میرا مطلب یہ تھا مسز ویس کہ آپ کا شوہر اتنا ہیڈسٹم اور ذہین آدمی ہے کسی بھی عورت کو آپ پر رشک آنا چاہیے اور ویس سے مجھے حد محسوس ہوتا ہے کہ آپ جیسی خاتون اس کی بیوی ہے۔“ وہ جین کی طرف جھک کر بولا۔ ”کیا اس میں برا ماننے کی کوئی بات ہے؟ تعریف عورت کی کمزوری ہے۔“ جین فوراً اس کی ہم خیال ہو گئی مگر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں اس سے لڑ پڑوں گا۔ میں برداشت کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔

کرل فورڈ کی بیوی نہایت بدتمیز اور تیز مزاج ہے۔ جین نے واپسی میں کہا۔ نہ جانے کرل فورڈ جیسا آدمی اسے کیسے برداشت کرتا ہے۔ میں چپ چاپ چلتا رہا۔ جواب دے کر میں جین سے لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ باپ کی وجہ سے میری بیوی یوں بھی اعلیٰ عہدے کو اعلیٰ تہذیب کی علامت سمجھتی تھی۔

تین ماہ کے عرصہ میں مریم نے کرل فورڈ سے طلاق لے لی لیکن کرل فورڈ نے اس پر بس نہ کی۔

ہر جگہ ساتھ آتے جاتے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے۔“ وہ بولا۔ اس کی نگاہ مجھ پر مرکوز تھی۔ ”اس سے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دوستی“ وہ ہنسا۔ ”مرد اور عورت کی دوستی میں جنس ضرور آتی ہے۔“

دلائل لیفٹیننٹ کے حق میں تھے۔ جرم کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ یقینی گواہ۔۔۔ عورت نے محبت کا اقرار ضرور کیا مگر ناجائز تعلق کا نہیں۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات لیفٹیننٹ نے بھی کہی کہ کسی کو نہ محبت پر مجبور کیا جاسکتا ہے نہ نفرت پر۔ قانوناً وہ میجر کی بیوی ہے، وہ وفادار ہے مگر اس سے نفرت کرتی ہے۔ قانون کیا کر سکتا ہے اور اگر وہ اس سے محبت کرتی ہے تو وہ جواب میں نفرت نہیں کر سکتا۔ کسی قانون کے تحت نفرت پر مجبور نہیں۔

اس کے باوجود کرل نے اسے تین سال قیدی سزا دی اور سول حکام کے حوالے کر دیا۔ سماعت کے دوران مریم کی موجودگی کو اور میری وکیل صفائی کی حیثیت سے نامزدگی کو کرل فورڈ کی ہم دونوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جس طرح وہ آتے جاتے مجھے ایسی باتیں کہتا رہتا تھا جن کی نہ میں تردید کر سکتا تھا نہ تائید مثلاً مریم کا دل کے زمانے کو بہت یاد کرتی ہے۔ واقعی زندگی کا بہترین دور ہوتا ہے وہ بھی۔ یا یہ کہ مریم کو مقدمے کے دوران تمہارے دلائل سے اتفاق تھا اور اس کا خیال ہے میں نے فیصلہ غلط دیا۔ خیر فیصلہ غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی طرح اس نے گھر پر مریم کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ صورتحال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے میں نے جین کو بلوایا۔ یوں میں خود اپنے پیروں پر کھڑی مار رہا تھا۔ یہ مجھے اندازہ نہ تھا۔

مریم عورت تھی۔ کمزور اور بے بس۔ چوبیس

”لیفٹیننٹ ویس۔“ اس نے ایک بار مجھے اپنے دفتر میں بلا کر چائے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ”آج ایک کورٹ مارشل ہے۔ ملزم کے لیے میں نے تمہیں وکیل صفائی نامزد کیا ہے۔ تم نے قانون پڑھا ہے۔“

”مگر میں نے لائسنس نہیں لیا۔“ میں نے حیرانی سے کہا ”مجھے تو کوئی تجربہ نہیں مقدمات کی سماعت کا۔ میں نے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں قدم بھی نہیں رکھا۔“

”لائسنس کی کورٹ مارشل میں ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ تو ایک رسمی کارروائی ہے۔“ وہ بولا ”پھر کیس سول کورٹ میں چلا جاتا ہے۔ اگر ملزم اپیل کرنا چاہے۔ یہاں تو ہم حقائق کا سرسری سا جائزہ لیتے ہیں ملزم خود کچھ اپنی صفائی میں کہے یا وکیل اسے فراہم کیا جائے وہ حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کچھ کہے تو سن لیتے ہیں اور فیصلہ سنا دیتے ہیں۔“

”کیس کیا ہے۔۔۔؟“ میں نے کہا۔ میرے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ احکامات صادر کر چکا تھا۔

”ایک لیفٹیننٹ نے ایک میجر کی بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ الزام میجر نے لگایا ہے۔ لیفٹیننٹ کہتا ہے اس نے کسی کی بیوی کو نہیں ورغلا یا۔ خود میجر کی بیوی اگر لیفٹیننٹ سے محبت کرتی ہے تو لیفٹیننٹ کا اس میں کیا قصور۔ لیکن قانونی طور پر چونکہ وہ میجر کی بیوی ہے اس لیے اس کا لیفٹیننٹ کے ساتھ رہنا غیر اخلاقی فعل ہے جس کی پونٹ لائف میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔“ کرل فورڈ نے کہا۔

”کیا یہ لیفٹیننٹ اس عورت کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں۔ لیکن وہ چوبیس گھنٹے اکٹھے رہتے ہیں۔“

شکار تھے اور توپوں کی گھن گرج اور بموں کے دھماکوں سے محفوظ فرصت کے چند لمحے گزارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت آگے جنگ جاری تھی اور ہمارے ساتھی دشمن کے خلاف صف آرا تھے۔ مورچوں میں بیٹھے تھے۔ مشین گنوں اور توپوں اور ٹینکوں کی آتش فشانی میں بارود کی بو اور دھواں کی چادر میں جیسے غیم کو تلاش کر رہے تھے جو ان کی تلاش میں تھا اور جو لمحہ بھر پہلے زندگی کی امید کے ناقابل شکست جذبے سے سرشار تھے وہ دوسرے لمحے موت کی سرد دے سی کے ساتھ اپنی شکست تن لاش لیے پڑے تھے اور ٹھوکر کھانے والے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے مگر یہ دوسری دفاعی لائن تھی۔ تین دن پہلے میں بھی اگلی حقوں میں تھا لیکن بہتر گھنٹے بعد میری جگہ کی اور نے سنبھال لی تھی اب تین دن بعد مجھے پھر کسی کی جگہ لینی تھی مگر دو میان میں عافیت کے تین دنوں کا یہ وقفہ میرے تھکے ہوئے جسم اور شکستہ اعصاب کو سکون اور آرام پہنچا کر پھر لڑنے کے قابل بنانے کے لیے ضروری تھا۔ دشمن کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور ان تین دنوں میں ہمیں دوسری دفاعی لائن کو چودہ میل پیچھے لے جانا پڑا تھا جس سے ہم سب دل گرفتہ تھے۔

”یہ سب بریگیڈ کمانڈر کی نااہلی ہے۔“ ایک میز پر سے کسی نے چیخ کر کہا۔ یہ ایک نوجوان لیفٹیننٹ تھا۔

”کوئی بریگیڈ کمانڈر یا جنرل نااہل نہیں ہوتا۔“ ایک کپٹن نے تردید کی۔ شکست و فتح مقدر سے ہے۔

”کس کا مقدر۔ ان کا جو مارے جاتے ہیں۔ جنرل یا فیلڈ مارشل کا مقدر صرف فتح ہوتی ہے؟“

”ہاں۔ یہ سارے فیلڈ مارشل روٹیل اور منگلی، یہ میدان جنگ میں سے یوں گزر جاتے ہیں جیسے کسی میلے سے گزر رہے ہوں۔ ٹپکتے ہوئے

کلب میں سناٹا تھا اور تاریکی تھی۔ مجھے مریم کا خیال آیا۔ اس نے بھی میری خبر نہیں لی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ خون کا نمکین ڈالغہ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا جو چوہوں کی طرح جم گیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا لیکن میں ہمت کر کے باہر نکلا۔ سڑک پر صرف میری کار کھڑی تھی۔ میں سیدھا مریم کے فلیٹ پر پہنچا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کرنل نے اسے بتایا تھا کہ میں اپنے گھر چلا گیا ہوں، جین کے ساتھ۔ جین کو اس نے اپنے بنگلے پر پہنچا دیا تھا۔ مجھے جین کے ساتھ جاتے سب نے دیکھا تھا چنانچہ شک کی بات ہی نہ تھی۔ اگلے دن جین نے اپنے باپ کو فون کیا اور تیسرے دن میری ہندوستان پوسٹنگ کے آرڈر آگئے۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے میں نے آخری خبر یہ سنی کہ جین نے اپنے اس بچے کو قتل کر دیا جو ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ پیدائش سے سات ماہ قبل ہی اس نے میرے اور اپنے نقل کی یہ نشانی بھی نہ رہنے دی۔ اس وقت میں نے قسم کھائی کہ میں کرنل فورڈ کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔

جب پانچ سال بعد مجھے مشرق وسطیٰ کے محاذ پر بھیجا گیا تو جنگ عظیم دوم کو شروع ہوئے دو سال گزر چکے تھے اور میں لیفٹیننٹ سے کپٹن بن چکا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے ماضی کی ہر تلخ یاد کو فراموش کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور خود کو اتنا مصروف رکھا تھا کہ مجھے جین کا یا کرنل کا یا مریم کا خیال بھی نہ آئے مگر میں اپنی قسم بھولا نہیں تھا۔ مزید دو سال مشرق وسطیٰ میں اور افریقہ میں مختلف مقامات پر بھیجتے رہنے کے بعد میں بن عازمی میں مقیم تھا کہ میں نے پھر فورڈ کا نام سنا۔ وہ اب بریگیڈ میز جنرل جان فورڈ ابوی ای تھا۔ میں آفسرز میس میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ میرے ارد گرد دوسرے آفسرز بیٹھے تھے جو سب کے سب میری طرح گھروں کی راحت سے محروم وطن سے دور زندگی اور موت کی آنکھ چولی میں بے یقینی کا

”خیر مجھے کوئی ضرورت نہیں اب تمہیں قائل کرنے کی۔۔۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے محبت نہیں نفرت ہے۔ کوئی منطق یا دلیل اس نفرت کو محبت میں نہیں بدل سکتی۔ کوئی قانون مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔“

میں نے اسے دھکا دے کر بیچ پر گرا دیا۔ ”یہ کورٹ مارشل نہیں ہے جہاں تم میرے الفاظ میرے خلاف استعمال کر کے مجھے سزا دلا دو اس خبیث کرنل سے۔ قانوناً تم میری بیوی ہو، میرے ہونے والے بچے کی ماں ہو۔ میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ نہ تم اس بچے کے باپ ہو نہ مجھے زبردستی لے جا سکتے ہو۔“ وہ سکون سے بولی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے۔ میرا تھیر پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑا اور وہ نیچے گر گئی۔ اسی وقت کرنل فورڈ میرے سامنے آ گیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا مگر اس نے مجھے حملہ کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔

”کوئی مرد کی عورت پر تشدد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ لیفٹیننٹ۔“ وہ بولا۔ ”خواہ وہ عورت کوئی بھی ہو۔“

اس کے ساتھ ہی پہلا مکہ میرے منہ پر پڑا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے فورڈ نے میرے پیٹ میں لات ماری اور میں دہرا ہوا تو دوسرا مکہ میری کپٹی پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ مجھے کرنل فورڈ کی پھرتی اور قوت کا اندازہ ہوا۔ بیہوش ہو کر گرنے سے پہلے میں نے اس کی آواز سنی۔ ”کم آن ڈارلنگ! یہ ابھی تھوڑی دیر میں اٹھ کھڑا ہوگا۔ مرا نہیں ہے۔“

رات کے کسی حصے میں میری آنکھ کھلی تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ میرے سر پر آسمان پر ستارے روشن تھے مگر

عقل کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے مریم کو چھوڑ کر جین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ ”اگر تم سیدھی طرح میرے ساتھ نہیں جاؤ گی تو میں زبردستی لے جاؤں گا۔ خواہ مجھے تماشا بننا پڑے یا کرنل فورڈ سے دودھ ہاتھ کرنے پڑیں۔ ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ پھر سب کو معلوم ہو جائے گا۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“ کرنل فورڈ نے دور سے یہ منظر دیکھا مگر مداخلت نہیں کی۔

کلب کے عقبی حصے میں باغ کا ایک گوشہ دیکھ کر میں نے اسے بیچ پر بٹھا دیا۔ ”یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟“

”میں نے یا تم نے؟“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”ابتدا کس نے کی تھی؟ تمہارا کیا خیال ہے مجھے اندازہ نہیں تھا یا میں وہ باتیں نہیں سنتی تھی جو لوگ تمہارے اور مریم کے بارے میں کرتے تھے۔“

”یہ بکواس ہے اور اس قسم کی بکواس صرف ایک شخص کر سکتا ہے۔ اس کی شکی طبیعت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ چار سال قبل جب کالج میں میری کلاس فیلو مریم تھی تب میں اسے پسند کرتا تھا لیکن اس کے بعد میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا اور یہ بات میں نے بھی فورڈ کو بتا دی تھی اور مریم نے بھی۔“

میں کچھ دیر کا پھر جین سے پوچھا: ”تم نے بھی مجھ سے نہیں کہا کہ تمہیں مجھ پر شک ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بے خوفی سے بولی۔ ”مگر میں نے یہاں آتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ تم مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے تھے۔ اور مجھے فورڈ نے۔۔۔“

”فورڈ کی بات مت کرو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”وہ کتا ہے بھونکتا ہے۔“

گی۔ میرا یہ خیال بے بنیاد ثابت ہوا کہ قصور میرا نہیں تھا۔ جین کی فطرت ہی بے وقاحتی۔ اس نے عدا جین کا اور اس کے تین بچوں کا تذکرہ کیا تھا۔ میری آتش انتقام کی چنگاری یلکھت شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ آل رات یوگی باسٹرو۔ تقدیر تمہیں کسی نئی فتح کا میڈل عطا کرنے یہاں نہیں لائی۔ فرشتہ اجل نے مجھے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے موقع فراہم کیا ہے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے ارد گرد کھڑے ہوئے آفیسر مجھے رشک سے دیکھ رہے تھے۔ ”کیا تمہارا رشتہ دار ہے بریگیڈیئر جنرل۔ تمہارے خاندانی مراسم ہیں۔ تم اس کی بیوی کے رشتہ دار ہو۔ اس نے تمہیں مدعو کیا ہے۔ بہت قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے تمہارا۔“ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ”ہاں۔“ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”میرا مسز فورڈ سے بہت قریبی تعلق ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔“ لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگے۔

میرے پاس تین دن تھے۔ تین دن بعد مجھے فرنٹ لائن پر جانا تھا۔ جہاں سے لوٹ کر آنا کسی کے اعتبار میں نہیں ہوتا۔۔۔ اسی رات ٹپٹے ٹپٹے اور سگرٹیں پھونکتے پھونکتے میں نے فیصلہ کیا کہ میں نے بے عزتی کی زندگی کے ساتھ برس آنکھیں بند کر کے گزار دیے مگر زندگی کے اس موڑ پر جب مستقبل کا یقین کچھ نہیں اور موت کی سرحد اتنی قریب ہے جتنی پہلے بھی نہ تھی اور میرے سارے خواب امیدوں کے سراپ ہیں۔ میرے لیے کرنل فورڈ کو قتل کر دینا سب سے آسان ہے۔ بریگیڈیئر جنرل فورڈ سے میری کوئی عداوت نہیں مگر کرنل فورڈ میری محبت کا اور میرے بچے کا قاتل ہے جسے معاف کرنا میرے بس میں نہیں۔ مجھے کسی عدالت کے پاس انصاف کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔ مدعی اور متعصف میں خود ہوں۔ اگلی رات میں نے اپنا سروس ریوا اور جیب

اس کی یہ مقبولیت میں نے سات سال پہلے بھی دیکھی تھی جب وہ ایک رجمنٹ کو کمانڈ کرتا تھا مگر اس میں یہ اندھی عقیدت شامل نہ تھی۔ شاید یہ میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی کا المیہ تھا۔ موت کا خوف جو ہر لمحے کے ساتھ یوں اگر ختم نہ ہوتا تھا تو کم ضرور ہو جاتا تھا۔ ڈوبنے کو تنکے کا سہارا۔

کرنل جوزف ہیڈلے نے جو رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر تھا اس کا تعارف آفیسرز سے کرایا۔ اس کی صورت دیکھ کر میرے سارے ذہن ہرے ہو گئے تھے اور مجھے اپنی قسم یاد آگئی تھی۔ اس سارے اجتماع میں اکیلا میں تھا جو نفرت کا لاوا دبانے کی آتش فشاں کی طرح کھڑا تھا۔ بظاہر پرسکون مگر اندر ہی اندر کھولتا ہوا۔ میرے سامنے آکر اس کے قدم رک گئے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں مجھے تعجب کے ساتھ عداوت کی مکار چمک نظر آئی جس میں فتح مندی کا غرور بھی تھا اور اپنے حریف کو بے آبروئی کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور کر دینے کی کہین مسرت بھی۔ اس قطار میں کھڑا ہوا کوئی شخص ہمارے نفرت کے رشتے سے آگاہ نہ تھا۔

”کیپٹن ویلس“ وہ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا ”کیا حال ہے تمہارا؟“

”جھینک یو سر۔۔“ میں نے ارد گرد کے آفیسرز سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی مزہ کا کیا حال ہے؟“ یہ سوال بے عمل اور ملٹری ڈسپلن کے ادب آداب کے عین خلاف تھا۔ کرنل جوزف ہیڈلے نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”جین؟“ وہ مسکرایا۔ ”وہ بہت مزے میں ہے تینوں بچوں سمیت۔ کسی دن آؤ وہ تم سے مل کر خوش ہوگی۔“ ایک تیر میرے دل میں ترازو ہو گیا۔ ایک پرانی امید نے دم توڑ دیا جسے میں نے حسرتوں کا لہو پلا کر پالا تھا کہ میری طرح جین اسے بھی چھوڑ جائے

سے لے کر افسر تک اس کے بارے میں عجیب و غریب ناقابل یقین باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ دشمن کو نظر ہی نہیں آتا یا یہ کہ کوئی ناویدہ قوت اس کی حفاظت پر مامور ہے۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھوم پھر آتا ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ اسے دشمن کی ساری پلاننگ معلوم ہو جاتی ہے۔ جب سے اس کے آنے کی خبر گرم ہوئی ہے بریگیڈ کی ہر رجمنٹ کا مورال بلند ہو گیا ہے۔ لوگ فتح کی باتیں کرنے لگے ہیں اور میں نے سنا ہے اس بریگیڈ میں جہاں سے وہ آ رہا ہے سخت مایوسی اور بددی چھلکی ہوئی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کھانا کھانے والے پلیٹ کر بولنے والے کو دیکھنے لگے ہیں اور ہال میں مکمل خاموشی ہے۔ ”میں آج بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں تھا۔“ ایک میجر نے کہا۔ ”وہاں جوان ہی نہیں افسر بھی جذباتی ہو رہے تھے اس کو رخصت کرتے ہوئے۔ جب میں واپس آیا تو اس سے ملنے والے کسی ڈسپلن کا خیال کئے بغیر حکم چل کر رہے تھے اور ان میں سے کچھ دورے تھے۔“

”میں نے اپنی زندگی میں کسی کمانڈر کی یہ مقبولیت نہیں دیکھی۔“ میری میز پر بیٹھے ہوئے ایک کیپٹن نے مجھ سے کہا۔

تھری چیز فار دی نیو بریگیڈ کمانڈر۔۔۔ کسی نے اچانک جام اٹھا کر کہا۔ بہت سے ہاتھ بلند ہوئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا جام اٹھا لیا مگر لیوں تک لے جانے سے قبل ہی اسے فرش پر دے مارا۔ دوسرے دن وہ پہنچ گیا۔ اس نے ہر رجمنٹ کا دورہ کیا اور ہر جگہ اس کا استقبال یوں ہوا جیسے وہ دشمن کی شکست کے بعد جشن فتح میں شرکت کے لیے پہنچا ہے۔ لوگ دیوانہ وار اس سے مل رہے تھے اور وہ بڑی شاہانہ چال سے مسکراتا ہوا دو انگلیوں کی مدد سے چرچل کی طرح فتح کا نشان بنائے گزر رہا تھا۔

گنگنا تے ہوئے۔ گولیاں اور گولے سب ان کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔“

”بلکہ سیلوٹ کرتے ہیں۔“ کسی نے لقمہ دیا۔

”اور ان کے قدموں میں گر پڑتے ہیں۔“ کچھ لوگ ہنس پڑے۔

”ہنسنے کی بات نہیں۔ یہ سب ایک ہی بات کرتے ہیں۔ ابھی وہ گولی بنی ہی نہیں جو میرے لیے ہو۔“ کیپٹن نے نقل اُتارتے ہوئے کہا۔

”پلیٹ پروف جیکٹ پہن کر اور پلیٹ پروف کار میں بیٹھ کر اور زیر زمین کسی کمرے میں میز پر میدان جنگ کا نقشہ بھا کر کافی پی لینے کے بعد ہر شخص یہ بات کہہ سکتا ہے۔“ لیفٹیننٹ نے فحشی سے کہا۔ ”جنگ کی باتیں کرنے والے اور جنگ کرنے والے میں بہت فرق ہے۔ وہی جو شاطر میں اور شطرنج کے مہروں میں ہوتا ہے۔ مرتے صرف مہرے ہیں۔ تقدیر کی کیا بات ہے اس میں۔“

”تم نہ مانو لیکن ہماری ہائی کمان بھی تقاریر کی بالادستی تسلیم کرتی ہے۔ تم بریگیڈیئر جنرل فورڈ کی پوسٹنگ کی وجہ جانتے ہو؟“

میرے کان فورڈ کے نام پر کھڑے ہوئے۔

”کیا وہ اس لیے آ رہا ہے کہ شکست کو فتح میں بدل دے گا؟“ لیفٹیننٹ ہنسا ”اپنی تقدیر سے۔“

”ہاں تم دیکھ لو گے۔ میں عالم غیب نہیں مگر میں اس کے گزشتہ دو سال کے ریکارڈ سے واقف ہوں۔ وہ جہاں جاتا ہے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ میں چھ مہینے اس کے ساتھ رہا ہوں اور اسے یقینی شکست کو عملی فتح میں بدل کر ناممکن کو ممکن کرتے دیکھا ہے۔

اور وہ کبھی زیر زمین نقشہ بھا کر نہیں بیٹھتا۔“

”وہ ہمیشہ میدان جنگ میں موجود رہتا ہے۔ اس کی ستاروں والی جیب ہر جگہ جھنڈا لہرائی پھرتی ہے۔ یہ بات سارے بریگیڈ میں مشہور ہے اور سپاہی

میں رکھا اور بریگیڈیئر کمانڈر کی سرکاری رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھ سے ملنے سے انکار نہ کر دے میں نے اپنا نام کرنل جوزف ہیڈلے بتایا اور اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی حیرت پر جلد قابو پا لیا۔ ”تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تمہیں سب کے سامنے مدعو کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”میں ابھی گاڑو کو طلب کر کے تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔“

”اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اپنی بیوی والیوں لینے آیا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں نے ابھی تک اسے طلاق نہیں دی ہے اور ایک شادی شدہ عورت سے شادی کرنا جرم ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مزید کہا۔ ”تمہاری عزت اور تمہارا یہ عہدہ میرے رحم و کرم پر ہیں۔“

”میں تمہیں شوٹ کر سکتا ہوں۔ گاڑو جاننے ہیں کہ تم کرنل جوزف ہیڈلے کا نام بتا کر اندر داخل ہوئے ہو۔“

”تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے ریوالور نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ سائینس کی وجہ سے آواز گاڑو تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے علاوہ کسی کو بھی کیپٹن ویلس کی آمد کا علم نہیں ہے۔ صبح مجھے فرنٹ لائن پر چلنا ہے اور موت کا خوف میرے لیے کوئی چیز نہیں۔“

”آئی سی۔“ وہ بیٹھے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے قتل کرنے کی نیت سے آئے ہو، صرف بیوی مانگتے نہیں۔“

”بیوی تو وہ میری ہے۔ اسے میں تمہارا خون کئے بغیر بھی لے جا سکتا ہوں اور اگر وہ انکار کر دے تو اسے گولی مار سکتا ہوں لیکن میرا اصل مقصد تمہیں سزا دینا ہے۔ تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ تم نے بلاوجہ مریم پر شک کیا اور اسے طلاق دی۔ انتقاماً میری بیوی کو مجھ سے بدظن کیا اور اپنی پوزیشن کا فائدہ

اٹھاتے ہوئے اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا۔ اس سے ناجائز تعلق قائم کیا اور میرے پہلے بیچے کے قتل کا سبب بنے۔ تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟“

وہ ہنسا۔ ”تم واقعی وکیل ہو۔ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی صفائی پیش کرنے کا فائدہ بھی کوئی نہیں۔ تم نے سات سال میں ایک فیصلہ کیا ہے۔ اسے سات منٹوں یا سات گھنٹوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے اس وقت دشمن کے مقابلے میں ہماری پوزیشن کیا ہے؟“

”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ میرا اور تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اپنے جرائم کا اقرار کرتے ہو یا نہیں۔“ میں نے ریوالور اٹھایا۔

”کیپٹن ویلس۔ کیا ذاتی معاملات اتنے اہم ہوتے ہیں۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”یہ ذاتی معاملات سات برس تک کہاں تھے اور آج اس وقت جب اس محاذ پر سینکڑوں افراد کی زندگی اور موت کا سوال ہے ان معاملات کو اتنی اہمیت دینے کی کیا تک ہے۔ اگر تم اتنے ہی خود غرض تھے تو فوج میں شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ یہی میں کہتا ہوں۔ یہ تمہارے لیے ایک سات سال پرانا جھگڑا طے کرنے کا وقت ہے۔ میرے لیے یہ پرسوں کے حملے کی منصوبہ بندی کی تفصیلات طے کرنے کا وقت ہے جس پر فوج و شکست کا دارومدار ہے۔ آج اور کل میں مجھے وہ فیصلے کرنے ہیں جن پر ان تمام افراد کی زندگی اور موت کا انحصار ہے جو مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں جنہیں میری موجودگی ہی حوصلہ عطا کرنے کے لیے کافی ہے لیکن تم ایک معمولی کیپٹن تم اپنی ذات سے آگے نہیں سوچتے کیونکہ تمہاری کوئی ذمہ

”لیس سر“ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دیتے ہوئے کہا۔ یہ یقیناً اس کی کوئی نئی چال تھی۔ ”تم صبح جگے رہو پورٹ کرو گے۔ تم چاہو تو ابھی اپنا سامان لا سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔ وسیع کمرے میں دوسرے سینئر آفیسرز بھی موجود تھے۔ دیواروں پر لمبے چوڑے نقشے چیلے ہوئے تھے اور وہ سب اگلے دن کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ فورڈ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”نہیں سر۔“ میں نے سلیوٹ کیا اور باہر نکل آیا۔ تقدیر نے ایک بار پھر یادری کی اور غیر متوقع طور پر اگلے دن بریگیڈ نے پیش قدمی کی۔ میں بریگیڈ جنرل فورڈ کے ساتھ جپ میں رہا اور اس کی ساری منصوبہ بندی کی تفصیلات کا جائزہ لیتا رہا۔ بریگیڈ دشمن پر مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا مگر فورڈ زبردست گولہ باری کے باوجود پورے محاذ جنگ پر گھومنا رہا۔ ہر مورچے پر پہنچا۔ جوانوں سے لے کر افسروں تک سب کے پاس جا کر ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور ہدایات جاری کرتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے ارد گرد لوگ مر رہے ہیں۔ ان کی لاشوں پر سے ٹینک گزر رہے ہیں۔ فضا میں چلتے ہوئے گوشت کی بو کی اور بارود کا دھواں تھا اور توپوں کی گھن گرج میں زخمی ہونے والوں کی چیخ و پکار شامل تھی مگر میں محفوظ تھا۔ میں نے اپنے متعدد ساتھیوں کو مرتے اور تڑپے اور دھوئیں میں تحلیل ہوتے دیکھا اور گزر گیا۔ اس خوش نصیبی کی بناء میں جو فورڈ کی ہمرکاب تھی۔ موت اس کے راستے سے خود بخود جارتی تھی۔ گولیوں اور گولے اسے راستہ دے رہے تھے۔ شام تک دشمن پسپا ہو چکا تھا۔ میدان جنگ لاشوں سے چھاپڑا تھا مگر فورڈ اسی طرح گشت پر تھا۔ فتح مند سپاہی اس کا راستہ روک رہے تھے۔ اس کا ہاتھ چوم رہے تھے۔ زخمی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ اسی طرح دو انگلیاں اٹھائے فتح کی علامت بنا ان سب سے مل رہا تھا۔

جذبات کا شکار تھا۔ شاید مجھے اس کو مار دینا چاہیے تھا۔ وہ موقع جب میں انتقام لے سکتا تھا میں نے گنوا دیا۔ شاید یہ انتقام یوں بھی بے مقصد تھا۔ جین اگر میرے ساتھ رہنے پر رضامند ہی نہیں تو مجھے اس کے لیے زندگی کی بازی لگانے سے کیا فائدہ۔ حرامی ہی کبھی مگر ایک عورت کے تین بچوں کے وجود کو اب کیسے بھٹایا جاسکتا تھا۔ وہ وقت گزر گیا جب میں بے قدم اٹھتا تو غلط نہ ہوتا لیکن اب 7 سال بعد ان حالات میں اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ کیا جین کے سوا دنیا میں میرے لیے کوئی عورت نہیں رہی جو میں اپنی زندگی کے شاندار مستقبل کو قربان کروں؟ جین جیسی عورت کے لیے الیکٹرک چپڑے پر جابٹھوں؟ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیوں نہ اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ میں ذلت اور رسوائی سے لوں۔ فورڈ کو جرم بنا کر عدالت کے کٹھن پر میں کھڑا کروں جہاں اسے دنیا کے سامنے ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلق کو تسلیم کرنا پڑے۔ میں نے جین کو طلاق ابھی تک نہیں دی تھی۔ جین کے تین بچے بریگیڈ یئر جنرل فورڈ کے جرم کا زندہ ثبوت تھے۔ اس کی ساری ٹیک نامی اور شہرت اور عزت، اس کا عہدہ اور اس کا مستقبل سب اس جرم کی سزا کے بعد ختم ہو جانے لازمی تھے اور سزا سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں جین کو طلاق دے کر کہیں بھی شادی کر سکتا تھا۔ میری ترقی کے روشن امکانات تھے۔ میرے لیے فورڈ کو قتل کرنے سے کہیں بہتر یہ طریقہ تھا کہ میں اسے سات سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھوں اور اس کی ذلت کا تماشا دیکھوں۔ اسی شام مجھے بریگیڈ یئر ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ ایڈجوئنٹ نے مجھے باضابطہ طور پر فورڈ کے سامنے پیش کیا ”کیپٹن ویلس“ فورڈ نے کہا ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تاہم جانی تم میرے ایڈی کا ٹنگ کے فرائض سرانجام دو گے۔“

مارے گئے تو کیا مگر پرسوں جب اس بریگیڈ کے لیے ہتھیار ڈالنے کا وقت آئے تو مرنے والوں کو اور ذلت کے ساتھ گرفتار ہونے والوں کو شمار کر لیتا۔ اگر تم زندہ رہو تو۔“ چند سینکڑ خاموشی میں گزر گئے پھر اس نے میرے سامنے سے ریو اور اٹھالیا۔ ”فوجی قانون کے تحت بناوت کی سزا موت ہے اور میدان جنگ میں کورٹ مارشل نہیں ہوتے۔ تم نے بریگیڈ کمانڈر کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا میں گارڈ کو بلا کر تمہیں فائرنگ سکواڈ کے سامنے بجا دوں؟“ وہ ہنسا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ریو اور میرے سامنے پھینک دیا۔ ”اگر میرے اور تمہارے درمیان ذاتی عداوت نہ ہوتی تو میں بھی کرتا لیکن میں تمہیں ان معاملات کو طے کرنے کا موقع دوں گا جیسے بھی تم چاہو گے۔ جین سے بات کرنا چاہو تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا اور براہ راست مجھ سے مقابلہ چاہو تو کسی تیسرے کو خبر نہیں ہوگی مگر ابھی نہیں۔۔۔ ابھی ہم دونوں کے لیے کوئی عورت نہیں فرض اہم ہے۔ بشرط زندگی ہم اس معرکے میں کامیاب ہونے کے بعد بھی اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو کیونکہ مجھے کٹرل جوزف ہیڈ لے سے پرسوں کے حملے کی تفصیلات پر بحث کرنی ہے۔ وہ آنے ہی والا ہے۔“ پھر اس نے گھٹنی بجائی اور ایک اردلی اندر آگیا۔ ”کیپٹن ویلس کو شاف کار میں آفیسر زمیں تک پہنچا دو۔“

”لیس سر“ اردلی نے سلیوٹ کیا اور ایک بار پھر میں پٹے ہوئے مہرے کی طرح باہر نکل آیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میں نے اپنی قسم توڑی نہیں ہے صرف اسے تین دن کی مہلت دی ہے تاکہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔ وہ رات اور اس سے اگلا دن میں نے شدید کرب میں گزارا۔ مجھے اپنے کئے پر ندامت بھی تھی اور افسوس بھی۔ میں متضاد

داری نہیں۔ تمہاری زندگی یا موت کسی کے لیے اہم نہیں۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تمہارے لیے ایک عورت اتنی اہم ہے؟ وہ عورت جو یوں بھی تمہارے ساتھ رہنے پر رضامند نہیں۔ جو آئندہ بھی تمہارے ساتھ نہیں رہے گی۔ میری موت کے بعد بھی۔ خواہ تم اسے بھی قتل کر دو۔“

میں نے محسوس کیا کہ میرا ارادہ کمزور پڑ رہا ہے۔ ریو اور میرے سامنے پڑا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھ میں اٹھانے کی ہمت نہیں۔ ”کم آن۔ چلاؤ گولی۔ میں جین کو بھی بلا لیتا ہوں۔ اسے بھی مار دو۔ میں اپنے تین بچوں کو بھی بلا لیتا ہوں۔ وہ تینوں بچے بھی کیوں زندہ رہیں اور میں تمہیں ایک تحریر لکھ دیتا ہوں کہ میں نے سب کو مار کر خودکشی کر لی لیکن مجھے بتاؤ کہ کیا میری جگہ آنے والا اس بریگیڈ کو اس بریگیڈ کے ہرجان کو اور ہر افسر کو وہ امید اور وہ حوصلہ عطا کر سکے گا جو جانے والا بھی نہ کر سکا۔ میں اپنا پلان بھی چھوڑ جاتا ہوں مگر کیپٹن ویلس! نہ پلان اور نہ کوئی بریگیڈ کمانڈر بلکہ میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی کا مورال فتح کی ضمانت بنتا ہے۔ کیا جان بھٹیلی پر رکھ کر جانے والے کو زندگی کی امید سے بھی محروم کر دینا چاہیے۔ وہ امید جو اسے خدا کے بعد کمان کرنے والے پر اعتماد سے ملتی ہے۔ مجھے غرور نہیں فخر ہے کہ میں نے ہر محاذ پر لڑنے والوں کو ناقابل شکست یقین بخشا ہے اور کامیابی حاصل کی ہے۔ ان دونوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اس عورت کا خیال نہیں آیا جس کی خاطر تم مجھے قتل کرنے آ گئے ہو۔ میں نے اپنے بچوں کی صورت نہیں دیکھی۔ ایک منٹ کے لیے سویا نہیں اور صرف کافی پی ہے اور تم باسٹرڈ تم کھا کر سو رہے ہو۔ ہم پانچ افراد کو مار دو۔ تین بچے ایک مرد ایک عورت اتنی بڑی جنگ میں

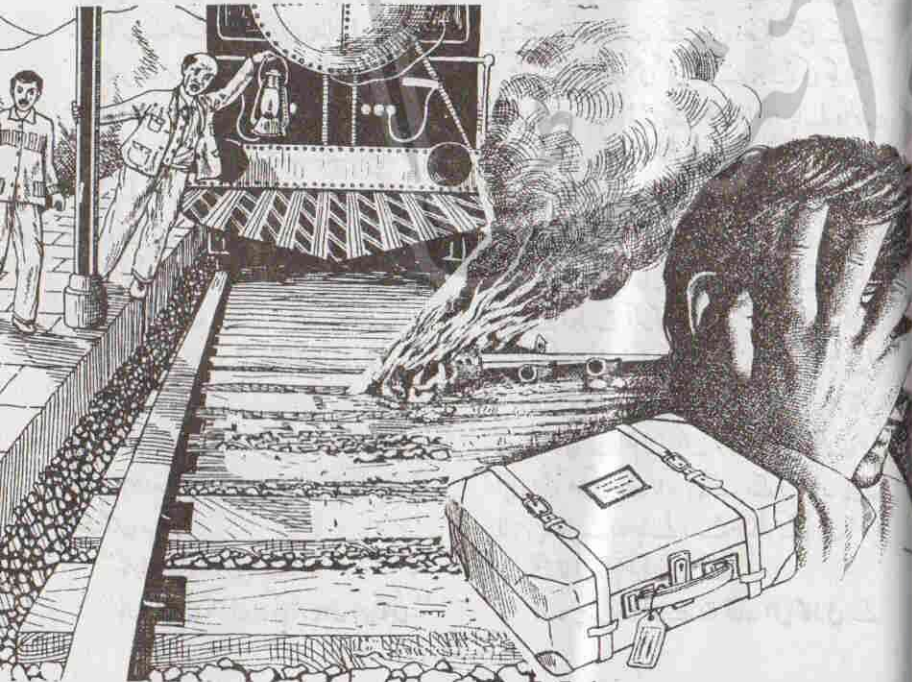
صبح کے خوش نصیب

پنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پر کھل رہی تھیں۔ سوار ہوتے وقت تو وہ انہیں بڑی نعمت نظر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا، کتنی دھکم پیل کے ساتھ وہ گاڑی میں گھس رہے تھے اور سیٹ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اُلٹھ رہے تھے۔

فطرت کی مصلحت سے بے خبر تقدیر کے شاک کی خوش بختی کا ماجرا

گاڑی حرکت میں یا تو آئی ہی نہیں، آئی تو بس اس قدر کہ پیسے مشکل سے تھوڑا گھوڑے اور ڈبوں کو تھوڑا جھٹکا لگا مگر پیسے پورا چکر لینے سے پہلے ہی ٹک گئے اور گاڑی ایک تھرتھری کے بعد پھر ساکت ہو گئی۔ مسافر بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر پہلو بدلا۔ کوئی بے زار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترے اور پڑی

ہم لوگ بیچ جنگل میں تھے اور گاڑی رُکی کھڑی تھی۔ کتنی مرتبہ گمان ہوا کہ گاڑی اب چلی مگر نہیں چلی۔ کتنی مرتبہ گاڑی سے باہر نکھرے ہوئے مسافر سیٹی دیتے انجن سے اشارہ لے کر لپک بھپک واپس اپنی اپنی نشست پہ آئے اور دم سادھ کر بیٹھ گئے کہ اب گاڑی چلے گی۔ دم سادھے بیٹھے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آتی ہے۔



سزائے موت قبول کرنے کو گھاٹے کا سودا سمجھتا ہوں۔ میں تم سے قانونی طور پر انتقام لے سکتا ہوں کیونکہ جین ابھی تک میری بیوی ہے۔“

اس نے اچانک ریوالتور اٹھا لیا۔ ”یہ تم نہیں کر سکتے ویس۔ میں تمہیں اپنی زندگی ختم کرنے کا موقع تو فراہم کر سکتا ہوں مگر اس نیک نامی کے عوض بدنامی مول نہیں لے سکتا۔ میں عزت سے مر سکتا ہوں۔ بے عزتی کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر وہ جیب کی طرف بڑھا اور ایک دستی بم اٹھا لیا جو پچھلے حصے میں دوسرے اسلحے کے ساتھ رکھا تھا۔ ”جیب میں بیٹھو۔“ اس نے مجھے حکم دیا۔

”تم کیا کیا چال چل رہے ہو فورڈ۔“ میں نے کہا مگر وہ ریوالتور لیے خاموش کھڑا رہا۔ میں جیب میں بیٹھ گیا۔ ”میں بیس تک گنوں گا۔ تم اس عرصہ میں جیب لے کر جاسکتے ہو۔ یہ رپورٹ کرنے کے لیے ایک بارودی سرنگ پر قدم رکھ کر مارا گیا۔“ میں نے کانپتے ہاتھوں سے جیب سٹارٹ کی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دستی بم پھینکے گا تو میرے ساتھ جیب کے پرچھے اُڑ جائیں گے لیکن میرے وہاں کھڑے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ بیس گز۔ چالیس گز۔ پچاس گز دور پہنچ کر میں نے دھماکے کی آواز سنی اور جیب روکی۔ اس کی ناقابل شناخت لاش ابھو میں ترپڑی تھی مگر کندھوں پر بریگیڈیز جنرل کے رینک کا نشان ہنوز جگمگا رہا تھا۔ وہ جو اپنے بریگیڈیز کو کُچ سے ہسٹنا کرانے کے بعد زخمیوں کی اور مرنے والوں کی خبر گیری کرتے ہوئے ایک بارودی سرنگ پر سے گزرا اور شہید ہو گیا۔ موت نے اس کی عزت میں اتنا اضافہ کیا تھا جتنا اس کی زندگی نے نہ کیا تھا۔

مجھے اس نے پھر مات دے دی تھی۔

انہیں مبارکباد دے رہا تھا۔ ان کی بہادری کو سراہ رہا تھا۔ جگہ جگہ اپنی جیب روک کر وہ زخمیوں کو حوصلہ دیتا تھا اور اپنے ہر سپاہی کی لاش کو غور سے دیکھتا تھا۔ الٹی سیدھی، شکستہ، ناقابل شناخت لاشیں۔

”کیا تم جانتے ہو؟“ ایک جگہ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اگر آج تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو کہیں نہ کہیں تمہاری لاش بھی دیکھنی پڑتی مجھے۔“ ڈرائیور نے چونک کر اپنے بریگیڈیز جنرل کی طرف دیکھا۔ فورڈ کا چہرہ جگمگایا۔ ”جیب روکو۔“ اس نے کہا۔ ڈرائیور نے جیب روک لی۔ ”ڈرائیور کو صرف سامنے دیکھنا چاہیے۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری سزا یہ ہے کہ ڈبل مارچ کرو اور ایڈجوئنٹ کورپورٹ کرو۔“

”لیس سر“ ڈرائیور نے سلیوٹ کیا اور دوڑتا ہوا روانہ ہو گیا۔ فورڈ نے خود جیب سنبھال لی۔ ہم سیدھے چلتے گئے یہاں تک کہ دشمن کے ویران مورچے پیچھے رہ گئے۔ ایک درختوں کے جھنڈ میں اس نے گاڑی روک لی۔ ”اب ہم اپنے ذاتی معاملات طے کر سکتے ہیں۔“ وہ اترتے ہوئے بولا۔ میرے اترنے سے پہلے وہ ریوالتور نکال چکا تھا۔

”مجھے تم سے اسی کہنے پن کی امید تھی۔“ میں نے کہا۔ ”تم کوئی چلا سکتے ہو میں بالکل نہتا ہوں۔“ وہ ہنسا اور اس نے ریوالتور میری طرف پھینک دیا۔ ”میں ہر اس جرم کا اقبال کرتا ہوں جو تم سمجھتے ہو میں نے سات سال پہلے کیا تھا۔“ میں بھونچکا رہ گیا۔ ریوالتور زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میرے قدموں میں۔ ”تمہارا کیا خیال ہے فورڈ میں تمہیں قتل کر کے زندہ رہ سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”لیکن تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔“ وہ بولا۔ ”کیا اس سوال کا جواب دو دن پہلے تمہیں معلوم نہ تھا۔“

”معلوم تھا لیکن ان دو دنوں میں میرا فیصلہ تبدیل ہو گیا ہے۔ میں جین جیسی عورت کے لیے

پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کسی نے پٹری کو پار کیا اور درختوں کے سائے میں جا بیٹھا۔

”امی، گاڑی کیوں نہیں چلتی؟“ بچے نے پور ہو کر ماں سے سوال کیا۔

”چلے گی۔“

”کب چلے گی؟“

”بس ابھی چلے گی۔“

مگر وہ کم سن ماں سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے سنا اور باہر جھانکنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے کود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔

جب وہ نہ مانا اور سینے پر دست درازی کرنے لگا تو اس نے تمیز کا دامن اٹھا کر بچے کا منہ اندر کیا اور دامن گرا لیا۔ تمیز کا دامن اس نے اتنی چابک دستی سے اٹھایا

کہ پیٹ کے ایک بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر، اس سے اتنا چتا تو چل ہی گیا کہ اس

جگے لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو بڑی یکسوئی سے اخبار پڑھ چلے جا رہے

تھے، بالآخر پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور بڑبڑائے۔ ”بہت دیر ہو گئی۔ آخر

گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟“

”کوئی کراسنگ ہوتا ہے۔“ قریب میں بیٹھا ہوا بریف کیس والا آدی بولا۔

”میرے خیال میں تیز گام آ رہی ہے۔“ دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

”تیز گام؟“ بریف کیس والے نے کلائی پر لگی خوبصورت کھڑی کو دیکھا۔ ”تیز گام کا تو یہ وقت نہیں ہے۔“

”پھر اور کوئی گاڑی ہوگی۔“

”اصل میں پنجر کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ چیونٹی کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پر رکتی ہے۔“

پنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پر کھل رہی تھیں۔ سوار ہوتے وقت تو وہ انہیں بڑی نعمت نظر آ رہی تھی۔

پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا، کتنی دھکم پیل کے ساتھ وہ گاڑی میں گھس رہے تھے اور سیٹ لینے کے لیے

ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ جو

اندرا داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے، جو باہر رہ گئے وہ سر توڑ کوشش کر

رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے اپنے ڈبے

کے دروازے بند کیے تھے اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھولائے تھے اور

سامنے آنے والوں کو دھکے دیتے ہوئے بستروں اور بکسوں کو پھلانگتے ہوئے نشست کی تلاش میں

بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کتنی دھیمکا ہشتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی اور کبھی محض کھڑے ہونے کی جگہ میسر

آئی۔ پھر جب گاڑی چلی تو ہم سوار ہو جانے والوں نے اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب اور پیچھے رہ جانے

والوں کو کتنا بد نصیب جانا تھا۔ پھر کیا یک پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہمارے ہاں کتنی ہمدردی کا

جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے دوڑتے اگر کوئی ہینڈل پکڑے لٹک گیا تو

کسی نہ کسی نے جلدی سے اس کے لیے دروازے کو کھولا اور اسے اندر آنے کی راہ دے دی۔ پھر چلتی

ہوئی گاڑی سے ہم نے اک گونہ اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ پلیٹ

فارم پر کھڑے رہ جانے والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابلِ رحم نظر آ رہے تھے۔

اب پیہہ اٹنا گھونٹا لگا تھا۔ اس گاڑی کے

جب دھواں اُٹھتا ہے تو اس کی بات اور ہوتی ہے، فضا میں کالوچ کی ایک کیر کھینچتی اور فٹی چلی جاتی ہے مگر جب کھڑا ہوا انجن دھواں اُٹھتا ہے تو فضا کی پاکیزگی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

انجن نے دھواں اُٹھتے اُٹھتے ایک دفعہ پھر سیٹی دی۔ اتنی تیز کہ پورے جنگل میں گونج گئی۔ ہم

مسافروں کے دل جیسے سیٹی کی آواز سے گرما گئے ہوں، وہ جو ایک بیزاری چھائی ہوئی تھی وہ کافور ہو گئی۔ ہم سبھی مستند اپنی نشست پہ بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ گاڑی بس حرکت میں آنے والی ہے۔

بیٹھے رہے، بیٹھے رہے، پیہوں نے بالکل پہلے کی طرح ایک ہلکی سی جنبش کی تھی اور اس سے ایک

تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی جیسے پیہوں کو گردش کرنے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی

سکتہ اور اب تو دھواں کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کالے سے بھورا ہوا اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گیا۔

جب گاڑی کسی طور پر حرکت میں نہ آئی تو پھر وہی بے زاری۔ بڑے میاں نے پور ہو کر پھر اخبار

اٹھایا اور پڑھی ہوئی خبروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے بیزار گود میں بچہ پھر کلبلیا اور عورت نے اس

مرتبہ اتنی بیزاری اور بے پروائی سے تمیز اوپر اٹھائی کہ دم بھر کے لیے تو پیٹ سے اوپر کا ہرا بھرا منطقہ

بھی نمایاں ہو گیا۔

”گاڑی آج نہیں چلے گی۔“ کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

”امی، گاڑی نہیں چلے گی۔“ کم سن لڑکے نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”چلے گی بیٹے۔“

”کب چلے گی؟“

”بس تھوڑی دیر میں چلے گی۔“

کم سن لڑکے نے بے اعتباری سے ماں کا

مسافر ہونے کی بنا پر ہم اپنے آپ کو کتنا بے آسرا کتنا قابلِ رحم سمجھ رہے تھے اور وہ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے؟ اچھے رہے وہ لوگ جو اس گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے رہ گئے۔

”میری سیٹ تو جہاز میں بک تھی۔“ بریف کیس والا بولا۔ ”لیکن پروگرام میں تبدیلی کی وجہ

سے مجھے اپنی سیٹ کینسل کرانی پڑی۔ اس کے بعد کسی فلائٹ میں کوئی سیٹ نہیں ملی۔ سوچا کہ ٹرین

پکڑی جائے۔ تیز گام، سوپر، کسی میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر کو پنجر میں بیٹھنا پڑا۔“

ایک دفعہ پھر مسافر تیزی کے ساتھ اندر آئے اور اپنی اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔ اصل میں ابھی

ابھی انجن نے سیٹی دی تھی۔

”گاڑی اب چلے گی ہے۔“ کہنے والے کے لہجے میں دبی دبی خوشی کا رنگ شامل تھا۔

”واقتی؟“

”ہاں بس چلنے والی ہے۔ انجن نے سیٹی دے دی ہے۔“

”اللہ تبارک ہے!“

کم سن لڑکے نے جھانک کر باہر دیکھا۔ ”امی، دیکھو۔“

”کیوں، کیا بات ہے؟“

”دھواں۔“ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے بھی باہر جھانکا۔ واقعی انجن نے اچانک کتنے زور و شور سے

دھواں اُٹھنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹی ہی سے نہیں اس دھوئیں سے بھی۔ شاید مسافروں نے یہ اشارہ لیا تھا کہ بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجن کے منہ سے

ایسا کالا دھواں نکل رہا تھا کہ لگتا تھا کہ کوئی دیر جاتی ہے کہ سارا جنگل کالا ہو جائے گا۔ چلتی گاڑی کا انجن



شس بازغ شروانی

سوج کے جزیرے

میراجی چاہا میں اس جہوم سے چلا کر کہوں کہ مت توڑو یہ سرکاری بلڈنگ، یہ ٹریفک لائٹ، یہ سڑک، یہ کھجے کیونکہ یہ تمہارے ہیں۔ یہ تمہارے دیئے ہوئے ٹیکس سے بنے ہیں۔ یہ تمہاری سہولت کے لیے ہیں۔ ٹوٹی چیز دوبارہ جلدی کب بنتی ہے؟

غور کریں والوں کیلئے فکر عمل کی باتیں، جن پر عمل سے معاشرہ بدل سکتا ہے

کام، مہمانوں کو ٹھہرانے، بچی کے سسرال کے معاملے، تقریبات کے انتظامات، دعوت ناموں کی تقسیم، ملبوسات، زیور اور جانے کیا کیا کچھ۔ ایک سلسلہ تھا جس کے سرے اکٹھے کر کے باندھنا تھے۔ یوں تو یہ تمام انتظام مجھے ہی کرنا تھے مگر میں بالکل

جب میری بیٹی زارا کی بات ٹھہر گئی تو پھر اس فرض کی ادائیگی کا مبارک مرحلہ اور اس کی تفصیلات طے کرنے کا وقت آیا۔ شادی پاکستان میں ہونا تھی لہذا تیاری کے لیے میں دو ماہ کے لیے لاہور آئی۔ انتظامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام گھر کی بیننگ کا

”ہاں۔“
”کیا کہتا ہے، گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟“
”آگے گڑبڑ ہے۔“
”میرا خیال ہے۔“ بریف کیس والا بولا۔
”آگے کوئی حادثہ ہوا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر نہیں رُک سکتی تھی۔“
”ہوا تو نہیں ہے۔ ہو جاتا۔“
”اچھا۔“
”ہاں..... اور اسی گاڑی کے ساتھ ہو جاتا۔ وہ تو بروقت پتا چل گیا۔“
”اچھا؟ کیا بات تھی؟“
”آگے پڑی اکھڑی ہوئی ہے۔“
”پھر تو بج گئے۔“
”ہاں یہاں سے نکل جائیں پھر جائیں۔“
ہاں واقعی۔ میں نے سوچا، پہلے یہاں سے تو نکلیں اور اسی کے ساتھ مجھے پھر اس گھڑی کا خیال آیا جب ہم اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساس تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بد نصیب بن چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک وقتی بد قسمتی سے گزر کر خوش قسمت بن گئے اور ہم.....

ہاں اور ہم..... میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ شام کی چھاؤں باہر سے رینگ رینگ کر اندر آگئی تھی، ساتھ ہی اُداسی بھی جو شام کی چھاؤں کی ہم زاد ہے۔ ڈبے میں ابھی لائیں نہیں جلی تھیں۔ اپنی اپنی نشست پہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب مسافر سائے دکھائی پڑ رہے تھے۔

جواب سنا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔
”شام ہو رہی ہے۔“ ایک مسافر نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔
ہاں واقعی۔ وہ صبح و عریض میدان اور کھیت جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں چمک رہے تھے، اب چھاؤں میں آ چکے تھے۔ اور چھاؤں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے اُداسی چمکتی جا رہی ہو۔
”رات کہیں اسی جنگل میں نہ گزارنی پڑ جائے۔“

”اس جنگل کا راستہ تو دن میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گزارنی پڑی تو.....“ وہ کہتے کہتے رُک گیا مگر اس کے تشویش بھرے لہجے نے سب کچھ دیا تھا۔
بڑے میاں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہنے والے کی صورت دیکھی۔ پھر اخبار ایک طرف ڈال کر منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھی۔ پھر انہوں نے بولنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر مجھے اپنے خطاب کے لیے چنا۔

”بیٹے، تم کہاں جا رہے ہو؟“
”یہ سوال بے محل ہے۔“
انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی۔ ”بے محل کیسے ہے؟“
”ہم میں سے کسے کہاں جاتا ہے، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں۔“
”اور نکل بھی رہے ہیں یا نہیں۔“ کسی قریب بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑا لگایا۔

اسی گھڑی گاڑی اپنی سفید وردی میں گزرتا نظر آیا۔ ایک مسافر اسے دیکھ کر پھر پٹی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گیا۔ سب نے اسے بے حس نظروں سے دیکھا۔
”یہ گاڑی تھا؟“

یوں تو یہ تمام انتظام مجھے ہی کرنا تھے مگر میں بالکل بھی تنہا نہ تھی۔ لگتا تھا سارا لاہور میرے ساتھ ہے۔ زارا صرف ہماری نہیں پورے لاہور کی بیٹی تھی جسے سب ہمیں خوشی مل کر رخصت کر رہے تھے۔ کورے دوپٹوں میں رنگ گھل رہے تھے۔ رنگریز ہر مصروفیت پیچھے ڈال کر میرا کام پکڑتے۔ دوپٹے رنگ کی کڑاہی سے نکال کر، دونوں سرے پکڑ کر جب دوپٹے ہوا میں اچھالتے تو فضا میں ایک ترنم سا آجاتا۔ ایک روہم سا پیدا ہو جاتا۔ رنگ کے چھیننے ہر جانب جب پھوار بن کر گرتے تو اپنے کچھ سے محبت کا ایک جھرنہ سادل میں پھوٹ بھٹا۔ رنگریز کے ایک گوندہ قسم کے ساتھ بخوشی یہ کام انجام دیتے۔ ہاتھوں میں تیزی، نظر میں احترام ہوتا۔ مزدوروں میں جو دیا خوشی سے لیا اور دعا دے کر رکھ لیا۔ چپو لے کر مسکرا کر پیسے زیادہ لیے مگر وقت پر کام دیا اور خوب کارگیری سے کیا۔ یوں میں نے بھی اس کی ہلکی ہلکی اپنائیت بھری بے ایمانی سے چشم پوشی کر لی۔

کام کی نفاست و مہارت پر بھی عیش کرنے کو دل چاہتا تھا اور اس سے زیادہ کاریگروں کی فرض شناسی پر، لائٹ والے، پھولوں والے، کیش رنگ کرنے والے لوگ، ہمارے پیارے دوست، احباب، ہمارے اپنے سب لوگ۔ ہوا ہر دم جیسے گانی تھی۔ یہ لاہور کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ پر یہ سب کاریگر صرف لاہور کے نہ تھے۔ پاکستان کی ہر جگہ سے تھے۔ یہ سب ہمارے لوگ تھے۔ بہت پیارے، محبت کرنے والے، فرض نبھانے والے اور آج جب سڑکوں پر وہی مسکراتے، بٹاش چہرے اور حالات سے تنگ آنے والے لوگ پھیرے ہوئے، توڑ پھوڑ کرتے، پراپرٹی کاروں، موٹر سائیکلوں کو جلاتے، ٹرانسپورٹ کا ستیاناس کرتے دکھائی دیتے اور اب بھی دیکھ رہی ہوں تو جہاں ان کے مصائب اور درمائی کا پورا شعور ہے وہاں گھبراہٹ بھی ہے کہ کہیں یہ شہر اب دس

گے، ٹیکسٹریوں پر ٹیکسٹریاں لگائیں گے اور عوام ویسے ہی سہولیات سے محروم، نیم فائدہ سے رہ جائیں گے۔ سرکاری دفاتر، ٹوٹی سڑکیں، جھولتے کھمبے، آپ ہی کے لیے چھوڑ دیے جائیں گے۔

رگ سگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرارہ ہوتا اپنے غم کو شرارہ تو کرتا ہے مگر کسی کا گھر نہیں جلاتا نہ اپنا ہاتھ۔ اپنے حق کی پہچان کے ساتھ فرض کی پہچان بہت ضروری ہے۔ بابا صاحب اشفاق احمد مرحوم نے ایک بار میری نظم بڑھی تو بقلم خود چند نادر الفاظ میری نظم کے نیچے یوں لکھ کر دیئے۔

”زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہی سب سے طاقتور ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے زنجیر توڑ سکتی ہے۔“ اپنی Force کو جیج وقت پر جیج جگہ استعمال کرنا ضروری ہے۔ اپنے ووٹ کے ذریعے احتجاج کرنا سیکھیں یا پھر بیک آواز بولیں، مصریوں کی طرح، تیوں کے لوگوں کی طرح، اپنا حق مانگیں۔

خواب کے اس طرف

ایک نیوز چینل پر گزشتہ سیلابوں میں کسی آبادی پر ایک رپورٹ دکھائی جا رہی تھی۔ آبادی کے مصمتد جوان شکایت کر رہے تھے ”گندگی کھجری ہے کوئی صفائی کے لیے نہیں آیا۔“ میں سوچ رہی تھی ”صفائی کے لیے کوئی خاص مخلوق آیا کرتی ہے؟ اپنے بازو، اپنے ہاتھ استعمال کرو اور مل جل کر اپنی آبادی کو صاف کرلو۔“ یہ جذبہ پیدا کرنا ہے اپنی گلی، اپنا محلہ، اپنا شہر، گلی کا رستہ جو ٹوٹ گیا ہے ٹوٹا مت رہنے دیجئے۔ نالی بند ہوگئی ہے، مل جل کر کھلو لیجئے۔ بچوں کو گھروں میں تربیت دیجئے کہ وہ گلی میں گندگی نہ پھینکیں، نالی میں پھرانڈ ڈالیں۔ کوئی مین ہول کھلا ہے تو پورے اہل محلہ مل کر اسے ڈھانپ دیں۔ کوئی ٹیچر ہے تو شام کی ٹیوشن میں کسی بچے کو فیری ٹیوشن دے دے۔ رہائزہ اہل محلہ اپنے اپنے محلے کے

بچوں کو تعلیم میں مدد دیں۔ بیٹھک لگالیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں پیار کے سے ماحول میں تاریخ کے اوراق انہیں سنائیں۔ اپنے اجداد کی کامیابیاں دہرائیں تاکہ ذہن بھٹکنے نہ پائیں۔ ڈاکٹر ہوں تو ضرورت مندوں کی دہگیری کریں۔ اپنے گھر کی فالتو دوائیں (Valid dates) ڈرگ سٹورز پر رکھوائیں۔ ان سے کہیں کہ وہاں ایک کارٹر بنائیں جہاں ایسی دوائیں رکھی جائیں اور ضرورت مندوں کی مدد کر دی جائے۔ کوئی پیر وزگار ہو گیا ہے، اس کے روزگار کے حصول میں مدد کریں۔ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروا دیجئے۔ کچھ نہ کچھ کیجئے۔ بس آسانیاں ہی باتیں۔ اپنے بچوں پر نظر رکھیں۔ دیر سے گھر آنا، راتوں کو جاگنا، انکی جیب میں فالتو روپے ہیں تو کہاں سے آئے؟ کسی کو لونا تو نہیں۔ ڈاکٹر تو نہیں ڈالا۔ کسی ملک دشمن، امن دشمن تنظیم سے تو نہیں جڑ بیٹھے؟ یہ سب ذمہ داریاں تو ہیں مگر زیادہ بڑی نہیں۔ لیکن ان پر عملدرآمد کے نتائج بہت سی مشکلات پر قابو پانے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ آپ کسی ذہن کی تعمیر میں بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وطن سے پیار کرنے والی ہر آنکھ میرے جیسے یہ خواب دیکھتی ہے۔ خوابوں کے اس طرف کی حقیقت بہت تلخ ہے، بہت پریشان کن ہے لیکن دنیا کی کامیاب قوموں نے ہماری طرح ہی کامیابی کے خواب دیکھے اور پھر عمل کی کٹھن دایوں میں چلے۔ ہمارے اپنے خواب پورے کرنے میں ملت کے ہر فرد کو اپنے ہنر ذات کی پہچان کرنا ہوگی۔ فرض اور عمل کی بجٹی میں جلنا ہوگا۔ کرپشن کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ تعلیم عام کرنے کے لیے لڑنا ہوگا۔ درمند لوگوں کو سکرانی کے لیے چھنا ہوگا۔ جہاد کا مفہوم وسیع تر کر کے بلکہ جہاد سے قتال کو الگ کر کے پیاری، غربت، بھوک، پیر وزگاری سے جہاد کے لیے لکھنا ہوگا۔ ہر فرد کو زنجیر کی کڑی بننا ہو گا۔ ہمیں پاکستان کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی ہوگا۔

شوکت افضل

آخری حصہ

کھلتی ہے آرزو کی کھلی

شوکت افضل صاحبہ حسب معمول ایک یادگار تحریر قارئین کے لیے لائی ہیں جو انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے اور معاشرتی بگاڑ میں بہتری کا جذبہ بھی جگاتی ہے۔ شوکت افضل کی زیر نظر تحریر ایک زندہ دل خوش گفتار لڑکی کی کہانی جس کی زندگی میں آنیوالے نشیب و فراز اسے اک عجیب دورا ہے پر لاکھڑا کرتے ہیں۔ زمانے کی چیرہ دستیوں اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹی ہیں اور بھی انہوں کے چھڑنے اور ذمہ داریوں کا طوق اس کی خوشیوں اور مزاج کی کھفتگی کا قاتل بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے قارئین اُن کی اس تحریر کو بھی پذیرائی بخشیں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

(ایڈیٹر)

ستم ظریفی آرزوؤں، تمناؤں کے محل سمار کر کے رکھ دیتی ہے۔ طارق بے حد ذہین انسان تھا اور ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اب تک کئی مشکل و پیچیدہ گتھیاں سلجھائی تھیں۔ فطری طور پر حالات کی تہہ تک پہنچ جانے کی اس میں بدرجہ اتم صلاحیت تھی۔ جہاں قدرت نے اسے عقل و ذہانت اور آرتھک نیچر دی تھی وہاں اپنی گفتگو سے دوسروں کو پھانسا کر دینے کے علاوہ ایک مقناطیسی متاثر کن شخصیت بھی دی تھی۔ اس کا ذہن ہمیشہ سے منطقی رہا تھا اور وہ کوئی بھی بات عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر تسلیم نہ کرتا تھا مگر آج یہ سب کیا چکر تھا کہ اس کی ہر بات غلط اور بے وزن سمجھی جا رہی تھی۔ اس کی ہر دلیل کھوکھلی تھی اور اس سے اپنی زندگی کی من پسند راہیں چننے کا اختیار بھی جھین لیا گیا تھا جیسے وہ

طارق تمام رات اپنے ہی خلاف صف آرا رہا، جیسے اس کے وجود کے دو گلوے ہو گئے ہوں جو ایک دوسرے کے خلاف سوچ رہے تھے۔ یہ فرض اور محبت کے جذبات کے درمیان کشمکش تھی۔ فرض ماں کی اطاعت کی طرف بلا رہا تھا جو کہ اپنے پندار کی کرچیوں سے لہو لہو ہو کر بستر مرگ پر پڑی تھی اور محبت اسے ان وادیوں کی طرف بھیج رہی تھی جہاں اس کی جان آرزو تھی۔ بہر حال ماں کی خراب حالت کے پیش نظر اب سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اس مسئلے کو چھیز کر پھر سے جھگڑا اٹھایا جائے۔

کچھ لوگ قسمت کو کھلونا سمجھتے ہیں اور کچھ لوگوں کو قسمت کھلونا بنا دیتی ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ وہ کوشش و تدبیر سے حالات و تقدیر کو اپنے حق میں کر سکتا ہے لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلتا ہے۔ قسمت کی



انسان نہ ہو کوئی ڈمی ہو۔ یہ اشرف المخلوقات انسان بھی کتنا چھوٹا اور بچ ہے کہ اپنے گھر کی شان بلند رکھنے اور گھر میں آسودگی کا چراغ جلانے کے لیے دوسروں کے دیے بجھا دیتا ہے۔

دوسرے ویک اینڈ پر جب طارق نے ریٹ ہاؤس پہنچ کر شمسہ کو فون کیا تو سیما نے بتایا کہ شمسہ بہت بیمار ہے۔ وہ چند منٹ بعد ہی جیسے اُڑ کر وہاں پہنچ گیا۔ اتفاق سے شمسہ کی امی گھر پر موجود نہ تھیں۔ شمسہ کو سیما سہارا دے کر ڈرائنگ روم میں لائی اور کٹن کے سہارے صوفے پر نیم دراز کر دیا۔ شمسہ کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اُنھے ہوئے بالوں کی دراز سیاہ لٹیں اس کے کتابی چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ جتنی کی طرح جلتی بجھتی آنکھیں حسرتوں کی ٹو دے رہی تھیں۔ اس نے امید و تپ کے دریا میں غوطے کھاتے ہوئے طارق کے چہرے کو بغور دیکھا مگر وہاں بھی غم و ناامیدی کے سائے رکھنا دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ جدا ہو جانے کا تلخ احساس اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔

”تارے کیا جدائی کی شام آچکی؟“ وہ بھرائی ہوئی حسرت کا آواز میں بولی۔ ”میں تو زندگی کی سونی سونی راہوں میں ایک بے نام پتھر کی طرح پڑی تھی۔ آپ نے ہی اس پتھر کو دل میں گھینے کی طرح جڑ کر اسے وقعت بخشی۔ تو پھر اب میں اس جدائی کے صحرائ میں تنہا جینے کا عذاب کیسے برداشت کر سکوں گی۔ تارے بتلائیے نا..... تو آسمان کا تارہ..... میں ایک زندہ بے چارہ!!“ شمسہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی طرح آنسو برسے لگے۔ آنسو جو قدم قدم گم کا خراج ادا کرتے ہیں۔

طارق نے اس کا زرد چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ انہوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی روح میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اس الوہی احساس کو..... اس

نرم گرم لمس کو..... اس خوبصورت غمزہ چہرے کی شمسہ کو اپنے دل کے آئینے پر نقش کر لینا چاہتا تھا جس چہرے کو دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے کیش کا یہ مصرع پھسل پڑتا تھا۔

"A thing of beauty is a joy
for ever!

اس کی چمچی حس سسک سسک کر اسے کہہ رہی تھی کہ آج کے بعد وہ شمسہ سے کبھی نہ مل سکے گا۔ طوفان ابر و باد میں سب گیت کھو جائیں گے۔ جدائیوں کے تند جھکڑ ہاتھ سے وہ مضرب چھین لے جائیں گے جس پر دو دلوں نے وصل کے آسمانی گیت الاپے تھے۔ وقت کی طوفانی موجوں کے ریلے اپنے ساتھ اس کے سہانے خواب بھی بہا لے جائیں گے۔ اپنی چمچی جس سے طارق نے بھی منطقی بحث نہ کی تھی کیونکہ قدرت کی بخشی ہوئی اس حیرت انگیز قوت نے اس کے ساتھ کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ وہ شمسہ کے ناتواں دل کی مضطرب دھڑکیں سن رہا تھا۔ اس کے غم سے پوچھل دھواں دیتے سانس اس کی سانسون میں سارے تھے۔ مستقبل کے بھینک تصور سے شمسہ کا دل ایک چڑیا کی طرح لرز رہا تھا۔

”اُف قیامت یہ ہے ترک آرزو بھی۔“ طارق کے منہ سے ایک دلدرد آہ نکلی۔ ”میں اس دل مضطرب کو کیونکر سمجھاؤں گا؟“

”تارے!“ شمسہ نے پھر پکارا ”کیا ہماری لگن بچی نہ تھی یا ہمارے جذبے صادق نہ تھے؟ ہم نے تو بڑی شدت سے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ پھر ہمارے استے سچے جذبے بے اثر کیوں رہے؟“

”میرا خیال تھا شمسہ، انسان اپنے حقوق کے لیے بہت کچھ کر گزرتا ہے اس کے لیے میں نے ہر حربہ آزمایا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میری ماں جو ٹوٹ تو سکتی ہے جھک نہیں سکتی، اپنی انا کی شکست کے

بھری نقابت سے کہا۔ تب طارق شمسہ کا ہاتھ تھام کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو اُٹھو پھر۔ تمہاری محبت کا بھی امتحان ہو جائے۔ اگر تم نے اسی وقت میرے ساتھ چل کر شادی نہ کی تو میں بھی تمام زندگی تمہیں بے وفا سمجھوں گا۔ تم اپنی ماں کو چھوڑو، میں اپنی ماں کو بھول جاؤں گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ بعد میں سب خود ہی راضی ہو جائیں گے۔“

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی تارے! میرا تو باپ بھی نہیں جو اسے میرے بغیر سہارا اور حوصلہ دے گا۔ میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ اپنی خوشیوں کے لیے کیسے اسے ڈھکی کر دوں۔“ وہ بچکیوں سے رونے لگی۔

”یا اللہ! یہ کیسی آزمائش ہے میرے مولا!“

”ٹھیک ہے تو پھر میں جاتا ہوں۔“ وہ جانے کے لیے اُٹھا اور اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہوا۔ اس کا ذہن اشتعال انگیز جذبات کے سامنے بے بس ہو رہا تھا۔ سینے میں جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔

”مت جاؤ تارے!“ شمسہ نحیف و نزار آواز میں جیسے بین کرتے ہوئے بولی۔

”مجھ سے ناراض ہو کر مت جاؤ تارے! مجھے کس گناہ کی سزا دے رہے ہو؟“

یگھٹ وہ پلٹا اور شمسہ کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ”میں جانتا ہوں شمسہ! جن حالات کی بھاری سل تلے میں دبا ہوا ہوں، وہی حالت تمہاری بھی ہے۔ ہم دونوں ہی بے بس و لاچار ہیں۔ پر ہم کیا کریں، کہاں جائیں شمسہ؟“

تب ہی سیما نے دروازے پر دستک دی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

ہاتھوں بستر علالت پر پڑی ہے۔ وہ بڑی سخت عورت ہے شمسہ۔ تمام عمر اس نے جو گھر میں چاہا وہی ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ محبت کو عطا نہ خداوندی سمجھنے کے بجائے ایک عظیم تہمت گردانتے ہیں اور اسے رسوائی کا موجب سمجھتے ہیں۔ شمسہ سارے زمانے کو میں ایک دلیل میں جت کر سکتا ہوں لیکن افسوس اگر قائل نہیں کر سکا تو ان ماں بیٹیوں کو..... مجھے تو اپنی ساری زندگی بددعا معلوم ہو رہی ہے شمسہ..... کیا یہ ہے ممتا کی تشریح؟ بات بے بات پر دودھ نہ بننے کی دھمکی۔ پاؤں کے نیچے جنت کا بہلاوا۔ چاہے اولاد کو اس کی تانا شاہی جہنم کا ایندھن ہی کیوں نہ بنا دے۔“

زندگی میں پہلی بار طارق کے بھروسے کو اگر کسی شخصیت سے نہیں پہنچی تھی تو اس کی اپنی ماں تھی۔ وہ پہلی بار نظریاتی اور شکست احساس کی ایسی تلخ حقیقت سے دوچار ہوا تھا جو کسی لحاظ سے زہر بھرے جام سے کم نہ تھی۔ اس کی روح نے تو صدیوں سے شمسہ جیسی لڑکی کے ہاتھ تھامنے کے خواب دیکھے تھے۔

طارق نے شمسہ کے چڑی بندھے نازک ہونٹوں کو دیکھا، مرجھائے چہرے کو دیکھا، اُٹھے ہوئے بالوں کی گھٹاؤں کو دیکھا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر وہ کیا ہو گئی تھی۔ طارق کا جی بے تحاشا امنڈ آیا تھا۔

”میں تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا شمسہ؟“ طارق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ محض جذباتی باتیں ہیں تارے! وقت کی گرد ہر چیز کو دھندلا دیتی ہے۔ دیکھنا کچھ عرصہ بعد تم بھی ہنس کر اپنی بیوی سے اس جنونی عشق کے بارے میں باتیں کرو گے۔ کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ نہ مرنا اتنا آسان ہے۔“ شمسہ نے دکھ

”امی بس آنے ہی والی ہوں گی۔ پلیز اب آپ چلے جائیں۔“

بہن کے الفاظ سنتے ہی شمسہ کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے طارق کا بازو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر طارق کا کندھا بھگونے لگے۔

”شمسہ..... شمسہ! ہوش میں آؤ جان، اب مجھے جانے دو۔“ اس نے شمسہ کو اپنے سے زبردستی علیحدہ کیا تو وہ نیم جان ہو کر اس کے بازوؤں میں ڈھسے گئی۔ اس کے چہرے پر موت کی سی زردی کھنڈ رہی تھی۔ طارق نے اسے آہستگی سے صوفے پر لٹا دیا اور اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے آوازیں دینے لگا۔

”شمسہ! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ آنکھیں کھولو..... شمسہ.....؟“ سیمانے پھر دستک دی تو وہ یکدم گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور شمسہ پر ایک دل کو چیر دینے والی اندوہناک نظر ڈال کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ریسٹ ہاؤس پہنچنے ہی اس نے فون کیا تاکہ شمسہ کی حالت کا پتہ کر سکے۔ فون شمسہ کی امی نے اٹھایا۔ طارق نے سلام کیا تو وہ بولیں۔

”بیٹے! آپ آج ادھر آئے تھے نا۔ میں نے آپ سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ اپنی امی کے بغیر ہمارے گھر میں قدم نہ رکھیں لیکن۔ آپ نے میری غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا۔ پھر بھی مجھے معلوم ہو ہی گیا کہ آپ نے میرا کہنا نہیں مانا۔ بیٹے میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میں اپنے سفید بالوں کا واسطہ دے کر آپ کی منت کرتی ہوں کہ خدا کے لیے ہماری عزت کا خیال کریں۔ ہم بے سکون کے پاس عزت کے سوا اور ہے ہی کیا؟ اگر وہ بھی نہ رہی تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔“

”آنٹی! خدا نہ کرے کہ میں آپ کی بے عزتی

کا باعث بنوں۔ میں کوئی لپا لنگھا نہیں ہوں کہ آپ کی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاؤں۔ میرا بھی معاشرے میں مقام ہے۔ چار آدمیوں میں عزت بھی ہے۔ میں تو صرف یہی چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔ پلیز! مجھے مت ٹھکرائیں آنٹی۔“ طارق نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

”آپ میرے متعلق پوری چھان بین کر سکتی ہیں۔ میرے کریئر کے متعلق، میرے خاندان کے بارے میں، جس سے آپ چاہیں پوچھ لیں۔“

”دیکھو بیٹے! آپ چاہتے ہیں کہ کسی کے آنگن کا پھل دار درخت اکھاڑ کر میں اپنے صحن میں لگا لوں۔ کسی کی آرزوؤں کے کھنڈر پر اپنا محل تعمیر کر لوں؟ نہیں بیٹے، میں اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی۔ ماں وہی صحیح معنوں میں ماں ہو سکتی ہے جو بچے کو جنم دیتی ہے، پالتی ہے، جوان کرتی ہے، تو کیا پھر اس کا اتنا حق بھی نہیں ہوتا کہ اس کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے؟ ماں باپ دشمن نہیں ہوتے بیٹے! انہوں نے آپ کے مستقبل کے لیے بہتر ہی سوچا ہو گا اور آپ کے لیے اس وقت تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ لوٹ جاؤ بیٹے اپنی بیمار اور دل شکستہ ماں کے پاس اور وعدہ کرو کہ پھر شمسہ سے نہ ملو گے۔“

”مگر شمسہ کی بھی تو حالت دیکھیں نا آنٹی! اسے کچھ ہو جائے گا تو میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔“ طارق نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ اندر ہی اندر ابھرنے والے آنسوؤں سے اس کا گلا بھرتا جا رہا تھا۔

۔ مار ہی ڈالے بے موت یہ دنیا وہ ہے ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہنر رکھتے ہیں امی نے سرد آہ بھر کر جوابا کہا۔ ”شمسہ ایک بہادر لڑکی ہے بیٹے۔ باپ کی موت کے صدمے سے زیادہ اور بڑا بحران کیا ہو گا۔ ایک جیتی نازوں پلی

چھوڑ کر چلے گئے ہو ابو.....؟ کیوں.....؟
کیوں؟ کیوں؟“

شادی کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔ رخسانہ
فرزانہ کئی دفعہ طارق کو اندر بلانے آ چکی تھیں مگر وہ
انگلیوں میں سلگتا سگریٹ لیے خاموشی سے صوفہ پر
نیم دراز رہا۔ جب تھک ہار کر سب لوگ اپنے اپنے
کمروں میں چلے گئے تو وہ اٹھا، گھڑی دیکھی، رات
کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ نیند آنکھوں سے
دور تھی اور طبیعت میں ایسی وحشت تھی کہ اس کا جی
چاہتا تھا سڑک پر آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہو۔
بادل خواستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے
کھولتے ہی اسے اپنا کمرہ اجنبی معلوم ہوا۔ اس کی
بیوی رخشندہ کپڑے تبدیل کر کے گہری نیند سو چکی
تھی۔ زرتار لڑکیوں اور بچپتی ہوئی پھولوں بھری بیج
اسے اپنی طرف بلانے لگی مگر اس بیج پر وہ نہیں تھی
جس سے اس نے بیان وفا باندھا تھا اور پھر یہاں
تھا بھی کون جو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے
بیڑاری سے سر جھکا اور ہاتھ روم سے ملحقہ دوسرے
بیڈ روم میں سونے کے لیے چلا گیا۔ سرہانے کی
کھڑکی کھول دی تو چاندنی اس کے کمرے میں در
آئی۔ وہ کافی دیر باہر دیکھتا رہا اور پھر ایک سر آہ بھر
کر لیٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر تالے پھلتے لگے۔

تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں

جان بہت شرمندہ ہیں

کاش تم مجھ سکتے

ہم کتنے شرمندہ ہیں

میرے خواب، ہمارے خواب

پلکوں پر تابندہ ہیں

جان بہت شرمندہ ہیں

جان بہت شرمندہ ہیں

جو لوگ محض دولت اور شیش کے لیے شادی

بٹی کے لیے لیکن میں نے اپنی بچیوں کو جس طرح
تعلیم و تربیت اور اخلاقی زیور سے مزین کیا ہے
انہوں نے مشکلات کے آگے سر جھکا نہ سکیا ہی
نہیں۔ وہ زندہ رہے گی بیٹی۔ وہ زندہ رہے گی۔“
ان کی آواز رندہ گئی اور طارق نے خدا حافظ کہہ کر
فون بند کر دیا۔

پورا ایک ماہ زندگی اور موت کے درمیان معلق
رہ کر شمسہ اب دونوں سے اپنی ڈیوٹی پر سکول آرہی
تھی۔ آج جب چڑھائی نے ڈاک لاکر میز پر رکھی تو
اس میں ایک بڑا عروسی کارڈ بھی تھا۔ کھولتے ہی
شمسہ کا دل جیسے گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ طارق کی
شادی کا دعوت نامہ تھا۔
شمسہ نے سر پکڑ کر سوچا۔

تم بھی اس دل کو دکھاؤ، تو کوئی بات نہیں
اپنا دل آپ دکھایا ہے بہت دن ہم نے
”کیا یہ ستم بھی تم نے ڈھاتا ہی تھا تارے؟
کتنی مہربانی کی کہ اپنی شادی پر تو بلایا۔ کبھی یوں
بھی کوئی کسی کے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے؟ اب
بتاؤ تا کیسے آؤں تمہاری شادی پر؟ کیا کسی نے
اپنے جنازے کو خود بھی کندھا دیا ہے؟ کسی نے
بیج ہی کہا کہ مرد بہت جلد اپنی وفا میں دوسری
عورت کو متخل کر دیتا ہے مگر تمہیں نئی زندگی کی
مبارکباد دینے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کیونکہ
میرے پاس تو ایک زخمی دل اور غم سے بوجھل
اندھیری راتوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب سوچتی
ہوں کہ دل کا چراغ جلاؤں تاکہ کچھ تو اندھیرا کم
ہو مگر یہ دل بھی بجنت کب میرا ہے؟“
شمسہ کے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایک
دفعہ پھر تیشی اور بد نصیبی کا احساس اسے چرے لگانے
لگا۔ وہ میز پر سر رکھ کر سسکتی لگی۔
”ابو..... ابو..... میرے ابو؟ مجھے کیوں

کرتے ہیں وہ ہمیشہ ازدواجی خوشیوں سے محروم
رہتے ہیں کیونکہ انہوں نے پیسے کو انسانیت پر ترجیح
دی ہوئی ہے۔ بعض جوڑے کامیاب بھی ہو جاتے
ہیں مگر ان کی یہ کامیابی محض اتفاق ہوتی ہے۔ چونکہ
طارق کی شادی بھی اسی اساس پر ہوئی تھی چنانچہ
ایک ماہ کے اندر ہی سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ ایک
ناکام شادی ہو گی۔ رخشندہ کو اپنے بھاری جہیز، نقد
کیش اور ساتھ لائی ہوئی گاڑی کا بہت غرور تھا۔ وہ
ان خود پسند اور خود غرض عورتوں میں سے تھی جو
خاندانوں کی بالادستی کو کبھی تسلیم کر ہی نہیں سکتیں۔ ان
کی نظروں میں ایک ناگزیر ضرورت کے علاوہ
مردوں کا اور کوئی مصروف نہیں ہوتا کیونکہ معاشی طور
پر تو وہ خود کفیل ہوتی ہیں۔ دوسرے کرپلا نیم چڑھایہ
کہ رخشندہ زمانہ طالعلمی سے ہی اپنے ایک کو لیگ
ڈاکٹر راشد سے متاثر تھی۔ چونکہ وہ ڈاکٹر دولت اور
خاندان میں رخشندہ کے خاندان کے ہم پلہ نہ تھا اس
لیے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ڈاکٹر راشد،
رخشندہ کو حاصل نہ کر سکا۔ رخشندہ کے بارے میں
شروع شروع میں تو اس کے سرال والوں نے یہی
سوچا کہ نو گرفتار محبت ہے آہستہ آہستہ تعاون کر لے
گی لیکن جب تک دلوں میں خلوص نہ ہو ایک
دوسرے کا احترام نہ ہو ازدواجی زندگی کی گاڑی کب
تک چل سکتی ہے۔ جلد ہی ساس تندوں سے بے
نیازی اور لاتعلقی کو ہر ایک نے محسوس کرنا شروع کر
دیا۔ ساس تندوں کی طرف سے پیار و محبت کے
جواب میں اس کی مسلسل تفاعل شعاری نے ان کے
دلوں میں بیڑاری اور نفص کا بیج پونا شروع کر دیا اور
پھر انہوں نے بھی منفی رویہ اختیار کر لیا لیکن رخشندہ کو
تو جیسے کسی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسے کسی کے اچھے
نڈے روپے کی پرواہ ہی کب تھی۔ ساس تندیں منہ
بگڑتی رہیں۔ پہلو بدلتی رہیں اور یہ ہسپتال سے

آتی، کبھی کھانا کھاتی کبھی نہ کھاتی۔ تھوڑی دیر آرام
کرنے کے بعد کپڑے تبدیل کر کے یہ جاوہ جا۔ وہ
تو وقت بے وقت اپنے کمرے میں بھی کبھی کسی کا داخل
ہونا برداشت نہ کر پاتی تھی مگر سب سے زیادہ ماں
بیٹیاں حیران تو طارق کے رویے پر تھیں۔ وہ اس
طرح لاتعلقی سے گھر میں زندگی گزار رہا تھا جیسے
اسے گرد و پیش کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ باہر سے آیا،
بیوی موجود ہے تو ٹھیک ورنہ بھی نہ پوچھتا۔ کہاں
ہے کدھر گئی، کب آئے گی؟ اگر کسی نے بات کی تو
جواب دے دیا ورنہ چپ چاپ کھانا کھایا اور کمرے
میں آکر سگریٹ سلگا کر کتاب آنکھوں کے آگے رکھ
لی۔ شاید وہ مننی قسم کے انتقامی رد عمل کا شکار تھا۔ اس
کا رویہ محض چیخ معلوم ہوتا تھا۔ جب کبھی رخشندہ ذرا
زیادہ ہی موڈ میں ہوتی تو اسے کتاب پڑھتے دیکھ کر
جھنجھلا جاتی اور کہتی۔

”میرے خاوند صاحب کے پاس تمام دنیا کو
شعر اور غزلیں سنانے کا وقت ہے لیکن بیوی کو دو
بول کہنے کی فرصت نہیں۔“

طارق چپ رہتا، کچھ بھی نہ کہتا لیکن اس کا
انداز چغلی کھا جاتا جیسے کہہ رہا ہو۔

”تمہیں بھی تو اب وقت ملا ہے بات کرنے
کا۔ تمہارے پاس میرے لیے کتنا وقت ہے؟“
لیکن طارق کی بیٹی چپ اس کے تن بدن میں آگ
لگا دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے لڑے،
جھگڑے، شکایت کرے لیکن وہ تو گام بھی رہا ہوتا تو
اسے دیکھ کر چپ ہو جاتا۔

اس وقت یادوں کی پگڈنڈیوں پر ڈگمگاتی
سسکتی طارق کی روح کی بازگشت کمرے میں گونج
رہی تھی۔

قید غم حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور جئے جا رہا ہوں میں

اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔ اس بے چاری پر اس وقت غم کا پہاڑ ٹوٹا جب اس کے ارمانوں کے پھول کھلنے والے تھے۔ وہ زندہ درگور ہو گئی اور آپ کو ترس نہ آیا۔ خدا آپ کو کبھی نہ معاف کرے گا اُمی جان! وہ تو اتنے شریف اتنے باعزت اور خوددار لوگ تھے کہ جب انہوں نے سنا کہ آپ رضامند نہیں ہیں تو میری لاکھ منت ساجت کے باوجود دونوں ماں بیٹی نے انکار کر دیا۔ میں تو تمام دنیا کے شاعروں کو کہوں گا کہ زلف و کمر کے قصیدے چھوڑ کر اس ایثار کی پتلی کے بارے میں لکھیں جس کی دیانت، مصومیت، جفاکشی اور عظمت کے سامنے کائنات سرنگوں ہے۔ وہ اپنی محرکہ آرائیوں کے بجائے اس لازوال قربانی کے بارے میں لکھیں جو کہ ایک معصوم کلی نے پورے جنس کی سلامتی کے لیے دی۔ میں اس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس نے اپنے فطری اور جبلی تقاضوں سے منہ موڑ کر اپنے احساسات کو چل کر آپ کا مان رکھا۔ آج اگر وہ اس گھر میں ہوتی امی جان تو آپ کی تابعداری کرتی، آپ کے پاؤں دیانی۔ اس مظلوم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا امی جان؟“ طارق نے ٹوٹے ہوئے انداز میں کہا۔ ”یہ سب ہماری تقدیر میں لکھا تھا بیٹے!“ ماں روتے ہوئے آچل سے آنسو پونچھ کر بولی۔ ”اب تو اس بلا سے نجانے کیسے چھٹکارا نصیب ہوگا۔ ہماری تو عزت دو کوڑی کی بھی نہیں چھوڑی اس چھوٹری نے۔ میں تو ڈرتی ہوں میری بیٹیوں پر بھی اس کی حرکتوں کا خراب اثر نہ پڑ جائے۔“

”مل جائے گا چھٹکارا بھی۔ مل کیوں نہیں جائے گا۔ میں تو خود اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی بڑی بی۔“

سب نے یکدم چونک کر دیکھا تو دروازے میں رخشہ کھڑی تھی جو نجانے کس وقت سے ان کی

سونے کی چڑیا بچرے میں بند کر لینے کی فکر تھی۔ اب کیا ہوا؟ میں نے تو آپ کی خواہش کے سامنے اپنا آپ قربان کر دیا تھا۔ اب اور کیا چاہتی ہیں آپ مجھ سے؟ اس شہر میں تو ہر شخص ہر گھڑی، نیا اور اجنبی نظر آتا ہے۔ گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت، کون پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل کم ہے۔ یہاں تو ہر انسان کے کئی روپ ہیں۔ اب کس کس کو پوچھتا پھروں کہ تمہارا اصلی روپ کون سا ہے اور ستم در ستم، جو لکشی دیوی کا ڈھول آپ اپنے گلے میں ڈال کر لائے ہیں اس کو چھیڑ کر کون اُلٹا مصیبت گلے میں ڈالے۔ اس ڈھول کو خود ہی بجائیے اور لطف اٹھائیے۔“ طارق نے زہر کے تیر برساتے ہوئے کہا۔

”بیٹے! ہم تو اب بچھتا رہے ہیں۔ اب گزرا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ کون لکشی دیوی کہاں کی لکشی دیوی۔ جو کیش وہ ساتھ لائی ہے وہ ابھی تک بینک میں محفوظ پڑا ہے۔ اپنی کار پر وہ کسی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتی۔ جیڑا ابھی تک اس نے کھولا ہی نہیں۔ چند ایک چیزیں جو باہر ہیں میری لڑکیاں ان کو ہاتھ بھی لگا سکیں تو کھانے کو آجاتی ہے۔ کل ذرا استری پانچ منٹ کے لیے لے لی تو اس نے ہزار باتیں بنائیں۔“

”کیوں بچھتا رہی ہیں آپ..... آپ، جو پیسہ وہ لائی ہے اس سے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کیوں نہیں تعمیر کر لیتیں۔ اب میری بہنوں کے کروڑ پتی گھرانوں سے پیغام کیوں نہیں آ رہے۔ آپ تو بھاندراس بونی بیاب لائی تھیں نا۔ جو جسے چھوئے سونا کر دے۔ پھر اب آپ مایوس اور دلگیر کیوں ہیں؟ اولاد کو تو آپ نے شطرنج کے مہرے سمجھ رکھا ہے۔ آپ نے جب چاہا جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا اور پھر جس طرح آپ نے اس خیم لڑکی کا دل دکھایا ہے

خود غرضی اور زبردستی کی دھند آنکھوں سے صاف کر کے دیکھتی تو کتنے ہی وہ لوگ حسرت و یاس کے سکھول ہاتھوں میں تھے نظر آئیں گے..... جن کی صلاحیتوں کو دولت کی کند چھری سے ذبح کیا گیا لیکن جو ان حالات سے گزرا ہو وہی اس چیز کو سمجھ سکتا ہے۔ تم کیا جانو؟“

”مائی فٹ! اور میں جانتا بھی نہیں چاہتی۔“ وہ یکدم بھر گئی۔ ”میرا وقت فالٹو نہیں ہے۔“ وہ تیزی سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

کچھ دن بعد طارق کو ماں نے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ رخسانہ فرزانہ بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ”بیٹے تم نے کبھی بیوی کے رویے پر بھی غور کیا؟“ ماں نے پوچھا۔

”کیوں؟ کیا کیا اس نے؟“ طارق چونک کر جیسے کسی اور ہی دنیا سے بولا۔

”واہ! یہ پوچھو کہ اس نے کیا نہیں کیا۔ ہمیں تو وہ جوتی کی لوک پر بھی نہیں رکھتی۔ نہ کبھی سیدھے منہ ہم سے بات کرتی ہے۔“ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ طارق نے چڑ کر کہا۔

”کیوں تمہارا قصور کیسے نہیں۔ تم نے تو کبھی اسے روک ٹوک کی ہی نہیں۔ وہ اپنی من مانی کرتی پھر رہی ہے۔ لگتا ہے تمہیں کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ سارا نام تو اس ٹھوڑے ڈاکٹر کے ساتھ گزاری ہے۔ لوگ ہم پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں اور تمہیں اچھے بُرے کی پہچان ہی نہیں رہی۔“ ماں کو بھی غصہ آ گیا۔ ”آپ لوگوں کے انداز فکر، محبتیں، نفرتیں، اصول تو گھڑی گھڑی بدلتے ہیں۔ میں کس کس کی پہچان کرتا پھروں۔ کل تک اسی لڑکی کی محبت میں آپ کو دل کے دورے پڑ رہے تھے۔ میری بہنوں کو

منزل کا کچھ پتہ ہے نہ راہوں سے واسطہ لیے جا رہا ہے غم اور چلا جا رہا ہوں پرس کو لا پرواہی سے ہاتھ میں جھلاتی رخشہ جب ہسپتال سے واپس آئی تو کمرے کے قریب ہی آ کر رُک گئی۔ طارق کی پرسوز آواز نے اس کے کشمور دل کے تاروں کو جھنجھکا کر رکھ دیا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے پرس میز پر پھینکا اور دھم سے صوفے پر بیٹھنے ہوئے بولی۔

”شاعر تو خیر ہیں ہی مگر گام بھی اچھا خاصا لیتے ہیں۔“

طارق نے خاموشی سے اپنی ڈاکٹر بیوی کو دیکھا اور نظریں پھیر لیں۔

”کیا میری تعریف پسند نہیں آئی آپ کو؟ بیوی ہوں نا اس لیے، فین نہیں ہوں۔“ ترجمی نظروں سے دیکھ کر رخشہ بولی۔

”ویسے سنا ہے شادی سے پہلے آپ کا اپنی ایک فین سے چکر چل رہا تھا مگر وہ غریب تھی اور مجھ جتنا جیڑا نہ لاسکتی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“ اس نے زہر خند مسکراہٹ سے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔

”ہاں!“ طارق ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ ”اس دنیا میں صلاحیت کے کچھ دوسرے ہی معیار چلتے ہیں، پیسے کا حسن، سیرت کے حسن پر غالب آ جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں عورت کی حسن کی منڈیوں میں بولی لگتی تھی۔ اب مرد جیڑی کی منڈیوں میں بک جاتا ہے۔“

”لیکن آپ کب ان دنیا والوں سے الگ ہیں۔ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ایک ہی تھیلی کے چنے بٹے۔ دولت کے پجاری۔“ رخشہ نے جل کر کہا۔

”شاید مجھ میں وہ فن نہ تھا جس سے میں دنیا والوں کو اپنا نظریہ سمجھا سکتا رخشہ! اگر یہ دنیا

باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے مارے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔

”اس مجنوں جیسے بیڑے پر اترا رہی ہو۔ جس میں مردوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ ہر وقت چہرے پر تیزی برتی ہے جس کے۔ رہیں یہ تمہاری بیٹیاں۔ لالچی، خود غرض اور مطلب پرست بلیاں..... میں ان کو کیا خراب کروں گی۔ یہ تو پہلے ہی سے کافی چھپی رستم ہیں۔ ارے انہوں نے تو مجھ سے چیزیں بٹورنے کے لیے اپنے گئے بھائی کا بھی ایک ایک راز بتا دیا۔ کیسا خوش ہو رہی تھیں بتا کر کہ ہم نے چوری چوری شمسہ کو بھی بھائی کی شادی کا کارڈ بھجوایا تھا تاکہ اس کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ جائے اور خوب اس کے زخموں پر نمک لگے۔ اور یہ ان کا بھائی ہے تو رات کو نیند میں بھی شمسہ شبہ پکارتا ہے۔“

”تو بھو اگر تم چاہتیں تو اس کے دل سے شمسہ کا خیال نکال سکتی تھیں مگر تمہیں تو اپنے ہی مشغلوں سے فرصت نہیں۔ تم خاوند کا کیا دل بہلاؤ گی؟“

ماں نے کہا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم سب۔ میں کیوں تمہاری پروا کروں۔ میں ہر طرح سے خود مختار ہوں۔ میرے نزدیک مرد کی اہمیت ہی کوئی نہیں تو پھر میں کیوں خوشامد کرتی پھروں اس کی۔ نہ تو تم لوگ مجھے اپنی خواہشوں کے حصار میں قید کر سکتے ہو اور نہ میرے پاؤں میں زنجیریں پہنا سکتے ہو۔ میں ڈاکٹر ہوں، تم لوگوں کے ہاتھوں میں کیسے ڈبی بن سکتی ہوں؟“

”رخشدہ!“ طارق نے غصے سے کہا۔ ”تم جدیں پھلانگی جا رہی ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ جس شاخ پر بیٹھی ہو اسی کو کاٹ رہی ہو۔ تمہاری اس اکڑنے پر سکون گھر میں محاذ کھول کر رکھ دیا ہے۔ زندگی کے جھٹے سے گاگر بھرنے کے لیے تو جھکنا پڑتا ہے، ڈاکٹر رخشدہ۔“

”اوہو، مینڈکی کو بھی زکام ہونے لگا۔ شکر ہے صاحب کچھ منہ سے پھوٹے تو۔ بڑی شعلہ بیانیوں کا چرچہ سنتی تھی تمہارا بھی مگر شادی کے اتنے مہینوں میں بھی وہ گنتی کے لفظ جو تم نے مجھ سے بولے، انگلیوں پر گن کر بتا سکتی ہوں۔ اس عورت سے تم کیا توقعات وابستہ کرنا چاہتے ہو جس کا خاوند ایک دوسری عورت کے فراق میں دل سوز آہیں بھرتا پھرے؟“ رخشدہ نے جیسے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

”اس کے لیے فراقیہ گیت گائے جاتے ہیں، درد بھری غزلیں لکھی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے سب عورتوں کے لیے تمہارے پاس وقت ہے۔ صرف ایک میں ہی تمہارے معیار پر پوری نہیں اُتری۔ جسے تم نکاح کا بندھن باندھ کر گھر لائے ہو۔“

”بھو! دیکھو میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم کوئی کم ہو۔ سب طرف مشہور ہے کہ تم اس موئے مردار و حید مراد کی شکل والے ڈاکٹر کے ساتھ پھرتی ہو۔ ہم تو سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔“ ماں نے کہا۔

”تو کیا آپ کے اس لارڈ بائرن، اس کرشن کنہیا کے لیے بن باس لے لوں، جو کن بن جاؤں؟ ذرا کسی دن اس کے آفس میں تو جا کر دیکھو۔ مجھے بھی سب لوگ بتاتے ہیں کہ اس کی آفس ٹیبل پر اس کی فائلوں سے زیادہ تو لڑکیوں کے خطوط کے انبار پڑے رہتے ہیں اور پھر میں ایک ڈاکٹر ہوں، میرا تو پیشہ ہی ایسا ہے کہ میں گھونٹ نکال کر نہیں بیٹھ سکتی۔ مردوں کے ساتھ تو میرا اٹھنا بیٹھنا ضرور ہو گا ہی۔ چاہے آپ کو اچھا لگے یا نہ..... آپ لوگوں کے ہاتھوں میں کھٹ پکلی نہیں بن سکتی۔ میری بھی کوئی سماجی حیثیت ہے، ایشیٹس ہے، آنا ہے۔ اگر آپ کو گھر بیٹھ کر مصالحوہ مینے والی بھو چاہیے تھی تو پھر بیاہ لاتے اسی شمسہ کو۔ وہ آپ کے پاؤں دباتی اور آپ کے ماحول میں فٹ بھی آ جاتی۔ خواہوا یہ بے جوڑ شادی

کرنے کی آپ کو کیا ضرورت تھی؟“ رخشندہ نے تراشیدہ بال جھٹک کر کہا اور پاؤں پٹختی وہاں سے چل دی۔

طارق نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا اور پھر کرب بھرے انداز میں ہنس کر ماں بہنوں کی طرف نظر اٹھائی، جن کے چہروں پر تاسف اور پشیمانی کا تاریک دھواں پھیلا ہوا تھا اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

دو مہینے بعد جب یاسمین میکے آئی تو شمسہ کو ملنے جا پہنچی لیکن شمسہ کو تو دیکھتے ہی اس کا دل لرز کر رہ گیا۔

”کیا ہو گیا تمہیں شمسہ؟ کتنی بدل کر رہ گئی ہو تم!“

”زمانہ بدل گیا یاسمین! تم شمسہ کی بات کرتی ہو۔“ شمسہ کے لہجے میں ایک الناک تسخیر تھا۔

”کچھ بتاؤ تو پتہ چلے۔“ شمسہ پھیلیاں مت بھجواؤ پلیز۔“ یاسمین نے بے قراری سے کہا۔

”ابو کے مرنے کے بعد تو میری تمام زندگی ہی پہیلی بن کر رہ گئی ہے یاسمین۔ میرے لیے تو زمین سخت اور آسمان دور ہو چکا ہے۔“ شمسہ ہونٹ کاٹ کاٹ کر اور پکلیں جھک جھکا کر اندر سے امنڈتے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں نے جب معلّمہ کی حیثیت سے علم کی وادی میں پہلا قدم رکھا تو اس وقت علم کی حقیقت مجھ پر واضح ہوئی کہ علم تو ذہن کو وسیع کر کے انسان پر زمین و آسمان کے اسرار ظاہر کرتا ہے لیکن یاسمین مجھے معلّمہ نہ تھا کہ یہی میرا عیب بن جائے گا۔ اعلیٰ تعلیم دلو اگر فرسٹ کلاس سرورسز بھی تو دولت مند ہی دلا سکتے ہیں مگر جن کے پاس وسائل نہ ہوں وہ کہاں جائیں..... کیا کریں۔ اب میں دن رات گیلی گلیز کی طرح سگتی رہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے، ایک باری

جل کر راکھ ہو جاؤں۔ دل رہے نہ دکھ کی جلن۔ مگر یہ بھی میرے بس میں نہیں۔ کتنی بد نصیب ہوں میں یاسمین کتنی بد نصیب۔ اور پھر میرا نام بھی ڈھونڈ کر شمسہ رکھا میرے والدین نے..... شمس..... جو کہ کائنات کو روشنی اور نمود کی قوت تو عطا کرتا ہے مگر خود جلتا ہی رہتا ہے۔ اس نام کا کتنا اثر پڑا ہے میری زندگی پر یاسمین؟“ اس کی آنکھوں میں لٹی آرزوؤں کی دھول اڑ رہی تھی۔ ”دیکھو نا یاسمین! میں نے اپنے اس گھر کے لیے، اس کنبے کے لیے، ابا جی کے مرنے کے بعد کیا کچھ قربانی نہیں دی لیکن سب مطلب پرست نکلے۔ میری زندگی..... میری خوشیوں کا کوئی خیال نہ رکھا۔ ان لوگوں نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا، ان کم بختوں نے۔“

”پیاری! سب بات مقدر کی ہوتی ہے۔ تقدیر بند ہو تو سب راستے بند ہو جاتے ہیں۔ پر قسمت کے لکھے پر کس کا زور چل سکتا ہے؟ جن پر نکیہ ہوتا ہے وہی بچے ہوا دینے لگتے ہیں۔“

”تھی حیات جن سے روشن وہی بن گئے ہیں دشمن یہ خلوص کیا بلا ہے ہمیں سوچنا پڑے گا۔“ یاسمین نے آبدیدہ ہو کر شمسہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یاسمین! یہ بھی ٹھیک کہتی ہو تم۔“ شمسہ نے آہ بھر کر کہا۔ ”دیکھو نا! مجھے ہر قسم کے لوگوں اور محفلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ جو تم بڑے بڑے لوگوں کی بیٹیاں اور بیویاں دیکھتی ہو نا ان کے اس مقام پر ہونے میں ان کی اپنی کسی ذہانت، قابلیت یا کارکردگی کا کوئی تعلق نہیں۔ محض یہ قسمت ہی انہیں اس مقام پر لا بٹھاتی ہے۔ یہ بڑی بڑی بیگمات جو محفلوں میں بن بن کر بیٹھتی ہیں، جو بیوی پارلرز، بالوں کے سٹائل اور قیمتی ملبوسات و جویہری کے موضوع پر باتیں کرتی ہیں، ان کے دماغ خالی

آوازوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے دیا کی طرف جانے کے لیے نشیب میں اترتی چلی گئی اور پھر اس پتھر پر جا کر دم لیا جہاں کبھی دو دلوں نے پیمان وفا باندھا تھا۔ وہی مشکبار ہوا نہیں تھیں، غم آلود فضا نہیں، چٹکتی ہوئی ریت تھی، وہی پتھر اور وہی لہرائی بل کھاتی سرکراتی شوریدہ سرموچیں تھیں مگر ہر چیز اسے افسردہ نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ نہیں تھا۔

۔ ملال احوال دوستاں بھی

خوار آغوش مہوشاں بھی

غبار خاطر کے باب سارے

جس کی وساطت سے زندگی میں پہلی بار اس نے محبت کا مزہ چکھا تھا، جس کے وجود کے مہکتے لمس سے اپنائیت کی خوشبو آئی تھی اور جس کے سینے میں منہ چھپا کر مرنے کو جی چاہا تھا۔

یاسمین حسرت سے اسے دیکھتی رہ گئی کیونکہ اُمید سے ہونے کے باعث ڈاکڑ نے اسے تو زیادہ سیزھیان چڑھنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اوپر ہی ہال میں ایک میز پر بیٹھ گئی اور اپنے لئے کوک کا آرڈر دیا مگر اس کے دل کو قوراندہ تھا۔ بار بار اُٹھ کر وہ بالکونی سے جھانکتی، جہاں دور پتھر پر شمسہ اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کی روح سے پکارا اُٹھ رہی تھی۔

۔ وہ جان جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا اڑ کرتے
ہلکا ہلکا بوندا باندی کے بعد فضا میں مٹی کی
سونڈھی سونڈھی خوشبو اور پھیکے ہوئے پتوں کی مہک سی
جھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے اب ٹہنیوں سے
اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کی طاری کے
اعصاب سے جیسے سرگوشیاں کرتے ہوئے اکساہٹ
پیدا کر رہی تھی۔ اتنا عرصہ اس نے اپنے اوپر بے بسی
کا خول چڑھا لیا تھا مگر اب یہ اس کے بس کی بات

ہوتے ہیں اور روئیں کھو کھلی..... کئی تو ان میں سے صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل والا معاملہ رکھتی ہیں لیکن ان کے ناموں کے ساتھ اونچے عہدہ داروں کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیبل چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب میری طرف دیکھ لو یاسمین! صورت، شکل، مزاج، ٹیلنٹ یا شخصیت، قابلیت میں وہ میرے پارنگ بھی نہ ہوں گی مگر..... خیر چھوڑو، اس تذکرے کو ہم تو خدا سے ہی فریاد کرتے ہیں۔“ یاسمین نے شمسہ کو سستے دیکھ کر اسے گلے سے پیچ لیا۔

شمسہ کی زندگی میں صرف یاسمین کی ذات ایسی تھی جس نے شمسہ کو ہر دور میں سہارا دیا تھا اور اس کے ہر درد سے آشنا تھی۔ وہ شمسہ کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ اسے سمجھاتی، نئی زندگی کا حوصلہ پیدا کرتی اور کبھی کبھی جذباتی ہو کر اپنے بچپن کی سادھی دوست کے لیے خود بھی اس کے ساتھ رو پڑتی۔

شمسہ کے لیے دو نہایت ہی اچھے رشتے آئے ہوئے تھے مگر شمسہ انکار کر رہی تھی۔ اس کے سلسل انکار نے اس کی ماں کے اعصاب بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیئے تھے۔ وہ ہر صورت شمسہ کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا چاہتی تھی لیکن اس کے انکار نے پیچیدگی کر کے رکھ دی تھی۔ آخر اس کی امی نے یاسمین کو سمجھا کر اس کے ذمہ لگایا کہ کسی طرح شمسہ کو رضامند کرے۔ دل میں مقصد رکھ کر یاسمین شمسہ کو اپنے ساتھ لے آئی تاکہ کسی طرح گپ شپ کے دوران اس کی برین واشنگ بھی کر دے۔ شمسہ نے یاسمین کو لجاہت سے ”نورسٹ ان“ چلنے کو کہا۔ یاسمین کی مرضی تو یہی تھی کہ ہال میں دونوں بیٹھ کر چائے بھی پیئیں گی اور بات چیت بھی ہوگی مگر شمسہ نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ یاسمین بھی ساتھ ہے یا نہیں۔ وہ

نہ رہی تھی۔ آج پھر شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد اس کا ذہن متلاطم ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دور کوئی سکیاں لے رہا ہے۔ یہ آواز اس کی جانی پہچانی تھی، جو ماضی کے دیرانوں میں بازگشت کی طرح گونج رہی تھی۔

وہ یقیناً باہر نکل کھڑا ہوا اور کار میں بیٹھ کر بھٹکنے کے لیے چل پڑا۔ کار نہ جانے کتنے ہی سنگ میل اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی ویران راستوں پر کسی سوکھے ہوئے خزاں رسیدہ آوارہ پتے کی طرح اڑی جا رہی تھی اور طارق اس وقت خیالوں کے گرداب سے باہر آیا جب کار ”ٹورسٹ ان“ کے سامنے جا کر آہستہ ہوئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے شمس کے ساتھ شام گزاری تھی اور مستقبل کے تانے بانے بنے

تھے۔ آج اس جگہ اُداسیوں کے قافلے دم سادھے کھڑے تھے۔ ایک ناقابل بیان دم گھٹنے والی کیفیت ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ اب اس مقام کے نصیب میں ویرانی تھی..... انتظار..... لاشٹا ہی..... غیر یقینی سا انتظار..... جس کی سرحد پر کوئی غم نصیب اپنی حسرتوں کی لاش سینے سے لگائے سک رہا تھا۔ وہ پہلے تو کار کے اندر سے ہی عمارت کی طرف دیکھتا رہا مگر پھر باہر نکل کر اسی بالکونی پر جا کھڑا ہوا جہاں بھی شمس اس کے شانہ بشانہ کھڑی تھی۔ اندر ہال میں اور آس پاس وہی رونقیں تھیں۔ اسی طرح چیزوں کی خوشبو اور سگریٹ کے دھوئیں کی چھکی چھکی سی مہک تھی مگر شمس کے بغیر ہر چیز بے کیف و بیچ نظر آ رہی تھی۔ اس نے بے قراری سے فضا میں نگاہیں

دورائیں۔ دور نیچے دریا اسی جولانی سے بہہ رہا تھا اور لہروں کے شور غلجی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک آنچل سا طارق کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ وہ غور سے دیکھنے لگا تو ایک نسوانی پیکر کا ہیولہ پیٹھ کے اس کی نگاہوں میں ابھرا جو دریا کے کنارے پر پتھر پر بیٹھا کسی ماہر سنگتراش کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے شانوں پر پتھر سے سیاہ بالوں کی گھٹا جیسے برس پڑنے کو بے قرار تھی۔

”شمس!“ طارق کے اندر سے کوئی پکارا اور وہ بے اختیار نیچے اترنے والی میڑھیوں کی طرف لپکا۔ ”شمس..... شمس..... شمس.....“ اس کی روح بے قراری سے اسے پکارے جا رہی تھی۔ اور اس کے ڈولتے قدم بے اختیار اسے ڈھلوان کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ اکھڑے اکھڑے اور پھولے پھولے سانسوں کے ساتھ اس کے سامنے یوں آ کھڑا ہوا کہ وہ بے یقینی سے پلکیں جھپکاتی ہوئی اسے دیکھتی رہ گئی۔ نجانے کتنے لمحے..... کتنی صدیاں وہ تنہائی باندھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لہریں جذباتی ہو کر شور مچانے لگ پڑیں اور ہوائیں گنگنائی ہوئی، نجانے کہاں کہاں نکل گئیں اور پھر طارق نے آگے بڑھ کر شمس کو بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کے بالوں پر اپنے رخسار رگڑتے ہوئے بولا۔

”شمس..... میری شمس..... شمس..... شمس.....“ تمہارے بغیر میرے چاروں طرف اندھیرے ہیں شمس۔ نیند میں بھی میری سانسیں تجھے پکارتی ہیں۔ تمہاری صورت ہر دم میری پلکوں پر تابندہ رہتی ہے۔ تم کہتی تھی نا، کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ دیکھو میری طرف دیکھو شمس..... میں کہاں زندہ ہوں۔ کب زندہ ہوں۔ کیا جینے والے ایسے ہی جیتے ہیں؟ کیا اسی کا نام زندگی ہے جو تمہارے بغیر مجھے ملی ہے؟ کیوں تڑپتا رہا میں تمہارے بغیر..... کیونکہ تشنہ رہا

میں ہر دم؟ بتاؤ..... بتاؤ نا۔ میری روح..... بولتی کیوں نہیں ہو۔ کیا مجھ سے ناراض ہو؟“ آپ نے مجھے بولنے کے قابل کہاں چھوڑا طارق۔“ شمسہ سکتے ہوئے نڈھال لہجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے میں تمہارا مجرم ہوں مگر بتاؤ نا پھر کیا کرتا میں؟“ طارق بے چارگی سے بولا۔ ”تمہاری امی نے اپنی بیوی، اپنی عزت، اپنے سفید بالوں کا واسطہ دے کر تمہیں ملنے سے روکا۔ اس طرف قدم رکھنے سے منع کر دیا۔ صاف جواب دے دیا کہ تمہاری آس بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ آخری ملاقات جس میں، میں تمہیں اپنے سینے سے کوچ کر صوفے پر ڈھیر کر چکا تھا..... تمہارے گھر..... تمہارے شہر سے جس طرح محروم تمنا، تہی دامن ہو کر نکلا تھا، ان جان لیوا محلوں کی یاد ہر دم ایک آسیب کی طرح میرے وجود پر مسلط رہی۔ میں نہ مرتا تھا نہ جیتا تھا۔ تمہارا لاش کی طرح زرو چہرہ اور نیم جان وجود میرے تصور پر اپنی ضربیں لگاتا تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا کہ تمہیں اس حال پر پہنچانے کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔“ شمسہ نے اسے ویران آنکھوں سے دیکھا اور دل گرفتہ انداز سے بولی۔ ”تب ہی تو تم نے مڑ کر میری خبر بھی نہ لی کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں؟“ ”ہم دونوں کی ماؤں نے مجھے اس قابل کہاں چھوڑا تھا کہ پھر میں تم سے ملتا۔“ طارق سانس مجتمع کرتا ہوا بولا ”اور پھر بار بار ذمہ کریدنے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ بار بار تم سے ٹھٹھرنے کا منظر بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ میں اس بات سے بھی ڈرتا تھا کہ اگر پھر میں تمہارے پاس چلا گیا اور تمہاری امی نے مجھے تم سے ملنے نہ دیا تو میں جو تمہارے غم کے سہارے قائم تھا، ایسے بکھر جاتا کہ پھر شاید خود اپنے ہاتھ بھی نہ آسکا۔ اور اسی لیے میں نے سوچا، اپنے غموں کو گلے سے لگا کر اپنے دل کے زخموں کو خود

سے بھی چھپا کر جیوں گا تا کہ تمہاری ناموس پر حرف نہ آئے کیونکہ تمہاری امی کو ہماری زندگیوں سے زیادہ اپنی عزت پیاری تھی نا؟ کیا زندگی تھی میری اور کیا جینا تھا میرا..... یہ کیفیت تھی میری کہ

سوچتا ہوں، بجھا دوں میں کمرے کا دیا اپنے سائے کو بھی کیوں ساتھ جگاؤں اپنے اور آج یہ عالم ہے کہ میری ماں ہمیں پشیمان ہیں۔ آنسو بہا رہی ہیں۔ سونے کا نوالہ ان کے حلق میں پھنس گیا ہے اور اب وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ میں ہیں۔ شمر..... اب وہ تم سے اور تمہاری امی سے ملنے کو اور معافی مانگنے کو بے تاب اور بے قرار ہیں۔

”ہمیں..... نہیں تارے.....“ شمر اس کے بازوؤں سے الگ ہو کر بولی۔ ”اب مجھ میں مزید دکھینے کی تاب نہیں ہے۔ اب تو اس سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ اب تو میں اپنے آپ سے، اپنے نصیب سے اس قدر خوفزدہ رہتی ہوں جیسے آتش نے یہ مصرع میرے لیے ہی موزوں کیا ہو

۔ نہ پوچھ عالم برکشتہ طالع آتش برستی آگ جو باران کی آرزو کرتے ”ہشت!“ طارق نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ٹوکا..... ”امید کی دہلیز پر کھڑے ہو کر مایوسی کی باتیں نہیں کرتے بھئی۔ ہر شام کا ایک سویرا بھی ہوتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اس کے ہاں دیر ضرور ہے اندھیر نہیں۔ بس تم دعا کرتی رہنا۔“

پھر جاتے جاتے پلٹ کر طارق بولا۔

”ہاں تو ذرا دہرا دو نا، وہ اپنا تکیہ کلام بھی کیا کہتی رہتی تھی بھلا؟..... اُف تباہ کر دیا تارے! ہیں؟ بولونا!“ طارق نے اسے ہنسانے کے لیے کہا لیکن شمر اپنی آواں آنکھوں سے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد جب چوک میں لال ہتی کے اشارے پر طارق نے کار روکی تو ساتھ ہی ایک اور کھڑی کار میں سے آتی ایک مانوس آواز نے اسے ایک دم اس سمت سر موڑنے پر مجبور کر دیا۔

کار کی کھڑکی سے ٹیک لگا کر طارق کی طرف پیٹھ کئے رشتہ ہنس ہنس کر ڈاکٹر راشد سے باتیں کر رہی تھی اور وہ نہایت والہانہ نظروں سے رشتہ کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا..... مختلف کیفیات کے زیر اثر طارق کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے جلدی سے کار ریورس کر کے پچھلی لائن میں کھڑی کر لی۔

اور جب وہ گھر پہنچا تو اس نے ماں کو فرزانہ سے کہتے سنا۔

”آج پاکستان کے ہر تیرے گھر میں ضرور ایک لڑکی ڈاکٹر بن رہی ہے لیکن جو ڈاکٹر ہمارے نصیب میں آئی ہے ایسی دریدہ وہ بن..... منہ پھٹ اور آوارہ مزاج ڈاکٹر کہیں دیکھی نہ سنی.....“

توبہ..... توبہ! وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ ”اس نے تو ڈاکٹری کے مقدس پیشے کو بدنام کر دیا ہے۔ کل ٹیلیفون پر جس طرح وہ اس موئے ذلیل ڈاکٹر سے لگاؤ کی باتیں کر رہی تھی، سن کر مجھے تو پسینہ آ گیا۔“

”دراصل امی جان ہمیں شمر کا دل توڑنے کی خدانے سزا دی ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔

”ہاں بیٹی! میں تو طارق سے کہوں گی ہمیں ان فرشتہ سیرت ماں بیٹیوں کے پاس جلدی لے چلے۔ یہ نہ ہو کہ اس کی کہیں اور شادی ہو جائے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔“

”امی جان کیا ہم بھائی جان کی دوسری شادی کریں گی؟“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

”کیوں نہیں اسلام میں دوسری شادی جائز ہے بشرطیکہ پہلی بیوی رشتہ جیسی نہ ہو۔ میں نے تو اپنے

ہاتھوں اپنے بچے کی زندگی برباد کر دی۔“ ماں گلوگیر ہو کر بولی۔

جب سے رشتہ کے ساتھ طارق کی ماں بہنوں کی جھڑپ ہوئی تھی، طارق رشتہ سے گفت و شنید کر کے اس مسئلے کا کوئی حل سوچنے کی فکر میں تھا۔ اگر وہ خود کوئی قدم اٹھاتا تو لاکھوں کے حق جبر کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا لیکن وہ ایسا اقدام کرنا چاہتا تھا جس سے سانپ مرے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ ایک دن موقع غنیمت جان کر اس نے خود ہی رشتہ سے بات کا سلسلہ شروع کیا۔

”رشتہ..... وقت ہماری محبتوں کو، تمنائوں کو، ہمارے راستے میں کانٹوں کی طرح بچھا کر آگے نکل گیا اور ہم دونوں بادل خواستہ دنیا دلوں کی خاطر اپنے اپنے رشتوں کا بھرم رکھنے کے لیے اپنے اپنے دکھ، اپنے اپنے کرب کا عذاب جھیلنے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور ہیں۔ میں تمہیں ڈاکٹر راشد سے.....“ وہ رُک گیا اور پھر قدرے گھٹا کھار کر بولا۔

”میرا مطلب ہے جو تمہارے ڈاکٹر راشد کے لیے احساسات ہیں، ان کے لیے میں تمہیں اتنا ہی قصور وار سمجھتا ہوں جتنا کہ میں اپنے معاملے میں خود ہوں۔ اگر انصاف کے تقاضے کو مد نظر رکھا جائے تو دل کس کے بس میں ہوتا ہے؟ یہ جیلے بہانوں سے بھلتا ہے، نہ کسی دلیل یا منطق کو مانتا ہے۔“

یہ سن کر پہلے تو رشتہ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔ اس نے بے یقینی سے طارق کے منہ کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر جیدگی کی چھاپ دیکھ کر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت اُبھرنے لگی۔ چہرے پر چھائی وحشت کی جگہ ملائمت کے ساتھ ملال سا جھلکنے لگا۔ نکلخت اس کی ساری وحشتی کافر ہو گئی اور اس نے

چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا مگر اس کے لرزتے ہوئے کندھے بتا رہے تھے کہ وہ سسک رہی ہے۔

”رشتہ!“ طارق نے اسے آواز دی۔ ”اگر میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

رشتہ نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے رخساروں پر لکیریں بناتے ہوئے خاموشی سے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔

”مجھ سے بات کرو رشتی! ہم دونوں ہی مل کر کسی سمجھوتے پر آسکیں گے۔ ٹھیک ہے بے جوڑ شادی پاؤں کی زنجیر ضرور بن جاتی ہے مگر توڑنے والے اسے تو ذکر نکل بھی جاتے ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو اور خود کھیل ہو۔ تمہیں دوغلی زندگی گزارنے کی کیا ضرورت ہے؟ چونکہ میں بھی اسی آزمائش سے گزر رہا ہوں لہذا تمہاری پوزیشن سمجھ سکتا ہوں۔ تم عورت ہو اور ایک بیوی بھی۔ شاید اس طرح کوئی بیوی اپنے جذباتوں کا برسر عام تذکرہ برداشت نہ کرے گی لیکن ہمیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنا چاہیے اور لبرل انداز فکر اپنانا چاہیے۔ کیا تم مجھ سے بات نہ کر دو گی؟ تم مجھے ایک دوست سمجھ کر ہی بات کر سکتی ہو۔ یقین جانو میں تمہارے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کو تیار ہوں۔“ طارق نے کہا۔

وقت اور تقدیر کے بے رحم فیصلوں نے رشتہ کے دل میں جو بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا طارق کے الفاظ نے اس کے چلتے ہوئے احساس پر خشک پھوار کا سا کام کیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے اور چہرے پر معصومیت جھلکنے لگی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر طارق

کی طرف دیکھا جو سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا کر اپنے جذبات کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی پرخلوس و خملسا آواز رخشندہ کے دل کو چھوٹی چلی گئی تھی۔ اس نے سب کچھ طارق کے سامنے اُگل ڈالا۔

”میرا باپ شروع سے ہی امیر آدمی نہ تھا طارق۔ سرمایہ داری سے اس کا تعلق تو اسی جزیں سے ہوا ہے۔ اس نے جہد مسلسل سے غریبی کو ہرایا ہے لیکن آگے آ کر حرص و ہوس نے اسے ایسا مغلوب کیا کہ اس نے پرانے واقف کاروں سے بھی منہ موڑ لیا۔ ڈاکٹر راشد کا خاندان بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ راشد کا باپ مر چکا ہے۔ وہ میرے بچپن کا ساتھی ہی نہیں، میرا کلاس فیلو اور کولیگ بھی تھا مگر اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے کسی نہ کسی طرح مشکل سے ڈاکٹری کی سند لی تھی۔ میرا باپ کسی اور اونچی فیلٹی سے ناطہ جوڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ راشد کو جواب دے کر جب آپ کا رشتہ آیا تو ادھر حامی بھری۔ میں بہت برا روئی چلائی مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ تب میں بھی یہ سوچ کر کہ ”تمنا وہی کہلاتی ہے جو تشنہ و نا کام رہنے ماں باپ کے آگے ہتھیار ڈال دے“ مگر پھر جب شادی کے بعد میں نے آپ کا الجھا الجھا رویہ دیکھا، آپ کے کھوئے کھوئے انداز دیکھے، بے اعتنائی دیکھی تو میرے دل نے یہ کہا کہ رخشندہ تم تو اس درخت کی ٹہنی پر بیٹھی ہو جس کو دیمک لگ چکی ہے اور یہ آپ کا رویہ ہی تھا کہ جس کی وجہ سے میں دوبارہ ان ٹہنی کو چوں میں بھٹکتے لگی جن کے راستے میں اپنے اوپر بند کر کے ماں باپ کے گھر سے نکلتی تھی۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔ رخشندہ! لیکن تمہیں کیا پتہ کہ میں ان دنوں کس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ شکست خوردہ محبت ایسی آگ بن جاتی ہے جو ساری

ہستی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ روح جیسے ہر وقت جگنا ریوں کی زد میں رہتی ہے۔ میں سخت پریشان تھا مگر تم نے بھی تو مجھے سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ تم ہمیشہ کترائی کترائی، دور دور پھرتی رہیں۔ مزید اور میں تمہیں کیا بتاؤں کہ شمس میری ذات کا وہ حصہ ہے جو مجھ سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اوپر سے یہ ماں بہنوں کی کل کل نے الگ سکون برباد کر رکھا ہے۔ جس طرح ان لوگوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے ہماری زندگی برباد کی ہے اچھا ہے کہ یہ بھی ذرا تڑپیں۔ میں سوچتا ہوں، غاروں میں رہنے والے اور پتھروں سے آگ جلانے والے انسان نے کیا ترقی کی ہے؟ وہ ذہنی طور پر تو اسی پتھر کے زمانے میں کھڑا ہے۔ پہلے منڈیوں میں غلاموں اور لوگوں کا خسن بکتا تھا، اب گھر کی چار دیواری کے اندر ہی اندر انسانی زندگیوں کو سیم و زر کے پلڑوں میں تول کر ان کا سودا کیا جاتا ہے۔ اب معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو چکا ہے۔ رخشندہ ہمارے معاشرے میں عورت کا اپنے جذبات کے معاملے میں اس قدر بے باک ہونے کا کوئی تصور نہیں۔ مرد چاہے جتنی بھی لاپرواہی برتے، بیوی کو بے راہ روی اختیار کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ عورت کی لغزش کو زمانہ بھی معاف نہیں کرتا۔ دنیا کی نگاہوں میں اس وقت تم مجرم ہو لیکن میں تمہیں اپنا پابند رکھ کر اس کی تمہیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ تم اپنے طور پر خود مختار ہو اور کسی کی معاشی طور پر محتاج بھی نہیں ہو۔ جس طریقہ سے بھی تم چاہو، تمہیں آزاد کرنے کو تیار ہوں۔ ہمیں اپنے بہتر مستقبل کے لیے اپنا آج قربان کر دینا چاہیے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو منافقانہ زندگی گزارتے ہوئے معاشرے میں پیدا کی ہوئی برائیوں کو پھینکے کا مویج دیتے ہیں۔“

اس وقت رخشندہ کی حالت برسوں گھپ

ولیم کی شیشی موجود رہتی۔ اس کا جی طارق کی شاعری میں کھوئے رہنے کو چاہتا۔ اس کی سریلی آواز اسے کسی اور ہی ان دیکھے جزیروں میں لیے لیے پھرتی۔ اس کا جی طارق کے بازوؤں میں سما جانے کی ضد کرتا۔ اسے پیار کرنے کو چھٹا..... اور پھر وہ خود بخود ہی نام اور شرمندہ سی بھی ہو جاتی۔ اس کا ضمیر اسے کہتا۔

”اب کیوں پچھتا رہی ہو..... اب جبکہ تمہیں وہ چیز مل رہی ہے جس کی تم خواہشمند تھیں تو اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ اس وقت تو تم راشد کی محبت کے طوفان میں تاجزیتنے کی طرح ڈوبتی پھر رہی تھی۔ دل کے بھڑکتے شعلوں نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی دفاعی قوت بسم کر کے رکھ دی تھی۔“

اور پھر دل سے اٹھتی ہوک کو وہ دونوں ہاتھوں سے دبا لیتی اور حقیقت کا تلخ احساس کڑواہٹ بن کر اس کی رگ و پے میں دوڑنے لگتا۔

ایک طوفان تھا جس نے اسے راستہ سے ہٹا کر اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا اور ایک طوفان یہ تھا جس میں وہ ایک بھنگی ہوئی بغیر ملاح کی ناؤ کی طرح ہلکولے کھاتی پھر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے ایک کاٹا انکے وجود میں چھ کر ٹوٹ گیا ہو اور جس کی ککب زندگی بھر نہ جائے گی۔

رخشندہ طارق کا دفتر جانے کے لیے سوٹ پریس کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھرتی آنسوؤں کی دھند کو بھی صاف کرتی جاتی۔ اسٹری کے نیچے کوٹ میں Aramis اور سگریٹ کی ملی جلی بدبوؤں کن خوشبو فٹل کر اسے بے خود کئے دے رہی تھی اور طارق اس کے پیچھے والی کھڑکی میں کھڑا دونوں ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کی جیب میں ڈالے کسی سوچ میں غلطیاں و پچھان نظر آ رہا تھا۔ وہ دل میں رخشندہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

لگی تھی۔ یہ انسان چاہے کوئی بھی راستہ اختیار کر لے، انجانی مشکلات ایک دفعہ تو اس کا راستہ روک لیتی ہیں..... اور بعض دفعہ تو اچانک ایسے موڑ بھی راستے میں آ جاتے ہیں کہ انسان کو اپنا آپ بھی اجنبی نظر آنے لگتا ہے۔ رخشندہ جو کہ شادی کے بعد پھولوں کی بیج پر بھی کانٹوں کی جھین محسوس کرتی رہی تھی، اب نجانے کیا بات تھی کہ رفتہ رفتہ اس کے دماغ سے دھت دور ہوتی جا رہی تھی اور ایک سکون کا سا بادل اس کے دل و دماغ پر ہلکی ہلکی پھوار برساتا رہتا تھا۔ اب وہ چند دنوں سے کام ختم ہونے ہی ہسپتال سے سیدھی گھر آ جاتی اور طارق کے چھوٹے موٹے کام اپنے ہاتھ سے کر رکھتی۔ طارق کی مردانہ وجاہت، دلکش شخصیت، خوبصورت آواز اور انداز کے سامنے بتدریج اس کے سارے نفرت کے جذبے، اس کے اصول، اس کے ارادے ریت کی دیوار بننے لگے۔ جب اس کی طارق سے شادی ہوئی تو وہ پہلے سے کسی اور کی محبت میں گرفتار تھا اور وہ اسے اچھا بھی نہ لگتا تھا مگر اب وہی آہستہ آہستہ رخشندہ کے اعصاب پر سوار رہتا۔ اسے محسوس ہوتا گویا وہ ابھی تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ اس کو اپنے وہ تمام دعوے باطل ہوتے نظر آ رہے تھے جو اب تک اس نے ڈاکٹر راشد کے سامنے کئے تھے۔ وہ تو ڈاکٹر راشد کے پیار میں اس قدر دروہ چلی گئی تھی کہ اپنے جسم، اپنے وجود کے ایک ایک حصے کو اس کی امانت سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس ڈیڑھ ماہ میں طارق اور اپنے درمیان جسمانی فاصلے کو ہمیشہ قائم رکھا تھا لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا چلا جا رہا تھا اسے طارق، ڈاکٹر راشد سے زیادہ سپورٹنگ، دلکش، مہذب اور بااخلاق نظر آنے لگا تھا۔ جوں جوں علیحدگی کی گھڑیاں نزدیک آ رہی تھیں، وہ راتوں سونہ سکتی۔ اس کے پرس میں ہمیشہ

دوران میں علیحدگی کے کاغذات مکمل کروالوں گا۔“ طارق نے منہ موڑ کر پرے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

جب سے طارق اور رخشندہ کے درمیان فیصلہ ہوا تھا کہ دو ماہ بعد الگ ہو جائیں گے، رخشندہ پہلے سے بھی زیادہ دیر سے گھر آنے لگی۔ کبھی معلوم ہوتا ویزے کا چکر ہے، کبھی شاپنگ کے بنڈل ہاتھ میں ہوتے۔ کمرے کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہوئے کبھی تو آزاد چڑیا کی طرح چھپھاتی، گنگنائی، مگر پھر سوچ کا ایک بادل سا اس کے پورے وجود میں چھا جاتا اور وہ چپ چاپ کسی ایک نقطے کو گھورنے لگ جاتی۔ نجانے کیا بات تھی کہ دونوں کے درمیان جو کچھ اور کدورت کا ایک پردہ سا حائل رہتا تھا، اب آہستہ آہستہ وہ تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ باہر سے آتی تو طارق خندہ پیشانی سے اسے ہیلو کہتا، اس کے پروگرام کے بارے میں پوچھتا۔ اکثر اس سے کئی موضوعات پر نہایت فراخ دلی سے گفتگو کرتا۔ کبھی بکھار وہ میڈیکل پوائنٹس کو بھی اس طرح زیر بحث لے آتا کہ رخشندہ حیران رہ جاتی کہ اس چپ چاپ رہنے والے شخص کا اتنا سیر حاصل مطالعہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جس ٹاپک پر بھی چاہے برجستہ گفتگو کر سکتا ہے۔

رخشندہ اب تک یہی سمجھتی آئی تھی کہ ان لاپچی لوگوں نے محض جیز، بینک بیننس یا جائیداد کی خاطر اسے بیابا ہے اور ان لوگوں نے اس جیسی سونے کی چڑیا کو کب اڑنے دینا ہے۔ چاہے وہ جو بھی کرتی پھرے لیکن جب طارق نے نہایت اعلیٰ ظرفی سے اسے آزادی کا پروانہ دے دیا تو وہ اب منہ منی انداز ترک کر کے مثبت پہلو پر سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے اندر اب دو عورتیں جنگ آزما تھیں۔ ایک وہ جو وہ اس وقت تھی اور دوسری وہ جو وہ مستقبل میں بنے

اندھیرے میں رہنے کے بعد لکا یک چکا چونکر دینے والی روشنی میں آ جانے والے انسان سے مختلف نہ تھی۔ چنانچہ یہ سب اسے فریب خیال معلوم ہوا اور وہ بے یقینی سے آنکھیں جھپک جھپک کر طارق کو دیکھنے لگی۔ اس وقت دنیا اسے ایک فاسٹ مووی نظر آ رہی تھی جو تیزی سے صورتحال تبدیل کرتی ہے۔ ایک دفعہ تو رخشندہ کا دل یوں اچھلا گویا آردہ اس وقت ایک چڑیا ہوتی تو پنجرے کا دروازے کھلتے ہی پنجرے سے اڑ جاتی۔

”ٹھیک ہے طارق۔ اگر آپ بھی یہی چاہتے ہیں تو پھر میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میں F.R.C.S کرنا چاہتی تھی اور آج کل مجھے چانس مل رہا تھا لیکن میں آپ سب لوگوں کی وجہ سے مجھے میں جلا تھی اور پھر دو ماہ بعد میرے والدین جج پر جا رہے ہیں۔ ان کی روگائی کے دوسرے ہی دن میں باہر جانے کا پروگرام رکھ لیتی ہوں لیکن یہ سب صیغہ راز میں رکھنا ہو گا کیونکہ میرے والدین دنیاوی خیالات کے لوگ ہیں۔ ہماری مکمل طور پر علیحدگی کبھی برداشت نہ کر سکیں گے اور اگر ان کو ذرا برابر بھی ہینک پڑ گئی تو وہ شرابا پیچے گا کہ اللہ پناہ دے۔ ابھی بھی میں دو دن زیادہ میٹے میں رہ جاؤں تو ان کو ہول اٹھنے لگتا ہے۔“ رخشندہ نے بتایا۔

”میرا تو تمہارے والدین سے زیادہ واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ اگر کچھ شک ڈالنا ہے تو تم نے ہی ڈالنا ہے کیونکہ ایک دفعہ میری ماں نے ان سے تمہاری شکایت کی تو اٹنا انہوں نے تمہاری ہی طرف ذمہ داری کی ہے۔ رہ گئے میرے والدین تو اگرچہ وہ تمہارے خلاف ہو چکے ہیں، اس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ جب تک اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکے، ان کو بھی کچھ پتہ چلے..... یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان ہی رہنی چاہیے اور اس

”کبھی کبھی وہ انسان جن کو معاشرہ اور مذہب ایک قانونی بندھن میں ہمیشہ کے لیے باندھ دیتا ہے ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے ہیں اور پھر اس نفرت کے باوجود وہ کتنے بے بس ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں نہ الگ ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ساتھ رہنے سے زیادہ مشکل تو الگ ہو جانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انسان اپنے اوپر بہادری کا خول تو چڑھا لیتا ہے لیکن اندر سے خوفزدہ ہی رہتا ہے۔ ہم چاہے بظاہر کتنے ہی بہادر بنیں پھر بھی الگ الگ ہو جانے کا احساس ہی کس قدر روح فرسا ہوتا ہے۔ اب تو مجھے اس عورت پر ترس آتا ہے جو میری بیوی بن کر بھی بیوی کے مقدس درجے کو نہ پاسکی۔ اس نادان نے اپنی ناگہمی کا جو داغ اپنے ماتھے پر سجایا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مناسکتی۔ نہ اسے معاشرہ کبھی معاف کر سکے گا کیونکہ یہ ایک عورت کی لغزش ہے۔ اُف کیا ہم الگ ہو سکیں گے یا یونہی جلنے کڑھتے زندگی گزارتے چلے جائیں گے؟“

طارق نے بے چینی سے اپنی رسٹ وایج دیکھی اور پھر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ انسان کا ضمیر شکنی اور بدی کی دو مختلف قوتوں کے مرکب سے تیار ہوا ہے اور اس کے قول و فعل انہی دو عناصر کے مرکب ہون منت ہیں لیکن یہ دونوں طاقتیں انسان کے اندر ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔ اور انسان کے اعمال ان کی ہار جیت پر منحصر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اگر انسان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ نہ تو بالکل برا ہوتا ہے نہ بالکل اچھا۔ وہ تو انہی مختلف طاقتوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر ان کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ سو یہی حال رخشندہ کا تھا۔ جب اس کی آنکھوں پر سے طارق سے نفرت کا پردہ سرکا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ تو انجانے میں ہی نجانے کب سے

طارق کی پرستش کر رہی ہے۔ پھر وہ سینے پیسے پر لگا کر اڑ گئے اور وہ فیصلہ کن رات آنچلی جس کی صبح کے جلو میں جدائیوں کے قافلوں کی صدائیں جس سنائی دے رہی تھی اور آج تو ایک انجانا سا کرب تھا۔ بے قرار رہی تھی جس نے طارق کے دل و دماغ کو بھی اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ سر شام ہی ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ کلاک نے رات کے بارہ بجائے۔ اس کی ٹین کی گونج سے فضا میں کتنی ہی دیر ارتعاش رہا۔ طارق نے کتاب ہاتھ سے رکھی اور سر ہانے رکھا ٹیبل لیپ بچھا کر لیٹ گیا۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے پر کوئی سر رکھے سسک رہا ہے۔ کھوٹی کھوٹی سی چاندنی میں آنسوؤں سے بھیجا تنہایا ہوا ایک خوبصورت چہرہ، تپتے لرزتے ہوئے جسم سے اٹھتی ہوئی مدہوش کن خوشبو، ابھی ہوئی سانسوں کا زبردست۔ نیم غنودگی میں ہی طارق کا ہاتھ اس کی بکھری ہوئی سیاہ گھٹیری زلفوں میں جا الجھا اور چند بے خود کمزور لمبے آس پاس سرمزائے مگر پھر طارق کے کانوں میں جیسے سرگوشی میں کوئی کچھ کہہ گیا۔ شاید وہ اس کی پرانی چھٹی حس تھی جو اسے الارم کر رہی تھی۔ یکدم وہ ہوش میں آ گیا۔ عقل نے جذبات کو شکست دے دی۔ وہ یکا یک چونک کر اٹھ بیٹھا اور روشنی جلا دی۔ سسکتی ہوئی رخشندہ طارق سے لپٹ گئی۔

”اوہ..... طارق..... میرے محبوب، میرے شوہر، میرے شوہر!“

رخشی کے منہ سے سسکتے ہوئے بے ربط الفاظ طارق کے سینے پر ٹوٹی ہوئی مالا کے ٹکڑے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔ طارق نے حواسوں میں آ کر چند لمبے تو حیرت بھری مجروح نظروں سے اس عجیب

وغریب صورتحال کا سامنا کیا اور پھر کمال ضبط سے رختی کو نہایت ملائمت سے خود سے جدا کیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے شلیف پر رکھی دلیلم کی شیشی سے ایک گولی نکالی، سر ہانے رکھے جگ سے پانی لے کر گولی کو کھلانے کے بعد اسے نہایت آرام سے اپنے بستر پر لٹاتے ہوئے اسے نہایت آہستگی سے کبل اوڑھا کر بقیہ بچھانے کے بعد باہر بالکونی میں نکل آیا۔

اوپر کھلے آسمان پر تیرتے چاند نے اسے ممتی خیز نظروں سے دیکھا۔

اس ایک شب کے ہنگامہ نے اس کے سکون کو برباد کر دیا تھا۔ وہ سوچ میں گم کھڑا رخشندہ کی آواز کی بازگشت میں کھویا ہوا تھا۔ انگلیوں میں دبا سلگتے سگریٹ جب راکھ بنتا بنتا اس کی انگلیوں سے مٹ ہو کر چنگاری بنا تو اس نے چونک کر اسکی لمبی راکھ کو دیکھا جسے جھٹکتے ہوئے اسے ایک مغربی شاعر کا شعر یاد آ گیا۔

Love is like a cigarette, it begins with the flame and ends with the ashes.

وقت اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ گزر چکا تھا اور اب بہت دیر ہو چکی تھی..... بہت دیر.....!

رات بے آواز قدموں سے گزرتی رہی۔ صبح کا روشن ستارہ نمودار ہوا اور پھر آہستہ آہستہ شفق نے جو شہنشاہ مشرق مٹس کے استقبال میں آسمان کے کونوں سے اُبھری تھی، اسے اپنے گلابی پیرہن میں چھپا لیا۔

طارق کے دفتر میں ضروری میٹنگ تھی۔ جس وقت وہ فارغ ہوا، فلائٹ میں بہت ہی کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ وہ نہایت تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے ایئر پورٹ پہنچا۔ باہر رخشندہ کی کار کھڑی تھی۔ طارق

تیزی سے ڈیپارچر لاونج کی طرف چل دیا۔ جہاز کے مسافر سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ لاونج کی دوسری طرف کھڑی رخشندہ اس کے انتظار میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ جونہی اس کی نظر طارق پر پڑی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ہلایا اور پھر آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ ڈاکٹر راشد نے بھی مڑ کر دیکھا، ہاتھ ہلایا اور روٹی ہوئی رخشندہ کو ساتھ لئے وہ جہاز کی طرف چل پڑا۔

جہاز سے سیڑھی ہٹا لی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ فضا میں گھن گرج کے ساتھ بلند ہو گیا۔ طارق کافی دیر کھڑا جہاز کو نکلتی باندھے دیکھتا رہا جو ایک پشیمان اور آزرده وجود کو لئے محو پرواز تھا۔ جہاز نقطہ بن کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو طارق ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔

شمسہ اپنے بالوں کی گھٹائیں سنوار رہی تھی اور یاسمین پاس بیٹھی چلتوزے چھیل چھیل کر کھا رہی تھی کہ یکدم فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شمسہ نے برش ہاتھ سے رکھ کر ریسپورڈ اٹھایا۔

”میلو.....! میں تمہاری قسمت کا تارا بول رہا ہوں! اور آج شام تمہارے گھر پر طلوع ہونے والا ہوں یعنی آج شام مابدولت تمہارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ بھلا بوجھو تو اور کون کون آ رہا ہے؟ ابو، امی، فرزانہ، رخسانہ اور تمہارا یہ خادم! کیا سمجھیں۔ اور ہاں دیکھنا آج تم پھر وہی گلابی والا جوڑا پہننا۔ آں“

شمسہ نے شرما کر ریسپورڈ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر مسرتوں کے گلاب کھل اٹھے۔

اور ایک مدت کے بعد بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”اُف تباہ کر دیا تارے!“

(ختم شد)

